Between the Oxus and The Indus

دریائے آمو اور سندھ کے درمیان

(ضلع استور، گلگت، غذر، ہنزہ، نگر اور دیامر کا سفرنامہ)

مصنف: کرنل۔آر۔سی۔ ایف۔ شمبرگ

(وسطی ایشاء کے چوٹیوں اور میدانوں کے مصنف)

مترجم: محمد جان

مومن آباد، اشکومن، ضلع غذر، گلگت بلتستان

Email: mohdjan21@gmail.com

جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ ہیں!

نوٹ: اس کتاب کے کسی حصّے یا متن کی کاپی کرنے سے پہلے مترجم سے پیشگی اجازت ضروری ہے بصورت دیگر قانونی کارروائی کی جائے گی۔

ضوابط:

کتاب : Between the Oxus and the Indus

ترجمہ: دریائے آمو اور سندھ کے درمیان

مصنف : کرنل۔آر۔سی۔ ایف۔ شومبرگ

اشاعت: Martin Hopkinson Ltd 23 Soho Square London, 1935

مترجم : محمد جان

اشاعت بارِ اوّل :مئی 2024ء

کمپوزنگ اینڈ گرافکس: محمد جان

تعداد : 500

قیمت : 800 روپے

سرورق :

پرنٹرز :

فہرست عنوانات

نمبر شمار۔	عنوان	صفحہ نمبر
باب: 0 ۔	تعارف۔	
باب: 1۔	گلگت ایجنسی۔	
باب: 2۔	پونیال کی جاگیر۔	
باب: 3۔	کھو اور غذر کی جڑواں ریاستیں۔	
باب: 4۔	ریاست یاسین اور ورشی گھوم۔	
باب: 5۔	زیریں یاسین۔	
باب: 6۔	بالائی یاسین۔	
باب: 7۔	اشکومن اور اس کے گلیشیر۔	
باب: 8۔	ہنزہ اور نگر کی سڑک ۔	
باب: 9۔	ہنزہ۔	
باب: 10۔	ہنزہ نگر کے لوگ اور رسومات۔	
باب: 11۔	ہنزہ نگر کی تاریخ۔	
باب: 12۔	گلگت ایجنسی کے لوگ۔	
باب: 13۔	ہنزہ نگر کی جنگ ۔	
باب: 14۔	گلگت ایجنسی کے لوگوں کی عادات و اطوار۔	
باب: 15۔	شادی کی رسومات۔	
باب: 16۔	لوک کہانیاں۔	
باب: 17۔	ہنزہ کی شمالی وادیاں۔	
باب: 18۔	چپُورسن۔	

باب: 19۔ داریل اور تانگیر۔

ضمیمہ جات

1۔ تاریخ گلگت۔

2۔ تاریخ یاسین۔

3۔ تاریخ پونیال/اشکومن۔

4۔ نقشہ جات۔

توضیح خاکہ جات

نمبر شمار	نام	صفحہ نمبر
1۔	بلتت کی تصویر۔	
2۔	دولت شاہ اور عبداللہ بیگ۔	
3۔	عبداللہ راٹھور اور عزیزہ راٹھور۔	
4۔	چِر قلعہ (شیر قلعہ)۔	
5۔	غذر کا ایک آدمی۔	
6۔	دُمانی اور راکاپوشی کا ہندی (ناصر آباد) سے ایک منظر۔	
7۔	شاہ سکندر خان (کے۔ بی ۔ای، سی ۔ آئی ۔ای)۔	
8۔	محمد نظیم خان (کے۔ سی۔ آئی۔ ای)۔	
9۔	بلتت کی مسجد۔	
10۔	گنش میں شیعہ مسجد۔	
11۔	غزن خان۔	
12۔	تھول نگر کا قدیم قلعہ۔	
13۔	گنش کے نیچے دریائے نگر پر پُل۔	
14۔	بلتت کا آخری بُرج۔	
15۔	ہنزہ کے موسیقار۔	
16۔	ہنزہ کے دستکاری برتن۔	

عرض مترجم

فاضل محقق، سیّاح اور وکٹورین آرمی کے کرنل آر۔سی۔ ایف شومبرگ کی کتاب Between the Oxus and the Indus اُن اہم دستاویزات اور سرگزشتوں میں شامل ہے، جس میں قبل تقسیم ہند کے اہم حالات و واقعات درج ہیں۔کتاب کا ترجمہٗ دریائے آمو اور سندھ کے درمیان' کے نام سے کیا گیا ہے۔ معاصر کتابوں میں اس کتاب کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں اور اکثر محققین نے اِسی کتاب سے ادھورے اقتباسات لے کر سیاق و سباق سمجھے بغیر مرضی کی تشریحات کی سعی کر کے متن تک رسائی اور اصل حقائق سے قارئین کو دور رکھا ہے۔ ان ہی وجوہات کی بناء پر کتاب کے اردو ترجمے کا خیال آیا۔ اس کتاب میں مصنف نے انتہائی گہری نظر سے استور' گلگت، ہُنزہ، نگر، غذر اور دیامر کی ریاستی سیاست، قدرتی مناظر، جغرافیہ،اہم درّوں، وادیوں، حکمرانوں، سڑکوں، فصلوں، پلوں، ثقافت، قدیم پکوانوں، شادی بیاہ، موت وحیات، آبپاشی،نسلوں، زبانوں، روّیوں اور عادتوں کے بارے میں مفصل ذکر کیاہے۔ موصوف نے زیادہ توجہ مقامی حکمران خاندانوں اور اپنے فوجی مقاصد پر مرکوز کرنے کے ساتھ ان ہی سے سفری تفصیلات جمع کی ہیں۔ اُس زمانے کی غربت وافلاس اور بیماریوں میں گھرے لوگوں کا تقابلی جائزہ لینے کے ساتھ، اُس کے معاونین نے ہر چیز کو اپنی سوچ اور علاقے کی عینک سے منظر کشی کروائی ہے۔ تاریخی لحاظ سے ایک دوسرے کے بارے میں منفی تاثرات قبائل کی عادت رہی ہے، جس کا اشارہ فاضل مصنف نے کافی مقامات پر ظاہر کیا ہے ۔ موصوف نے بہت سارے اہم مقامات کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے۔ شاید یہ علاقے یا تو اُس وقت آباد نہیں تھے یا اُن کی

اُس وقت کے سیاسی منظر نامے میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مثال کے طور پر غذر کے کچھ گاؤں گاہکوچ، سنگل اور اشکومن کے قلعوں کے بارے میں کوئی بحث نہیں۔

بہرحال یہ کتاب گلگت ریجن کے حوالے سے بہت اہم تاریخی دستاویز ہے۔ کوئی بھی ہمعصر کتاب ایسی نہیں جس میں اس کتاب کا حوالہ موجود نہ ہو۔ ترجمہ قارئین کو حوالہ جات کی بجائے اصل متن تک رسائی ممکن بنانے میں مددگار ثابت ہوگا۔ اس کتاب کے ترجمے میں بہت احتیاط برتی گئی ہے، پھر بھی بحثیت انسان کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو، تو آپ نہ صرف مجھے مطلع فرمائیں، بلکہ اس کی درستگی میں مدد بھی فرمائیں۔

اس ترجمے کو تکمیل تک پہنچانے میں شیر باز علی خان برچہ اور ظفر حیات پال نے اہم تجاویز دی۔ لکچرر کریم مدد اور ایڈوکیٹ اشفاق احمد نے متن کی درستگی اور ترجمہ کے اسلوب کے ساتھ املاح کی اصلاح میں بہت گہری نظر سے جائزہ لیا۔ تمام دیگر احباب کی حوصلہ افزائی کا بہت شکریہ۔

محمد جان
مومن آباد اشکومن ضلع غذر
بتاریخ: مئی 2024ء

تعارف

دریائے آمو پامیر کے برفیلے پہاڑوں افغانستان اور چین کے سرحدی سنگم سے نکل کر انڈیا اور روس کے سرحدی علاقوں سے ہوتا ہوا، آرل جھیل کے پہاڑی سلسلوں کو چھوتے ہوئے افغانستان سے آگے متحدہ روس(آج کل واخان پٹی اور تاجکستان) تک جاپہنچتاہے۔ برطانوی ہند کی طرف دریائے سندھ، ریاست ہُنزہ اور اشکومن جو گلگت ایجنسی کا حصہ ہیں، کی سرحدات سے گزرتا ہے۔

دریائے سندھ تبّتی بلتستان کے جنوب کی طرف سے رواں دواں ہوکر گلگت ایجنسی کے دامن سے کوہستان کے جنگلی ریاستوں سے ہوتے ہوئے، نسبتاً سکوت کے ساتھ اٹک کے مقام پر نمودار ہوکر سرزمین پنجاب سے لمبے پیچیدہ اور چکردار سفر کے بعد بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ شمال میں دریائے آمو کے منبع کے برعکس دریائے سندھ جنوباً گلگت کی طرف نکلتاہے، جہاں مہاراجا کشمیر قدرتی لیاقت و وصف کے ساتھ برٹش پولیٹیکل ایجنٹ کے زیر سایہ حکومتی انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ یہ دریاسلسلۂ قراقرم کے پار ناہموار علاقوں،ہندوکش اور پامیر کے سنگم پر دقیق گلیشئرز کے سلسلوں میں بڑی بڑی چوٹیوں اور وادیوں سے گزرتا ہے۔ان گہری اور تنگ وادیوں سے متصل بستیوں کی ہموار زمینوں میں بہت مشقت کے بعد معقول حد تک آبادیاں وجود میں آچکی ہیں، (جنہوں نے اپنی رسومات صدیوں سے بچائے رکھی ہیں)ان سب وادیوں کو یہی دریاسیراب کرتاہے۔ یہاں کی برادریاں بہت چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بسنے کی وجہ سے بیحداہمیت کی حامل ہیں، جو مختلف النوع ہونے کی وجہ سے قابل توجہ ہیں، جنہوں نے ہندوستان کے بہت اہم اور وسیع وعریض سرحدی راستوں پر قبضہ جمائے رکھا ہے۔ اگرکوئی چاہے تو ہُنزہ کے شمال کی بلندیوں میں جاکر ایسی جگہ پہنچ سکتاہے، جہاں سے وہ دریائے

آمو کے منبع سے افغانستان کی سرحدوں کو دیکھ سکتا ہے، جہاں ایک طرف اشتراکی روس کی سرحد واقع ہے، تو دوسری جانب چین کی بند سرحدیں موجود ہیں، جہاں سے مختلف ندیاں نکل کر وسط ایشیاء کی سَمت میں لیب نور تک پہنچ جاتی ہیں، جبکہ اُن کے پیچھے برفانی پانی پگھل کر بحیرہ عرب کی طرف رواں دواں ہے۔

اگرایک پہاڑی(مسافریاسیاح) کو بہترین سواری دی جائے، تو وہ ہُنزہ کے انتہائی شمالی گاؤں مسگر سے نکل کر چین کی سرحدات سے پار جاسکتا ہے، جو بہت آسان راستہ ہے۔ اگر وہ سبک قدم ہو تو اُن تنگ و تاریک پہاڑوں اور میدانوں سے نکل کر کِرل روبٹ پہنچ کر سب سے دُور شمال مشرق میں اشتراکی روس کے بازاروں میں خریداری بھی کرسکتا ہے۔

مجھے گزشتہ آٹھ سالوں میں مسلسل گلگت ایجنسی کا دَورہ کرنا پڑا اور کئی دفعہ کے ان سفروں کے نتیجے میں یہ دستاویز وجود میں آچکی ہے۔ اس علاقے میں سیاح کبھی کبھار ہی آتے ہیں کیونکہ آنے والوں کی کبھی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ اب اس علاقے کی معاشی حالت میں بہتری کی شروعات ہوچکی ہیں۔فوجی چھاؤنی کے لیے غذائی رسد کشمیر سے لاتے ہوئے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مہنگی بھی پڑتی ہے۔ سب سے بڑی تشویش دَورانِ سفر جانوروں کے لیے بھوسے اور چارے کی کمی کی ہوتی ہے، جس کی وجہ سے آمدرفت بہت قلیل ہے۔سال کے چھے مہینے گلگت ایجنسی بقیہ ہندوستانی علاقوں سے کٹی ہوتی ہے، کیونکہ بلندوبالا درّوں سے گزرنا دُشوار ہوجاتا ہے۔ موسم سرما میں کشمیر کی طرف سے یاشمالی جانب سے راستے بند ہوجاتے ہیں۔

ایک طرف ایجنسی کے گردونواح میں نامعقول منتشر ریاستیں ہیں۔بالخصوص داریل تانگیر کی دونوں وادیاں قتل وغارت کی آماجگاہیں ہونے کی وجہ سے سرکاری

اہلکاروں کو لوٹنے اورانسانی جانوں کے لیے بہت مضر ہیں۔یہ دونوں ریاستیں ملحقہ کوہستان کے لیے مثال بنی ہوئی ہیں۔ یہ ماضی کی پُرآشوب چھوٹی آزاد ریاستیں بہت دلچسپ، لیکن بقاء کے لیے ناموافق ہیں، جن میں کوئی کشش نہیں اور نہ ہی ان کے اندر اپنے آزاد رہنے کی کوئی دلیل ہے، جس کو سمجھا جاسکے۔ یہ غیرپٹھانوں والی جگہیں اپنے لیے کوئی ریاستی ستون استوار نہیں کر پائی ہیں اورنسلوں سے اِسی طرح بے ضابطہ چلی آرہی ہیں۔یہاں کے لوگ اپنے ہی منتخب کردہ جرگوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے، بلکہ مسائل کو صرف اورصرف چاقو اور بندوق کی مدد سے حل کرنا چاہتے ہیں یاانتقام کا سہارالیتے ہیں۔ اس ضمن میں سرکاری مداخلت کو آزاد پٹھان قبائل کبھی برداشت نہیں کر پائیں گے۔

یہ کتاب مکمل طور پر جامع یا مستند حوالہ فراہم نہیں کرتی۔ یہ اُن دور دراز علاقوں کی آنکھوں دیکھی سرگزشت سے بڑھ کر کچھ نہیں، جہاں اب بھی زندگی بسر کرنے کے طریقے سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت قدیم ہیں، جبکہ یہاں کی دلکش رسومات اب بھی زندہ ہیں۔

یہ کتاب مصنف کے اُن علاقوں کا آنکھوں دیکھا حال بتانے کے علاوہ ان دو دریاؤں کے دور دراز علاقوں کے سادہ لوح لوگوں اور خود نما ریاستوں کے باسیوں کی ثقافت و رسومات کی داستان ہے۔

مندرجہ ذیل کتابیں اس مطالعے میں استعمال ہوئی ہیں، جن میں ایک دو بہت پرانی کتابیں بھی شامل ہیں:۔

In the Footsteps of Marco Polo by Clarence Dalrymple Bruce.

The Marches of Hindustan by David Fraser.

The Making of a Frontier by Colonel A. G. A. Durand.

Political Frontiers and Boundary Making by Sir Thos. H. Holdich. *Where Three Empires Meet* by E. F. Knight.

(نوٹ : اس کتاب کا اُردو زبان میں ترجمہ 'جہاں تین سلطنتیں ملتی ہیں' کے نام سے ظفر حیات پال کے قلم سے ہو چکا ہے)۔

Chinese Central Asia, etc., by C. P. Skrine.

Tribes of the Hindoo Koosh by Major J. Biddulph.

(نوٹ: اس کتاب کا بھی اُردو زبان میں ترجمہ 'ہندوکش کے قبائل' کے نام سے ظفر حیات پال کے قلم سے ہو چکا ہے)۔

Jammu and Kashmir by Frederic Drew.

Among the Kara-Korum Glaciers in 1925, with Contributions by Ph. C. Visser,by Jenny Visser.

Results of a Tour in Dardistan, Kashmir, Little Tibet, Ladak, Zanskar, etc., by G. W. Leitner.

میں اپنے دوست ڈیوڈ میکلین کا بہت مشکور ہوں، جس نے اس کتاب کی تیاری اور اشاعت کو ممکن بنانے میں میری بہت مدد کی۔

آر۔سی۔ایف۔شومبرگ

باب۔1
گلگت ایجنسی

ریاست کشمیر کے شمال مغرب کے اوپر کی جانب، دریائے سندھ کی دائیں طرف وادیٔ گلگت واقع ہے، جس کو اسی نام سے گلگت ایجنسی کا نام دیا گیا ہے۔
گلگت ایجنسی کو مہاراجا کشمیر کے انتظامی منتظمین چلاتے ہیں اور گلگت ہی کو انہوں نے کافی عرصے سے دارالحکومت بنا رکھا ہے۔ گلگت کے مضافات میں نیچے کی جانب شمالی سَمت سے دریائے ہُنزہ بہتا چلا آرہا ہے اور ان وادیوں کی ریاستوں یعنی ہُنزہ نگر پر میر یا تھم کی حکمرانی ہے۔ دریا کے دونوں جانب اوپر شمال مغرب کی طرف اس قصبے سے بارہ میل دور پونیال کی جاگیر ہے، جہاں سے آگے ریاست کوہ اور غذر کی دو گورنرشپ کے علاقے واقع ہیں۔ ان ریاستوں کی مشرقی جانب ریاست یاسین کو کھوار زبان میں ورشی گوم کہتے ہیں جس کی سرحد کے پیچھے گورنر شپ اشکومن کی ریاست واقع ہے۔

پولیٹکل ایجنٹ، گلگت سے ان چاروں ریاستوں کو کنٹرول کرتا ہے اور ان کے گورنروں کا چناؤ اور معزولی بھی اُس ہی کی جانب سے کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہُنزہ نگر کی ریاستوں کو بھی اسی انداز میں چلایا جاتا ہے۔ بہرحال گورنروں کے زیر انتظام یہ چاروں علاقے پولیٹیکل علاقوں کے نام سے جانے جاتے ہیں۔
(نوٹ : فاضل مصنف کے زمانے میں ریاست ہائے ہُنزہ اور نگر کے انتظامات کا گلگت ایجنسی یا مہاراجا کشمیر سے کوئی تعلق نہیں تھا، مترجم)۔

کشمیری دارالحکومت سرینگر سے بانڈی پور کے راستے چالیس میل لمبی وولر جھیل کے خوبصورت مناظر، جو گلگت سے بمشکل دو سو میل دور واقع ہے، گلگت

شہرآنے کیلئے ایک موزوں راستہ ہے۔شروع میں یہ راستہ وادی تراکبل کشمیر تک بہت ہی شاندار سرسبزہ و شاداب مناظر سے مزین ہے۔ آگے بڑھیں تو وادی گریز تک گھنے جنگلات سے ہوتے ہوئے 13773فٹ بلندبرزل پاس میں سے ہوتا ہوا راستہ گزرتا ہے۔ گرمیوں میں یہ شاندارسبزہ زار اور پھولوں سے مزین چڑھائی ہے، لیکن سردیوں میں یہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ بہار کے اوائل میں اس کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ سردیوں میں برفانی تودے کثرت سے گرنا معمول کی بات ہے اور کبھی کبھی کوئی حادثہ ضرور پیش آجاتاہے۔ موسم بہار کے شروع میں یہاں سے گزرنا بہت مشکل اور خطرناک ہوتا ہے۔ عموماًگلگت کے لوگ بُرزِل ٹاپ میں اس تجربے سے گزرتے رہتے ہیں۔ اس گزرگاہ کی کہانیاں بہت دلچسپ رہی ہیں، تاہم یہاں سے گلگت پہنچنا کوئی معمولی کام نہیں۔ تمام مسافر اس راستے میں انہی مسائل سے دو چار رہتے ہیں۔ یہ راستہ انہی خصوصیات کی وجہ سے ناقابل رسائی ہے۔ اس کا متبادل راستہ قمری پاس ہے، لیکن اس گزرگاہ کے مناظر اتنے دلکش نہیں۔ ایک تو یہ راستہ قدرے دیر سے کھلتا ہے اور دوسرا بہت جلد ہی سفر کے لیے بند ہوجاتا ہے۔

مسافر برزل پاس سے گزرکر ایک اور ریاست میں داخل ہوجاتے ہیں، جہاں سے آگے گھنے جنگلات اور سبزہ، استورکی سرحدمیں داخل ہوتے ہی غائب ہو جاتے ہیں اور خشک اور بنجر علاقے شروع ہوجاتے ہیں، جہاں درخت اور چراگاہوں کے سبزے ناپید ہیں اور صرف سنگلاخ چٹانیں ہی نظر آتی ہیں۔ یہاں سے نیچے بہت زیادہ اُترائی شروع ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ ہاتو پیر کی مشہور چٹانیں شروع ہوجاتی ہیں، جوپھسلن والا اور بل کھاتی سنگلاخ چٹانوں کا دُشوار گزار راستہ ہے۔ یہ چٹانیں کہیں کہیں سینکڑوں فٹ گہرائی میں دریا تک پہنچتی ہیں۔

باوجود اس کے کہ چندمقامات پر سنگلاخ پہاڑوں کی اُترائی پربڑی مہارت سے لکڑی کے پائیدان بنائے گئے ہیں،پھربھی یہ راستے بہت ہی مشکل اور دشوار گزار ہیں۔ ان دُشوار گزار پگڈنڈیوں کو بہت محنت سے بنایا گیا ہے، بہت تیز بارش کی دھار کسی بھی وقت اپنے لپیٹ میں لے سکتی ہے۔اس سے آگے نشیب میں رام گھاٹ اور شیطان نالہ ہے، جہاں سے لکڑی کے معلق پُل کے ذریعے دریائے استور کو پار کیاجاتا ہے۔ایک مرتبہ میں یہاں آیا، تو حفظِ ماتقدم کے طور پر وہ پُل دیکھا،جس کے ساتھ ہی ایک چھوٹاسا ریسٹ ہاؤس بھی تھا۔میرے اس دورے کے دوران پہاڑ سے ایک چٹان ٹوٹی، جو اس پُل پر گری اور اُسے تباہ کرتے ہوئے دریا برد کر دیا اور کیا دیکھتا ہوں کہ ریسٹ ہاؤس بھی دریا کی لپیٹ میں ہے۔ یہ بہت بے یقینی کی صورت حال تھی۔ یہاں سالہاسال تک لوگ بڑی مشقت سے ان پُلوں کی مرمت کرتے ہیں، لیکن ہاتو پیر کی چٹان کے باربار ٹوٹنے کی وجہ سے اُن کی سب محنت رائیگاں جاتی ہے۔ہاتوپیر چٹان کے اونچائی سے نیچے تک، کم از کم سات بل کھاتی پگڈنڈیوں کے، اس بنجر اور بے آب وگیاہ راستے پر سفر کرنے سے تھکاوٹ بڑھ جاتی ہے اور سفر بہت بے لطف ہوجاتا ہے۔ یہاں سے آگے راستے کا سنگلاخ سوکھا پن بد ذوقی کامظہر ہے۔ تاہم استور کے بنجر پہاڑوں کے پیچھے چلغوزے کے جنگلات اورصنوبر جیسے درختوں کے ساتھ جنگلی گلابی سرخ پھول اس سفر کو دوبارہ جلا بخشتے ہیں۔

یہاں سے آگے دریائے سندھ کے کنارے کا سفر ہے، جو تبّت کے پہاڑوں سے نکل کرسنسان و بنجر وادیوں اور ڈھلوان و سنگلاخ چٹانوں سے ہوتے ہوئے بحیرۂ عرب تک جا پہنچتا ہے۔ دریائے سندھ کے ساحل کے ساتھ واقع دیہات کی آبادیاں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اس عظیم دریا کے پانی سے محروم ہیں۔

لوگ پہاڑوں سے گرنے والی چھوٹی چھوٹی ندیوں سے اپنی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں۔ ہمیں اپنے سامنے بونجی کے میدان نظر آرہے ہیں، جہاں جنگوں اور سیلابوں کی ہولناکیوں کے باعث کسی تہذیب کے آثار باقی نہیں رہے، جن سے ہم قدیم آثار کی روشنی میں ماضی میں آباد قوموں کے بارے میں کچھ جان سکیں، جبکہ ہمارے سامنے صحرا میں ایک چھوٹی سی سرسبز بستی، بونجی آباد ہے۔

پرتاپ پُل سے ہم نے دریائے سندھ کو پار کیا، جہاں دریائے گلگت بھی ملتا ہے اور اس سے آگے ایک نئی وادی میں داخل ہوگئے۔ یہاں کثرت سے زرخیز زمینوں اور بید کے سایوں کی لطافت سے گزرتے ہوئے، جنوبی سَمت سے گلگت میں داخل ہوئے۔ خوبصورت شاہی محل کے باہر شاندار بازار، خوبصورت باغات، گھر اور عمدہ پانی کی وجہ سے وادیٔ کشمیر جیسا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ گلگت شہر سرخی مائل پہاڑوں کے درمیان واقع ہے، جسے ان پہاڑوں نے دریا کی دونوں اطراف فصیل کی طرح گھیر رکھا ہے، جو اس شہر کا ایک نقص بھی ہوسکتا ہے۔ اس بندوبستی علاقے کی ہر چیز بہت سرسبز نظر آتی ہے، سوائے ان مضبوط پہاڑوں کے، جنہوں نے اس شہر کی ہریالی کو گھیر رکھا ہے۔ سال کے دو مہینوں میں یہاں خاصی گرمی پڑتی ہے اور مچھر اور مکھیاں، یہاں بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پھل بھی معدوم ہوجاتے ہیں۔ سردی کا موسم مناسب ہوتا ہے۔ تھوڑی برف باری بھی ہوتی ہے، جو زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتی اور یقیناً سردیاں مختصر گزرتی ہیں۔ ایندھن کی لکڑی قلیل مقدار میں ہے اور اس کی درآمد کا ابھی تک کوئی حل نہیں ہو سکا، سوائے اس کے کہ سفیدے کے درخت لگا کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

گلگت کی سب سے بڑی خوبصورتی اس کے باغات ہیں۔ ان میں سب سے خوبصورت ریذیڈنسی کا باغ ہے۔ یہ کشمیری وزارت اور انڈین پولیٹکل ایجنٹ

کے اقتدار کا مرکز ہے، جہاں کشمیری وزارت کے وزیر اور انڈین پولیٹیکل ایجنٹ جلوہ افروز ہیں۔ انتظامی پیچیدگیوں میں دو حکمرانوں کے بیچ یہ علاقہ Brentford کی طرح ناقابل برداشت ہے۔

چلاس کا علاقہ بھی اس وزارت کا حصہ ہے، لیکن یہ انڈین پولیٹیکل آفیسر کے زیرِانتظام ہے، جو پولیٹیکل ایجنٹ گلگت کے ماتحت ہوتا ہے۔ چلاس گلگت سے چھے مسافتوں یا پچاسی میل کی دُوری پر ان علاقوں میں ایک مشہور علاقہ ہے، جو انڈس کوہستان میں واقع ہونے کے باوجود بھی انہی کے زیرِ انتظام ہے۔ باقی ماندہ دور دراز پھیلے گرد ونواح کے علاقے کئی آزاد اور خودمختار ریاستوں میں منقسم ہیں، جن کی اپنی کوئی سیاسی و قانونی حیثیت نہیں، جس کی وجہ سے وہ مشرقی لوگوں کے لیے نازیبا ہیں۔ کوہستان کی علاقائی ریاستوں کا قضیہ بھی عجیب ہے کہ ان کو مقامی جرگہ یا مجلس دستورساز گروہ کے تحت چلایا جاتا ہے، جس کی ان وسیع علاقوں پر گرفت نہیں اور نہ ہی یہ ایک دوسرے کی مانتے ہیں۔ ان علاقوں میں کوئی سیاسی رہنما یا رہبر نہیں، جو اتنے وسیع و عریض علاقے کے لوگوں کو فرمانبرداری کی طرف مائل کر سکے۔

چلاس کسی حدتک ٹھیک ہے، لیکن اب تک اس کی صورتحال بھی غیر یقینی ہے، کیونکہ یہاں کے لوگ اگرچہ غیر پٹھان ہیں، لیکن ان کی عادتیں بُرائیوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہاں کے لوگ کوئی بھی اچھی عادت نہیں اپنا سکے۔ گرمیوں میں چلاس میں بہت گرمی پڑتی ہے اور یہ ایک خاص زہریلے مچھر کے حوالے سے مشہور ہے، جو بہت بُری طرح کاٹتا ہے۔ اس کے برعکس یہاں موسم سرما میں سردی مناسب ہوتی ہے۔

چلاس کو الجرنن ڈیورنڈ نے 1893ء میں مختصر لڑائی کے بعد فتح کرکے

گلگت ایجنسی میں شامل کیا تھا(نوٹ: فاضل مصنف نے چلاس کے متعلق لکھا ہے کہ اُسے 1893ء میں الجرنن ڈیورنڈ نے فتح کر کے گلگت میں شامل کیا تھا، جو غلط ہے، جبکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ چلاس کو مہاراجا کشمیر گلاب سنگھ کے وزیر زوراور سنگھ نے 1850ء میں فتح کر کے کشمیر میں شامل کیا تھا، حالانکہ معاہدہ امرتسر محررہ 16مارچ1846ء میں علاقہ چلاس کا کوئی ذکر نہ تھا اور انگریزوں کی جانب سے مہاراجا گلاب سنگھ کو بیچ کیئے گئے علاقوں میں چلاس شامل نہیں تھا، مترجم)، جس کو انڈین حکومت سے کوئی خاص پذیرائی حاصل نہیں ہوسکی۔ اس سے پہلے سکھوں نے زور اور سنگھ کی زیر قیادت1843ء میں حملہ کیا تھا،لیکن ان کو کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ 1850ء میں چلاسیوں نے استور پر قبضہ کیا تھا، جہاں سے کشمیری افواج نے ان کو دوبارہ پیچھے دھکیل دیا تھا۔ یہ ذہن میں رہے کہ چلاسی خاصے خطرناک لوگ ہیں،لیکن ہمارے ماتحت آنے کے بعد، ان کی غلط عادات میں کمی آئی ہے۔ بیشک یہ افسوسناک امر ہے کہ ان چھوٹی ریاستوں نے کوئی کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے اور نہ ہی یہ کسی تنظیم کا حصہ رہے ہیں۔یہ بات غیر یقینی ہے کہ گلگت کی سرحد کے ساتھ السٹیا(جرمنی کا ایک باغی صوبہ) کی طرح چلاس بھی پنجاب کے راستے میں واقع ہے،جہاں سے یہ راستہ درّہ بابوسر سے گزرتا ہے، جس کی وجہ سے وادیٔ سندھ کے قبائل، مسافروں پر حملے کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ اتنے وحشی اور خطرناک نہیں کہ ان کے ساتھ نبرد آزما ہونے کی ضرورت پڑے۔

بہرحال یہ بات قابل ذکر ہے، جو ان کی سیاسی صورتحال کے ضمن میں بیان کی جارہی ہے اور ان کے سابقہ اُس دور کی عکاس ہے۔جب روس کی حکومت نے انڈیا کو دھمکیاں دینا شروع کیں، تو سب کی نظریں گلگت پر پڑی تھیں، لیکن روسی حملے کا خطرہ ٹل جانے کے بعد گلگت کی کوئی اہمیت نہ رہی

صرف انتظامی معاملات میں نگرانی کی ضرورت تھی۔ان حالات کے بعد اب صورت حال واقعتاً بالکل مختلف ہوچکی ہے۔ اب اس علاقے میں ہوائی جہاز اور اسلحہ بارود کی مقدار کی موجودگی اور جدید مواصلات کا نظام موجود ہے اور ان کے ساتھ جدید موٹر گاڑیاں گلگت کی پہنچ میں آچکی ہیں، جن کی وجہ سے صورتحال میں بنیادی طور پر تبدیل آچکی ہے۔ گلگت اگرچہ کسی بیرونی جارحیت کے لیے بالکل آسان جگہ ہے،تاہم اس کے تنگ اورعظیم الشان پہاڑ کسی بھی آنے والی جارحیت کو روکنے میں بہت کارآمد ہیں۔

مہاجرین کے علاوہ گلگت میں سب مسلمان بستے ہیں۔ ان میں سے بہت سے مولائی یا اسماعیلی ہیں، جو ہزہائی نس آغاخان کے مرید ہیں۔ ہُنزہ،پونیال اور یاسین کے لوگوں کی اکثریت اسماعیلیوں کی ہے۔نگر میں سب اہل تشیع ہیں، جن میں سے تین سو کے قریب گھرانے ہُنزہ میں بھی آباد ہیں۔ اشکومن،غذر اور کوہ میں مولائی اور سنی آباد ہیں۔ یاسین میں بہت قلیل سنی ہیں، جبکہ گلگت میں شیعہ اور سنی بستے ہیں،جبکہ چلاس میں صرف سنیوں کی آبادی ہے۔

گلگت ایجنسی میں ہمالیہ کے دوسرے علاقوں کی طرح فصلیں ہوتی ہیں، لیکن یہاں کمترقسم کا چاول بڑی مقدارمیں پیدا ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر گلگت اور گرد و نواح کے کھیت اور اشکومن کی زمین اس فصل کی کاشت کے لیے، اتنی موزوں نہیں۔ اصل چیز چاول کی قیمت ہے، جو انڈیا سے منگوانے کی وجہ سے کافی بڑھ چکی ہے، جبکہ مقامی فصل ناکافی ہے۔

پھلوں کی پیداوار بہترین اور وافرمقدار میں ہے۔ خوبانی بہت زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ سیب اور ناشپاتی بھی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ گلگت میں انگور کی پیداوار زیادہ ہے، لیکن معیاری نہیں ہے اور اس سے شراب زیادہ نہیں بنائی

جاسکتی، لیکن اس پھل کے دلکش نظارے موجود ہیں۔ آڑو بہت زیادہ اور ہر جگہ ملتے ہیں۔ ہُنزہ اور پونیال کے آڑو سب سے بہتر اور مزہ دار ہیں۔

زراعت کے لحاظ سے گلگت خوش بخت رہا ہے، کیونکہ زریں علاقوں میں برف کم پڑتی ہے، جبکہ پہاڑوں پر بہت زیادہ برف پڑنے کی وجہ سے پانی کی کبھی کمی پیش نہیں آتی۔

لوگوں کی سب سے بڑی ضرورت روزگار ہے اور ریاست محض محدود لوگوں کی ہی نگہداشت کرسکتی ہے۔کاروبار کے بغیر پیسہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے لوگ بیکاراور آوارہ گرد ہیں۔اگر ہُنزہ،یاسین اور پونیال کے لوگوں کو پولیس یا فوج میں روزگار دیاجائے، تو ان کی حالت میں بہتری آسکتی ہے۔ دوسری ریاستوں سے ایسے افراد پیدا ہورہے ہیں، جن کو کسی سرکاری نوکری کی پیشکش نہیں کی جاسکتی۔ اس ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایک طرف بے روزگاری، دوسری جانب غیر کاشت کار اور دیہاتی گشپوروں کا خراب رویہ ہے ۔گشپور حکمران طبقے کے گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تعلق کی وجہ سے سماجی طور پر اعلیٰ مرتبت ہیں اور عوام پر اپنااثرونفوذ رکھنے کے علاوہ اُنہیں خاص استحقاق حاصل ہے، لیکن دوسری طرف وہ انحطاط پذیر، گھمنڈی،لالچی اور مراعات یافتہ طبقہ ہے، جو بغیر کام کاج کے، بیکار رہ کر عوام سے اعلیٰ توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔ کچھ ریاستوں میں یہ رسم ہے کہ بطور حق ایک ایک گشپور کو دو دو کسانوں کی ذمہ داری میں دیا جاتاہے۔ تمام یوروپین ان بھوکے مگسوں سے تنگ آئے ہوئے ہیں۔ روایات اور ماحول کی وجہ سے ان میں ہر ایک کی مدد سے معذرت کرنا بھی ممکن نہیں اور ہر ایک کی مدد کرنا بھی ناممکن ہے۔ وہ سازشی منصوبہ باز اور بہت خطرناک ہیں۔ پہلے زمانے کی طرح جنگیں،اچانک اموات اورناگہانی جنگلی

واقعات ہی اس مرض کی اصلاح کرسکیں گے۔ پہلے کبھی، جب ان لوگوں سے جنگوں،ناگہانی اموات،غیر محفوظ طریقے اور بدانتظامی کی وجہ سے چھٹکارہ حاصل ہو جاتا تھا۔ بدقسمتی سے اب امن وسکون ہو جانے کی وجہ سے ان کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوتا چلا جارہاہے۔

اشکومن کے گورنر میرباز خان نے یہاں تک مشورہ دیا کہ جنگ عظیم کے لیے ان گشپوروں کی ایک رجمنٹ بناکر ان کو اگلے موچوں پر بھیجا جائے، مر گئے تو بہت اچھی بات ہوگی ان کا نام عزت سے لیا جائے گا، اگر یہ زندہ واپس آگئے تو کم از کم وہ اپنی پوزیشن واضح کرسکیں گے۔ گشپوروں کو ہر حال میں سدھارنا بہت ضروری ہے۔ یہ معقول تجویز ان کو کڑوی لگی اورنظرانداز کر دی گئی۔ اس تجویز پر وہ اگلے موچوں پر جاتے تو مقامی معززین اپنی ساکھ اگلے مورچوں پر ثابت کرتے۔ دیہاتی کسان ان گشپوروں کو ان کی مراعات کے بارے میں، بعض اوقات ان پر لطیفے کستے ہوئے اُنہیں مختلف ناموں سے پکارتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک گشپور کا نام کشمیر آرٹلری(توپ خانہ یا ٹینک اور طیاروں کی مرمت) میں لکھا گیا، تو اُس کے گھر والے غضبناک ہوئے اور کہنے لگے کہ وہاں جانے سے وہ بے شغل یا غربت میں مرجائے تو بہتر ہے۔

گلگت اپنی دو خاصیتوں کی وجہ سے شہرت کا حامل ہے۔ اس کی زمینوں پر شرعی قوانین لاگونہیں۔ اس کے ساتھ گلگت میں کالک مالک کی رسومات رائج ہیں جو شادی کے تحائف کے تحریری اعلان کے طور پر ہے۔ عام طور پر دیکھا جائے تو گلگت اب وہ ضلع نہیں رہا جو کبھی وہ آزاد حیثیت کی الگ رسومات کا حامل تھا۔ اب یہاں آفاقی اور عالمی خصوصیات جنم لے رہی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنا پرانا تشخص کھو رہا ہے۔

باب ۔2
پونیال کی جاگیر

یہ مثال دینا ایک بڑا مشکل مرحلہ ہوگا کہ مشرقی قصبہ چھوڑ کر ایک ایسے علاقے کی جانب سفر شروع کروں، جہاں بازار ناپید ہیں۔ عموماً میں خوش دلی سے، جس علاقے کا بھی دورہ کروں، ابتداء میں ہی سفری تیاریوں کا اعلان کردیتا ہوں، لیکن اس دفعہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ ناظم کی خواہشات کے برعکس ملازموں نے ہی سفری معاملات کا اِنتظام کیا اور روانگی کی تاریخ مقرر کی۔ جب میں گلگت سے نکلا ،تو میرے ساتھ عبداللہ بیگ اور دولت شاہ جو ہُنزہ سے تعلق رکھتے ہیں، میرے ہم رکاب ہوئے۔ اس سے پہلے بھی یہ لوگ سنٹرل ایشیا کے دونوں دوروں میں میرے ہمراہ تھے۔ اس وقت بدقسمتی سے اوّلا لذکر بیمار ہونے کی وجہ سے چترال سے واپس اپنے گھر آیا تھا۔ میرا پرانا باورچی عزیز راٹھور کشمیری بھی پہلے والے دونوں دوروں کے دوران مجھے اپنی خدمات فراہم کر چکا تھا اور مَیں اُن کے کھانا پکانے کی مہارت سے فیضیاب ہو چکا تھا۔اس لیے میرے خیال میں اب بھی اُسے میرا ہمسفر ہونا چاہیے تھا۔ درحقیقت اُن دوروں کے دوران وہ اور میرے دیگر ساتھی زیادہ خوش نہیں تھے۔ اُس وقت بہر صورت اُسے کھانا پکانے میں اتنی دلچسپی نہیں تھی، جتنی کہ ہونی چاہیے تھی۔ تاہم اُن کے اس قسم کے جذبات سے میری طبیعت کافی مکدّر رہی۔ یہ گاؤں والے پچھلے سفر کے دوران بھی اُن کے ساتھ تھے، جن میں عبداللہ راٹھور، جو بڑا خوش مزاج اور سادہ انسان تھا اور اُس کا ایک اور ہم نام عبداللہ ہُنزائی بھی ہمارے ساتھ موجود تھا، ہم نام ہونے کی وجہ سے ہم نے ان

میں امتیاز رکھنے کے لئے کشمیری انداز میں ایک اور نام سجانہ کا انتخاب کیا تاکہ ان میں فرق ہوسکے۔ گلگت سے ہمارے ساتھ حاصل شاہ بھی ہمسفر تھا، جو اپنی گائے کو فروخت کرکے اپنے لئے گھوڑا خریدنے نکلا تھا۔ وہ بہت ہوشیار اور مضبوط وتوانا ہُنزائی تھا۔ ہمارے قافلے میں عبداللہ بیگ کے بیمار ہونے کے بعد، سفر کی شروعات ہی میں ایسے دوست کے ساتھ ہونے سے سفر کافی نیک شگون ثابت ہوا۔

بیشک گلگت ایک چھوٹی سی جگہ ہے، لیکن یہاں کے بازار بہت اچھے ہیں۔ اگرچہ ہم دارالحکومت سے روانہ ہونے والے تھے، لیکن آگے سفر کے دوران کوئی زیادہ وقت نہیں لگے گا۔جون کے وسط میں سفر شروع ہوا۔ شہر کی قریبی بنجر اور خشک پہاڑی تپتی دھوپ آگ برسارہی تھی۔ یہاں سے آگے سفر کے لیے ذرائع آمدورفت کی بہت قلت تھی، جس کی وجہ سے ہر کوئی تپتی دھوپ سے بچنے کے لیے سائے کی تلاش میں رہتے تھے۔ بالآخر ہلکی پھلکی تیاری کیساتھ پانچ گھوڑے تیار ہوگئے۔ اتنی تعداد مشرقی سواری کے لیے کافی نہیں ہوسکتی تھی، کیونکہ سواری کے ساتھ باربرداری بھی اس طرح کی جاتی تھی کہ بیچارا جانور بھی بوجھ تلے دب کر رہ جاتا۔سواری کی قلت کے باعث بہت سے اہم افراد کی ناراضگی متوقع تھی، جس کی پہلی کڑی ہمارا باورچی عزیز تھا، جو بڑے گمنڈ اور احسان سے روانہ ہوا تھا۔ اگر ہم اس کو کسی ٹیلے پر آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیتے تو یقیناًوہ سفر سے بھی جی چرائے گا۔ خاص کر اس وقت جب کھانا پکانے کا وقت قریب قریب پہنچ جائے۔وہ عقل سلیم سے عاری معمولی باتوں پر بھی خوامخواہ بے چینی اور دباؤ کی کیفیت میں رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اُسے پیدل ہی سفر کرنے دیا تھا تاکہ راستے میں کہیں سے کوئی بہتر باورچی مل جائے اور ہم اُس کو اپنے ساتھ لے لیں۔ جیسے فارسی محاورہ ہے کہ ’’سفر کی ابتداء میں چندمیل تاخیر کی جائے، تاکہ ناپسندیدہ عناصر سے

چھٹکارا حاصل کیا جا سکے''۔ ہم نے ایسا ہی کیا۔ دیر سے روانگی،سخت دھوپ اور باورچی کی اُکتاہٹ اس بات کی نشاندہی کررہی تھی کہ ہمیں صرف آٹھ میل دور ہینزل کے مقام پر ہی پڑاؤ ڈالنا پڑے گا۔

یہ 19 جون 1933ء کی بات ہے، جب مَیں بڑی مایوسی لیکن استقلال کے ساتھ اپنے مہربان میزبان میجر اوران کی اہلیہ مسز گیلن کے خوبصورت گھر اور باغیچے سے روڈ کی طرف سفر پر نکل رہا تھا۔راستے میں رس سے بھرے لذیذ شہتوت موجود تھے اور ساتھ خوبانی کے درخت پھلوں کے وزن سے جھکے ہوئے تھے، جبکہ تیز ہواؤں کی وجہ سے گری ہوئی خوبانیوں نے صحن کو داغدار کردیا تھا۔مزے دار مٹر کی پتیاں ،تھوتھنی نما پھول اور دیگر سبزے کی کلیاں کِھلی ہوئی تھیں۔مَیں ایسے دلربا اور دلفریب منظر کو چھوڑ کراور دوستوں کو الوداع کہہ کر افسردہ اور پُر ملول، چٹانوں، تنگ ندیوں اورگھاٹیوں کی جانب نکل پڑا۔

جون کی تپتی گرمی کی شدت عروج پر تھی۔گندم کی کٹائی کے ساتھ فصل کو گٹھوں کی شکل میں باندھ کررکھاجارہاتھا، تاکہ جلد از جلد، وقت ضائع کیے بغیر دوسری فصل بوئی جا سکے۔ ان علاقوں میں گندم کے بعد عموماً مکئی کاشت کی جاتی ہے،جس کے لیے تھوڑی سی سُستی بھی فصل کے پکنے میں رُکاوٹ بن سکتی ہے۔ گلگت کا علاقہ ان چند جگہوں میں سے ایک ہے، جہاں چاول کی کاشت کی جاتی ہے اس لیے کچھ کھیتوں میں چاول کی بوائی ہو چکی تھی۔کشمیری چاول کی باربرداری کافی مہنگی اورمشکل ہونے کی وجہ سے اس فصل کی کاشت یہاں کی جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود صارفین کشمیری چاول کی ورائٹی کو ترجیح دیتے تھے۔اس فصل کو بہت سے کھیتوں میں خوبصورتی، مہارت اورسلیقے سے مساوی دائروں کی شکل میں اُگایا گیا تھا تاکہ کفایت شعاری کے ساتھ فصل کی آبیاری کی جا سکے۔

گلگت سے اُوپر (پونیال) کی جانب دریا کے کنارے سے گزرتے ہوئے، یہ منظر بہت ہی دلفریب اور خوبصورت تھا۔ درختوں کے جھنڈ اور فصل کی کثرت کے ساتھ صاف ستھرے چشموں نے بنجر پہاڑی علاقے کو اپنے دامن میں قوس بنا کر آرائش سے سجا رکھا تھا۔

بے آب وگیاہ علاقوں کے درمیان اس طرح کی ہریالی کے مناظر یقینی طور پر یورپی اقوام کی دلچسپی کو متوجہ کرنے کا سبب بن رہے تھے۔ اِنگلستان میں ہم لوگ اس بات سے کم واقف اورغیر عادی تھے کہ کس طرح لوگ پانی کی نعمت سے بنجر اور صحرائی علاقوں کو سرسبز و شاداب بناتے ہیں اور اس طرح کے بیابانوں کے چشمے، شگوفے اور گلاب جیسے پھول آبیاری کرتے ہوئے ان علاقوں کو دلفریب بنا کر دل موہ لیتے ہیں۔اس طرح کی دلپسند اور آنکھوں کوخیرہ کردینے والی چمک سے معمور ،صاف و شفاف ندیوں کے ساتھ اُوپر چڑھتی نوکیلی چٹانوں کی وحشت، تنگ و تاریک گھاٹیوں میں جمے ہوئے گلیشئر اور برفانی چادر کے سائے میں لپٹے فیروزی رنگت کے گاؤں،تسکین و دلربائی کا منظر پیش کر رہے تھے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں، کیونکہ فطری طور پر ثمرستان یا نخلستان کے کنارے ہلکے پانی کی موج تلے مسرت کی یہی شان ہوتی ہے۔یہی میرے ساتھ بھی ہوا کہ جب میں ایک چنار کی قربت میں ندی کے پانی پر موجود پن چکی کے قریب پہنچا،تو ندی کے شفاف پانی کی چمک نے مجھے کچھ دیر کے لیے مسرت کی گہرائی میں ڈبوتے ہوئے، یہاں رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس مقام سے تھوڑا نیچے، ہماری دائیں جانب، ایک ریتیلی چٹان سے ہم دریائے گلگت کا نظارہ کر رہے تھے،جو بڑے بے لگام اور سیلابی رنگ میں زمین کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی اثنا کچھ لوگ مچھلیاں پکڑنے کے لیے دریا میں جال ڈال رہے تھے، حالانکہ دو دن پیشتر ہی ان

کا ایک آدمی اِسی دریا میں ڈوب چکا تھا۔

یہ راستہ کارگاہ کی وسیع منعکس شفاف ندی نالے کے قریب سے گزررہا تھا۔ جس کے کچھ اُوپر بدھ مت کے آثار پائے جاتے ہیں اور اُسی سے نیچے یہی پانی نہر کی صورت میں گلگت شہر تک پہنچتاہے۔ مَیں بڑی شدت اور دل کی گہرائی سے اس خوبصورت منظر کی تعریف میں مگن تھا کہ عبدللہ بیگ بڑی بد ذوقی اور میرے تصور کی تضحیک کرتے ہوئے بول پڑا، ''یہ دریا بڑاسنگدل، بے رحم اور ہولناک ہے۔ اس کے ساتھ اس کی عظمت کا کوئی پہلو وابستہ نہیں۔ یہ پیٹ کی بیماریوں کی نسبت شہرت رکھتاہے''۔ میرے عقب میں دوبانی اور حراموش کی بلند چوٹیاں سورج سنہری کرنوں میں نظر آرہی تھیں اور اُن کے نیچے بے لطف پہاڑیاں ارغوانی رنگ میں ڈھلی دِکھائی دے رہی تھیں۔

ہم نے سفرکا پہلادن ہنز ل میں گزارااور اگلے دن سلطنت کشمیر کے زیر انتظام ریاست پونیال کے علاقے میں داخل ہوگئے۔کشمیر میں ہندوحکمرانوں کی وجہ سے گائے بہت قابل تعظیم جانورکے طورپر دیکھی جاتی ہے،جس کی وجہ سے کشمیر کے زیرانتظام علاقوں میں بھی لوگ محتاط انداز میں اس کا خیال رکھتے ہیں۔ پونیال کی ریاست میں سب لوگ مسلمان ہونے کی وجہ سےمحتاط انداز میں ہمارے قافلے کے مسافروں سے بڑے گوشت پر طنزیہ باتیں کر رہے تھے۔ہمارے دو باورچی اگرچہ مسلمان ہیں، لیکن کشمیری ہونے کی وجہ سے ان کےضمیرکا اضطراب، اُنہیں گائے کا گوشت کھانے نہیں دیتا۔ ہُنزہ کے ہمارے ساتھی، ان کشمیریوں پرگائے کا گوشت نہ کھانے پرمحتاط مگر زورزور سے طنزیہ گفتگو کررہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عزیزہ گائے کے گوشت کا صحیح سالن بنانانہیں سیکھ سکا تھا اور نہ ہی وہ یہ گوشت بنانا چاہتا تھا، جس کی وجہ سے گوشت گل سڑکر چھڑہ بننے تک رکھا کرتا تھا۔

اگلا راستہ بہت اچھانظرآرہاہےلیکن یہ اُس راستے سے بالکل مختلف ہے، جوگلگت مشن1885ء میں استعمال ہواتھا، جس میں ٹھیک چندمیل آگے گھوڑے کے ساتھ چاندی کے چارہزار روپے ضائع ہوگئے تھے۔ ہمارے راستے میں خوبانیاں پک کر لذیز اور رس سے بھرچکی تھیں، لیکن ہم بڑی استقامت کے ساتھ اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ راستے میں عبداللہ کبھی کبھی خوبانی کے درختوں کی شاخوں پر چڑھ کرکسی بھالو کی طرح خود بھی کھاتا، مجھے اور دولت کو بھی شاخیں ہلاکر خوبانیاں دیتا تھا۔اس کی یہ حرکت پُرجوش اور خوشنما لگتی تھی۔ اب تک باغ کا مالک نہیں پہنچا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ اچانک کسی طرف سے نمودار ہوجائے۔یہ دنیا بھر کے زمینداروں کا طریق ہے کہ وہ ٹھیک اُسی موقع پر پہنچ جاتے ہیں، جب کوئی باغ میں داخل ہورہاہوتاہے۔

ہم پونیال کے پہلے گاؤں گلاپور پہنچے، جو بہت خوبصورت اور انار کے درختوں سے بھرا تھا۔انار کے درختوں کے پھول لہلہاتے پتوں میں چمکتے نظر آرہے تھے۔ مقامی طورپر انارکو بہت پذیرائی حاصل ہے، جبکہ بہت سے یورپی اس پھل کے غیر معیاری ہونے کی وجہ سے مطمئن نہیں۔

پونیال کا راجا انورخان، دریائے گلگت کے اُس پاررہائش پذیر تھا،لیکن اُس کی یہ روایت تھی کہ وہ مہمان مسافروں سے ملنے کے لیے اکلوتے رسی سے بنے معلق پُل کے اِس پار راستے میں اپنے لوگوں کواستقبال کے لیے بھیجتا تھا۔ مہمان نوازی کے اس سادہ لیکن عمدہ عمل سے راجااپنے حق میزبانی کی عظمت جتاتا اور راہ گیر ان کے احسان مند بن کررہ جاتے تھے۔اپنے محدود وسائل کی پریشانی میں موصوف یہاں سے گزرنے والے اپنے دوردراز کے ہمعصر راجاؤں اور رشتہ داروں کو نہ توکبھی اپنے گھربلاتا اور نہ ہی ان کے لیے کسی سواری کا انتظام کرتا

تھا۔متوسط دیہاتی حکمرانوں کی کفایت شعاری کا یہی انداز ہے۔درحقیقت اس وقت ان کی بخیلی کی وجہ اُن کے وسائل کی کمی ہے۔جب راجا موصوف کے منشی نے مجھ سے محتاط انداز میں پوچھا کہ کیا آپ دریا کے اس پار محل کی جانب جانا چاہیں گے ، تو مَیں نے بڑے مہذب اور مؤدبانہ انداز میں کہا کہ ضرور میں خود اس معلق پُل کے پار راجا محترم سے ملنے کی آرزو رکھتا ہوں۔البتہ یہ میرا مناسب جواب نہیں تھا، کیونکہ منشی صاحب باربار اس بات کا تذکرہ کررہے تھے کہ یہاں سے دریا پار کرنے کے لیے، یہی ایک معلق پُل ہے۔ آج تک کئی معززصاحبان آئے، لیکن اُنہوں نے کبھی پُل پارکرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ حوالہ صداقت پر مبنی نہیں تھا، لیکن مَیں بھی اپنی ضد پر قائم رہا۔ یہ بات مصدقہ تھی کہ مجھے اگر چھیرقلعہ (شیرقلعہ) دیکھنا ہے، جو دریا کے اُس پار کی ریاست کے دارالحکومت میں استادہ ہے، تو مجھے یقیناً رسے سے بنے معلق پُل ہی کو پار کرکے جانا ہوگا۔

رسے کے پُل سے مراد ایک ایسا پُل ہے، جو بید یا بھوج پتر کی نرم شاخوں کو مروڑ کر بنایا جاتا ہے۔ مروڑی ہوئی شاخوں کی تین بالیاں، جن میں سے ایک پر چلنا ہوتا تھا جبکہ باقی دوپُل کے گرد لچکدار جنگلے کی طرح تھیں، جن کو تھام کر آگے بڑھنا آسان رہتا تھا۔ یہ ان کے ہنر کا ایک شاہکار دکھائی دیتا تھا۔ رسے کے معلق پُل کے کناروں کو عمدہ طریقے سے شاخوں کی چھال کی مدد سے کنارے کی زمین پر مضبوط پتھر کے ساتھ عمدگی سے باندھا گیا تھا۔پُل نصف دائرے کی صورت میں جھول رہا تھا۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ نیچے دریا کی جانب جھلتا جارہا تھا ، لیکن میں بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔یہ انتہائی مہارت، سادگی، کفایت شعاری اور عمدگی سے بنایا گیا تھا۔ اس کے باوجود یورپ کے سیّاحوں کے لیے، یہ انتہائی ہتک آمیز اشیاء

کی مانند دکھائی دے رہا تھا، کیونکہ معلق پُل پر جنگلے کو تھام کر، ٹھاٹھے مارتے دریا کے درمیان، اس طرح کی خطرناک چڑھائی پر آگے بڑھنا ، دریا میں ڈوبنے کا سبب بن سکتا ہے۔ شیر قلعہ کے سامنے کا دریا تقریباً ایک سو بیس گز کشادہ تھی، جسکی وجہ سے مجھے پار کرنے میں پورے دس منٹ کی مسافت طے کرنی پڑی۔ دریا کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ ٹھاٹھیں مارتی، جھاگ اُڑاتی لہروں کے ساتھ گلیشئر کا ٹھنڈا سیلابی پانی دیکھ کر ٹھٹھک جانا فطری بات تھی،جبکہ ساتھ میں خستہ حال پُل کے گہرے جنگلے کی گرفت نے مجھے کنارے تک پہنچنے تک تھکا دیا تھا۔

راجا عین پُل کے کنارے پر عمدہ فیشن کے کھلاڑی کوٹ میں ملبوس خوبصورت چمکتے جوتے پہنے تشریف فرما تھا۔ وہ پھرتی سے آگے پُل کی جانب آیا اور کسی شاگرد کی طرح میرا ہاتھ تھام لیا۔ ایسا لگا کہ معلق پُل کے درمیان میں کوئی ماہر آدمی ہو، جس نے رسی کو ایک دم مضبوطی سے کس دیا ہو۔ وہ بڑی مہارت سے مجھے اپنے ساتھ کنارے پر لے آیا،جبکہ ایسی حالت میں زیادہ وزن کی وجہ سے پُل جھول رہا تھا۔مَیں نے ایسا محسوس کیا جیسا کوئی بندر رسی کے کنارے پر پہنچا ہو۔ کیا میں اتنا سا فاصلہ پارنہیں کرسکتا تھا؟ جبکہ یہاں پہنچنے تک میں نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی اور یہاں سے آگے بھی مَیں بڑی مہارت سے کسی قلابازکی طرح پُل پار کر چکا ہوتا۔ڈولتی ہوئی پٹڑی پر دریا کے وسط میں یہ ایک بڑا کام ہے۔نتیجتاً میں معلق پُل پار کرکے منزل کی طرف چل پڑا، تو عبداللہ بیگ کی طرف حیرت سے دیکھا، جو فرط محبت سے مطمئن دکھائی دے رہا تھا کہ پل عمدہ اور اُس پار جانے کے لیے مضبوط اور آسان ہے۔ یقیناً ہمالیہ کے پہاڑوں پر سفر کرنے والے سیّاح ان حالات سے باخبر ہوتے ہیں۔ کشمیری ایسی صورتحال سے گھبراتے ہوئے آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ مَیں نے استفسار کیا، کہ کیا کبھی یہاں کوئی

ناخوشگوارواقعہ ہوا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ’نہیں‘۔ بعض اوقات کچھ لوگوں کا نشے کی حالت میں پاؤں پھسل بھی جاتا ہے کیونکہ پونیال کے لوگ الکوحل کے استعمال کے حوالے سے بہت بدنام ہیں۔

دریاکے بائیں جانب نکلنے کے بعدمَیں راجا کے ساتھ ان کے کھیتوں اور باغات سے ہوتے ہوئے، ان کے بنگلے تک پہنچا، جہاں بہت بڑا عمدہ ٹھنڈا اور مکھیوں سے پاک کمرہ تھا۔ ہم ایک گھنٹے تک محوگفتگو رہے۔ہمارے سامنے ایک پلیٹ میں سفیدمیٹھی دوسری میں چھوٹے سائز کی خوبانیاں اور تیسرے پلیٹ میں لذیزآلوچے رکھے ہوئے تھے، ساتھ چائے بھی پلائی گئی۔ میزبان بہت خوبصورت چست اورخوش باش پچیس سالہ نوجوان تھا، مگر شکل سے بڑا لگتا تھا۔ یہ شاہ بروش خاندان کا چشم وچراغ تھا، جس کا بھائی کٹور خاندان کا وارث ہے، جن کی نسل چترال کے موجودہ حکمرانوں سے ملتی ہے۔یہ دونوں بھائی شاہ خوش وقت کے پوتے ہیں۔ ایشیاء کے اس خطے میں اس شجرۂ نسب کو بہت شہرت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر پونیالی حکمران اسی چترالی نسل کے گزرے ہیں۔

میرے میزبان کے والد راجا محمداکبرخان اس وقت اَسی سال کی عمرمیں بھی صحت مند نہایت ہشاش بشاش اور تندمزاج نظرآرہا ہے۔ چندسال پہلے اُس نے دو آدمیوں کوقتل کروایاتھا، جس کا ہندوحکمرانوں نے بُرامنایا اور اس کو راجگی سے محروم کرکے کشمیر میں قید کر دیا۔ اُس دوران بھائی کی غیر موجودگی میں صفت بہادر نے راجگی چلائی، کیونکہ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا تھا۔کشمیر سے دُوری کی وجہ سے اس عمررسیدہ آدمی کو واپس جانے کی اجازت دے کراس کوحکومت کرنے کا دوبارہ موقع دیاگیا۔آتے ہی اس نے بیٹے کی بلا وجہ بہت سرزنش کی۔ اس کا خیال تھاکہ اس کا بیٹااپنی نرم طبیعت اورخوش مزاجی کی وجہ سے باپ دادا کی مطلق العنان

بادشاہت کے قابل نہیں۔ یہ سب ٹھیک، لیکن اس کا وہی بیٹااپنے اثرورسوخ اور لیاقت کی وجہ سے اپنے والد کی موجودگی میں کئی سالوں سے بہترانداز میں کاروبار ریاست چلا رہاہے۔

گلگت ایجنسی کی ریاستوں میں پونیال بہت پُرفضا ریاست ہے۔ اس علاقے کے لوگ بہت ہوشیار اورعقلمند ہیں، اُنہوں نے قلت کے باوجود صاف اور شفاف پانی کی فراہمی کو یقینی بنایاہے۔مٹی بہت زرخیز ہونے ساتھ ساتھ، یہ ریاست قابل رسا ہے۔ یہاں سے کوئی درّہ نہیں گزرتالیکن اس کے قریب ہی بہترین سڑک گزرتی ہے۔ صرف ایک مسئلہ زمین کی ملکیت اورقبضے کے نظام کا ہے، جس کی کہیں اور مثال نہیں ملتی۔

راجے کامحل پولوگراؤنڈ کے عین کنارے پر واقعہ ہے، جس سے تھوڑاآگے ایک خوبصورت مسجدکی عمارت ہے، جسے بہترین لکڑی کے کام اور مارخور کے سینگوں کے علاوہ سطریں لگاکربڑی تزئین وآرائش اورنقش ونگارسے فن تعمیر کا نمونہ بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی دریا کے کنارے پر تاریخی قلعے کی بوسیدہ عمارت کھڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کچھ عرصے بعدگردش لیل ونہار کی وجہ سے قلعے کی حالت بھی ویران پڑ جائے گی۔ جیسے ہی مَیں نے قلعے سے دریاکو دیکھامجھے معلق پُل یاد آگیا۔معمول کی نشست اور تصویرکشی کے بعد،جو اکثرسیّاحوں کے یادگارلمحات ہوتے ہیں، ہم پونیال کے دارالحکومت سے راجا کی معیت میں نکلے اور دریا کی دائیں جانب پہنچ کر ایک دوسرے کو الوداع کہا۔

جوں ہی ہم آگے کی جانب روانہ ہوئے، وادی کشادہ ہوتی چلی گئی۔ہمیں اپنے سامنے کشادہ میدانی علاقے اورلہلہاتے کھیت نظرآرہے تھے۔ خوشبو بکھیرتی گلابی جھاڑیاں تھیں، جن کی نازک ساخت اور سرخ رنگ سے پوری وادی چمکتے

سورج کے ساتھ دلکش نظارہ پیش کررہی تھی۔ ان پھیلی جھاڑیوں کے نازک پتے اور پھول، زمین کے گردغبار کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھے، جبکہ سبزہ زار اور چمکتے پھولوں کی مہک نے پورے منظرکو سرسبز بنا رکھا تھا۔ سڑک پر گرمی مسلسل بڑھ رہی تھی، کیونکہ یہاں سے گاؤں تک پوراعلاقہ غیریقینی طورپر بے آب و گیاہ پڑاتھا اور چٹانیں گرمی کو مزید مہمیز کررہی تھیں۔ ہمارے لیے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اگرہم کسی قریبی باغ میں رک کر لذیذ خوبانیوں کا لطف اُٹھاتے، تو وہ پیٹ کی بیماریوں کا سبب بھی بن سکتی تھیں۔ بہرحال مَیں نے بڑے شوق سے رس بھرے فرنگی توت کھانے کی خواہش کی کیونکہ یہ پھل صرف پونیال میں ہی پائے جاتے ہیں۔

اس ریاست سے گزرتے ہوئے، مَیں اس نتیجے پر پہنچاکہ یہاں کے لوگ اپنی قدر وقیمت کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔پونیال کے لوگ شاندار سواری کرنے کے ساتھ بہترین لڑاکو بھی ہیں۔ ان کے مقابلے میں صرف ہُنزہ والے ہی ہوسکتے ہیںلیکن ان کی ایک کمزوری یہ ہے کہ یہ لوگ کوئی بڑا کام کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے اورگندے بھی ہیں۔ تاہم آبادی میں مسلسل اضافے کی وجہ سے جدوجہد کرنے لگے ہیں۔یہ نوکری کرنے سے انکاری ہیں اس لیے بہت سی اہم نوکریاں ان کے ہاتھوں سے نکل چکی ہیں۔چترالی حکمرانوں یا چترال النسل لوگوں کے حکومتی ضابطے میں یہ لوگ خوش وخرم رہتے ہیں اور آرام طلب ہیں۔یہ انگور کے جوس کو بہت پسندکرتے ہیں، وہ شراب(عرق) کو پسند کرتے ہیںجبکہ اس طرح کی شراب یورپ کے لوگوں کے لیے ہفتے بھر تک دردسر کا باعث بن سکتی ہے۔

پونیالی اپنے ہمسائیوں کی نسبت بہت اچھے ہیں لیکن اُن کی بدانتظامی کی وجہ سے اُن کی زرخیززمینیں ضائع ہورہی ہیں۔ان کی زمین ناہموار اور پہاڑی

ہونے کے باوجود بہت خوبصورت ہے، جس کی وجہ سے یہاں کے لوگ کافی مالدار ہیںاپنے ہمسائیوں کی نسبت اسراف اوربخیل نظرنہیں آتے۔ پونیال کے مردوں کی ایک خامی یہ ہے کہ ان کی نسبت خواتین بہت محنتی ہیں اور زیادہ ترکھیتوں میں کام کرتی نظر آتی ہیں۔ مردحضرات زمینداری سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ صرف کاشتکاری کی زمینوں کے مقدمے لڑتے رہتے ہیںاور یہی پہاڑی لوگوں کی تنزلی کی علامت ہے۔ آج کل پونیالی خواتین شائستہ پتلون نما کپڑے پہننے سے بھی گریزاں ہیں۔ اس معاملے میں گردونواح کی خواتین بھی ان کپڑوں کو ناپسند کرتی ہیں۔ تاہم اس ضمن میں کوئی بھی اچھا مسلمان اس رواج کو نظرانداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اب توگردونواح کے ہمسائیوں میں اس طرح کے ملبوسات پہننے کا رواج پہنچ چکا ہے۔

بہرحال پونیالی قطعاً لباس و ملبوسات اور دیگر معاملات میں اشکومن اور نگرکے لوگوں کی طرح اردگرد کے لوگوں سے اجنبیت نہیں رکھتے بلکہ وقت اور زمانے کے ساتھ چلتے ہیں۔گلمتی سے آگے تنگ وادی میں آبشارمیں سے گزرتے ہوئے میرا ان کے بارے میں یہی تصور تھا۔ راستے میں شفاف وسیع نیلی ندی کی تیز دھار کے باوجود، ندی کے کنارے چٹانوں کے اُوپر لپکتے اخروٹ کے درختوں کے ساتھ بیشمار جنگلی گلابی پھول اوردیگر جھاڑیوں کے سرسبزپس منظر میں پانی کے اُوپردیسی پن چکی کی پرسکوت عمارت نظرآرہی تھی۔تھوڑا نیچے نامرغوب دریائے گلگت بہہ رہا تھا،جس کے پیچھے دور بوبر کا خوبصورت گاؤں نظر آ رہاتھا، جو نخلستان اوردرختوں کے نئے پتوں کے بیچ واقعہ ہے۔تھوڑاآگے تنگ درّے میں جنگلی بادام کے درختوں کی کثرت دکھائی دے رہی تھی، جن کے مغز سے تیل نکالا جاتا ہے اور شاخوں سے پولو کی بہترین چھڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ ہم لڑکھڑاتے پہاڑی سے

نیچے کی طرف جاتے ہوئے، میدانی کھیتوں تک پہنچ گئے، جہاں خواتین بے مقصد اور اُجرت کے بغیر سونے کی تلاش میں دریا کے کنارے پانی چھان رہی تھیں اور ساتھ کچھ لوگ گندم کی فصل کی کٹائی میں لگے ہوئے تھے۔ وہ غلے کو گاہنے کے بجائے، چھوٹے چھوٹے گٹھے بنا کر ایک جگہ جمع کر رہے تھے، کیونکہ وقت کی اہمیت کے پیشِ نظر دوسری فصل کی کاشت کے لیے کھیت کو جلدی تیار کرنا تھا۔

ہم سات ہزار فٹ بلندی پر ہونے کے باوجود گرمی محسوس کر رہے تھے، جبکہ بنجر علاقے کے قریب پھلدار باغات کے ساتھ گنگناتی ہوئی شوریدہ سر لہروں کا دریا بہہ رہا تھا۔ ہمارے ساتھ قافلے میں بہت سے لوگ تھے۔ دولت بیگ نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے خیمے کے سامنے ایک بڑے پردے کا اہتمام کیا کیونکہ ہم نے اس مقام پر نہانے کا بھی سوچ رکھا تھا۔ مَیں نے شدت سے پردے کی مخالفت کی اور کہا کہ کیا میں پردہ دار خاتون ہوں؟ جو تم اس طرح کر رہے ہو۔ دولت بیگ نے مجھے یہاں کے لوگوں کی حساس طبیعت کے بارے میں آگاہ کیا، تو میں سمجھ گیا۔ اُس نے کہا کہ ہم یہاں مویشیوں کے احاطے کے قریب قیام رکھے ہوئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی خاتون آئے اور یہ دیکھ کر پریشان ہو جائے کہ صاحب نہا رہے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ مشرقی معاشرے میں رسم ورواج کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ مَیں ایک دم پردے کے پیچھے خلوت میں چلا گیا جہاں ٹینٹ سے تھوڑی دوری پر گاؤں کے چند عمائدین رہائش پذیر تھے۔ وہ بھی اس نسبت کو سمجھتے ہوئے کچھ دُور جا کر گوشہ نشین ہوگئے۔ اس تنگ درّے سے نکلتے ہی شمال کی جانب وسیع وعریض، کھلے اور پھیلے ہوئے گاؤں نظر آنے لگے، جن کو دیکھ کر ہمیں لداخ کی سرزمین یاد آگئی۔ دریا کی بائیں جانب گرم چشمہ نظر آرہا تھا، جہاں سے لوگ بوتلوں میں پانی لے جارہے تھے جو اچھی صحت اور بیماریوں

سے نجات کے لیے دوا کے طور پر استعمال کرتے تھے اور ساتھ یہاں نہانے بھی آجاتے تھے۔

ہم آگے بڑھ کر وسیع میدانی علاقے میں داخل ہوگئے، جہاں دریائے اشکومن دریائے گلگت سے جا ملتا ہے۔ لیکن ہمارا سفر آگے ایک ایسی تنگ و تاریک وادی کی طرف ہے جہاں بھورے رنگ کی سخت چٹانوں پر مشتمل پہاڑیاں ہیں۔ ہمارے سامنے ایک خستہ حال وادی تھی، جہاں چند جنگلی بید، بادام اور جھاڑیاں دریا کے کنارے نظر آرہی تھیں۔ سڑک بہت مشکل اور خستہ حال پگڈنڈی کی طرح تھی۔ بڑی تکلیف سے ہم ہوپر پہنچے، جہاں سے آگے ویران اور بنجر علاقہ دِکھائی دے رہا تھا جہاں پونیال اور ریاست غذر (گوپس) کے درمیان حد بندی کا پتھر نصب تھا جو ریاستوں کے مابین سرحد کا تعین کر رہا تھا۔

باب ۔ 3
کوہ اور غذر کی جڑواں ریاستیں

ہم پونیال کی سرحد عبورکرکے کوہ غذر میں داخل ہوگئے یہ ہمارے گورنر شب کے لئے ایک نئی ریاست تھی جس کا انتظام گورنر کے ذریعے چلایا جاتا ہے اور وہ گوپس میں مقیم ہے۔ ان گورنروں کو عموماً راجا کہاجاتا ہے چترالی روایات میں اُن کو مہتر بھی کہاجاتا ہے۔

نئی ریاست سے ایک خادم مراد شاہ ہمارے پاس پہنچ گیا آتے ہی اس نے ہمیں اپنی گرفت میں لیا اور آگے بڑھنا شروع کردیا بالکل ایسے جیسے گدھ کسی مردار کے تعاقب میں نکلا ہو۔ میں نے اُن کی چال سے بچنے کی بھرپور مزاحمت اور کوشش کی۔ جوں ہی ہم آگے بڑھ کر ریاست کے دارالحکومت تک پہنچے تو دولت شاہ نے عاجزی سے عرض کیا کہ 'یہ خستہ حال اور ناہموار کھیت راجا صاحب کے ہیں'۔ ان کی بات کاٹتے ہوئے دولت بیگ طنزاً بولے، 'جی ہاں' 'یہ خستہ حال کھیتیاں جو آگے شاہی محل تک نظر آرہی ہیں یقیناً راجا کی ہونگی'۔

مرادشاہ اپنی بات پر شرم سے منہ چھپارہا تھا کہ اچانک ننگے پاؤں غلیظ کپڑوں میں ملبوس ایک آدمی جس کے دائیں جبڑے کے کونے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا تھا، ہمارے درمیان پہنچ گیا۔ اس کو دیکھ کر ہم نے گردونواح کے ہموار پھیلے کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ اتنی زمینوں کے باوجود اس غریب کو بھیک مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ غریب لاچار شاید راجا کی وجہ سے اِس حالت میں بھیک مانگنے پر مجبور ہے کہ وہ اِن کو کچھ نہیں دیتا ہوگا۔ اتنے میں دولت بیگ نے آگے بڑھ کرسائل کو دو آنے دیے اور کہا'یہ لو جی! ہمیں دعاؤں میں یاد رکھو۔

جواباً سائل نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاکرہمیں خوب دعائیں دیں۔ ہمارے سفر کی کامیابی کا دارومدارہماری اس خیرات پر ہوگا، جو ہم نے اِس سائل کو دی ہے۔ یوں ہم نئی ریاست میں لغو استقبالیے کے ساتھ داخل ہوگئے۔

دریائے گلگت کے کنارے کنارے آگے بڑھتے ہوئے ہم راؤشن پہنچے، ٹھاٹھیں مارتاہوا دریا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا اور بیچ دریا ایک چٹان ایستادہ تھی۔ راؤشن کا پرانا قلعہ خستہ حالی سے گرچکا تھا جس کی وجہ سے قلعے کی منظرکشی ممکن نہ تھی۔ یہاں کے نمبردار بہت زاہد اور شریف النفس انسان ہے جو کئی سالوں سے امن و امان قائم رکھنے کے لئے نہ صرف ہماری خدمت میں مگن ہے بلکہ حکومت سے بھی ہرقسم کے تعاون کا مظاہرہ کررہا ہے۔ جب ہم نمبردار سے ملے تب وہ بڑے تعجب اور حیرانگی سے مجھے دیکھ کر اشاروں میں بتانے لگا کہ 'حکومت اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ روشن میں اب کوئی اژدھا موجودنہیں'۔

بقول نمبردار صدیوں پہلے یہاں ایک اژدہا لوگوں کا شکار کیا کرتاتھاوہ بیلوں کے ساتھ ساتھ گاؤں کے جوان لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی نگل جاتاتھا۔ حیران کن طورپر میں وہ جگہ دیکھ کرششدر رہ گیاکہ کس نے اُن دیوقامت اور درندہ نما اژدہوں سے نجات دلائی ہوگی؟ یوں لگاجیسے عیسائی راہب سینٹ جارج (St. George) نے راؤشن کا اژدہا بھگایاہو۔ انہوں نے کہاکہ صدیوں پہلے یہاں ایک بزرگ تشریف لائے اور ہمیشہ کے لیے اس ناسور سے لوگوں کونجات دلا دی لیکن اُس کے بارے میں کسی کوکوئی علم نہیں کہ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔

اُس بزرگ کوصد آفرین کہ جس نے اپنی بزرگی وکرامت سے اُن دونوں اژدہوں کو اِس چٹان میں بدل دیا۔ نمبردار نے دلی مسرت اور فاتحانہ انداز میں کہا'' وہ دیکھو، دو بڑی چٹانیں، جوکبھی دو اژدہے تھے''۔ دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ واقعی یہ

ایک معجزانہ کام ہوا ہے۔ جب مَیں نے چٹان کی حالت کا جائزہ لیا، تو صاف دکھائی دے رہا تھا کہ کسی وحشی اژدہے کو متحجر (مفلوج ہوکر پتھر بن جانا) کردیا گیا ہے اور کچھ ہی فاصلے پر اُوپر کی جانب اُن کا جسم بالکل حقیقت کی طرح عیاں تھا، جو بلا شبہ ایک غلیظ اور خطرناک رُوح کا عکس تھا۔ بزرگ نے اپنا کمال تو دکھا دیا، لیکن اُس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں۔ کاش ایسے بزرگوں کے نام یاد رکھے جاتے۔ ویسے آج کل مسلمانوں کے ہاں اژدہوں کا تصورا تنا زیادہ نہیں لیکن مجھے یہاں کا منظر دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔

کچھ ہی مسافت طے کرنے کے بعد ہم گوپس پہنچ گئے جو گلگت کے بعد ایجنسی کے اہم مقامات میں سے ایک ہے لیکن مجھے اکثر ایسی جگہوں سے مایوسی ہوئی ہے۔ یہاں پر کشمیری فوجی چھاؤنی کا ایک پُر تعیش دستہ تعینات ہے جس کے لیے ڈسپنسری، ٹیلی گراف اور دو خستہ حال دُکانوں کی سہولت بھی موجود ہے۔

کوہ غذر کے راجا بھی اشکومن اور یاسین کی طرح گلگت ایجنسی کی طرف سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ یہ ایسا عہدہ ہے کہ ایک دفعہ ملنے کے بعد دوبارہ واپسی کا امکان نہیں جس کی وجہ سے یہ لوگ اس سے زندگی بھر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے انہوں نے بہتر انتظامات کئے تھے لیکن یہ ہُنزہ اور نگر کی طرح عوامی سطح پر ہوتے تو اچھا ہوتا جہاں استقبالیہ عوامی نوعیت کا ہوتا ہے۔

یہ 1933ء کی بات ہے راجہ محمد رحیم خان کو کچھ عرصہ پہلے راجہ مراد خان کے جانشین کے طور پر تعینات کیا گیا تھا۔ راجا مراد خان کو ضعف العمری کی وجہ سے ریاست کے وسیع تر مفاد میں اس عہدے سے سبکدوش کردیا گیا ہے۔ نیا راجا چلاس میں وزیر تھا۔ مَیں سات سال پہلے وہاں اُس سے ملا تھا لیکن اِس دفعہ کی ملاقات کوئی زیادہ پُر لطف نہیں رہی۔ شاید اس لیے کہ موصوف کی ترقی ہو چکی

تھی۔ گلگت ایجنسی کا یہ پہلا اور واحد راجا تھا جس نے غیر مہذب انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ ہماری ان سے ملاقات اُس کے باغ میں لگے خیمے میں ہوئی جہاں وہ اپنے لیے نیا مکان بنانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ شاہی محل کی نئی تعمیرات کی جگہ بہت ہی خطرناک اور کافی دور تھی جہاں اس قسم کی عمارت کی تعمیر نا کام بھی ہوسکتی ہے۔

اس موقع پر انہوں نے مجھے شراب اور سوڈا پینے کی پیش کش کی کیونکہ دنیا کے اس حصے میں محمدی (مسلمان) اس قسم کی منشیات سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ مَیں اپنے میزبانوں سے کہیں زیادہ خوش قسمت تھا کیونکہ سوڈا بہت مزے دار تھا، جس سے میرے دوست عجب سگھ، جو بہت ملنساز اورخوش طبع انسان ہونے کے ساتھ یہاں کشمیری چھاؤنی کا فوجی کمانڈر ہیں، مجھ سے اپنی حیرانی اور شرماہٹ نہ چھپا سکا۔ اُس نے بڑی خوش اخلاقی سے میزبان کو اس طرح کی نئی شے بنا کر پلانے کو سراہا۔ مختصر قیام اور علیک سلیک کے بعد مَیں یہاں سے اپنے قافلے کے ساتھ بدمستی اور رنگ رلیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس موقع پر تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔ راجا نے مجھے ایک بکری کے ساتھ چند انڈے پیش کیے اور مَیں نے شارٹ گن کے پچاس کارتوس اس کو دیئے۔

اِسی دوران راجہ کا صاحبزادہ مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت خوش اخلاق، ملنسار اور خوش باش نوجوان تھا، ہلکی پھلکی انگلش بھی بولنے کی کوشش کی، کیونکہ وہ سری نگر میں کسی سکول میں پڑھتا تھا، لیکن باربار فیل ہونے کی وجہ سے راجا صاحب نے اُسے واپس بلالیا تھا۔ مَیں نے اُس نوجوان سے کافی ہمدردی کا اظہار کیا۔ راجے اپنے بچوں کو بڑی مشکل سے تعلیم دلانے کے لیے سرینگر بھیجتے ہیں مگر تعلیمی ناکامی اِن کے لیے اضافی اخراجات کا سبب بنتی ہے۔ پس ماندہ گاؤں کے

نوجوان جب بڑے شہروں کی جانب نکلتے ہیں تو وہاں کے انداز اُن کی سادگی اور شگفتہ مزاجی کو بگاڑ دیتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے نہ تو موٹر سائیکل، سنیما یا پہیے کی کوئی بھی گاڑی دیکھی ہوتی ہے اور نہ ہی کسی بڑے اور مہذب سٹور کا نظارہ کیا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے وہ لوگوں کے سامنے تماشہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ انہی مسائل کی وجہ سے یہ نوجوان اپنے والدین کے پیسے سرینگر کے شہر میں خوش گپیوں میں ضائع کر بیٹھے ہیں۔ عموماً ایسے نوجوان اتنے خرافات اور رنگینوں سے مایوس ہوکر واپس آتے ہیں۔ عموماً یہ نوجوان گشپور یا حکمران خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت کم کامیابی حاصل کرکے لوٹتے ہیں، بہرحال یہ نوجوان بری الزمہ نہیں ہو سکتے۔ یہ لوگ گلگت سکاوٗٹ میں کچھ عرصہ سالانہ جمعداری کی تربیت کے ساتھ زیادہ تر لوفری، عیش وعشرت اور اپنے والدین کی دولت کی موج مستی میں زندگی کے مزے لُوٹ رہے ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کے بیوقوف والدین کی اجازت سے ہوتا ہے۔

کوہ (کھوہ) کے معنی پست اور نچلی زمین کے ہیں، غذر کے یہ بالائی اور زیریں علاقے چترال کی سرحد شندور سے، دریائے اشکومن اور گلگت جہاں ملتے ہیں ،تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں کی زمین انتہائی غیر زرخیز، چٹانوں اور پہاڑوں پر مشتمل بہت ناہموار ہے۔ چندمقامات پر ہموار اور زرخیز زمین کے ساتھ چراگاہیں بھی پائی جاتی ہیں۔ وسیع بنجر اور بے آب وگیاہ ہونے کی وجہ سے درخت بہت کم نظر آتے ہیں۔ کوہ اور غذر کے لوگ اپنے ہمسائے یونیالیوں کی طرح اتنے سست اور کاہل ہیں کہ سرکاری نوکری بھی نہیں کرتے۔ اِن کی نسبت ہُنزہ کے لوگ ہرطرح کے کام (Jobs) کرتے ہیں۔ اِن وجوہات کی وجہ سے ہرسال موسم سرما میں لوگ فاقوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ خاص کر امسال (1933ء) کے موسم بہار کے

آواخر سے موسم سرما کی شروعات تک بہت بُری حالت میں زندگی گزری ہے۔ پہاڑی لوگ مشقت کے عادی ہوتے ہیں اس کے برعکس غذر کے لوگ مشقت کے عادی یا محنتی نہیں ہیں۔ سال میں یہاں صرف ایک ہی فصل ہوتی ہے وہ بھی اُن کاشت کاروں پر بوجھ ثابت ہورہی ہے۔ چترال کے لوگ بھی اتنے محنتی نہیں لیکن پھر بھی موسم سرما میں اِن کے علاقوں میں آکر ہرقسم کے کام کرتے ہیں۔ یہ ایسے کام ہوتے ہیں جن کو اِس علاقے کے لوفر اور فضول گھروں میں بیٹھے لوگ بھی کرسکتے ہے۔ تنگ پہاڑی سلسلے، بنجر اور تپتی چٹانوں کی منعکس گرم دھوپ سے ہم اُکتا چکے ہیں دور دور تک سبزے کے آثار نظر نہیں آرہے جس کی وجہ سے سفری بیزاری جنم لے رہی ہے۔ عقلمند لوگ اس طرح کے خشک و بنجر علاقوں میں سیر کرنے نہیں آتے نہ ہی پیاسے گدھوں کو چٹانوں سے گزرتے لاتیں مارتے پھرسکتے ہیں۔ ان حرکتوں سے راستے کی دھول اُٹھ کر حیران کن سماں پیدا کر دیتی ہے۔ کیا عقلمند آدمی ایسا کرسکتا ہے؟ پیاس اور تھکاوٹ سے زبان خشک ہوچکی تھی جبکہ کھائی سے صاف شفاف اور ٹھنڈا تازہ پانی گزررہا تھا لیکن اتنی گہرائی میں جاکر کوئی بیوقوف ہی اللہ کی اس نعمت سے بہرہ ور ہوسکتا تھا؟

اسی دوران راستے میں ہمیں ایک پٹھان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ملا جو اپنے ملک سے بھاگ کر آرہا تھا۔ ممکن ہے کسی اچھے کام کی وجہ سے آیا ہو۔ اُن کے ساتھ ایک بہت اچھا ولایتی لاسانسل کا کتا بھی تھا۔ انہوں نے مجھ سے کتا خریدنے کی بڑی منتیں کیں لیکن اُن کی بیوی کتّے کے بارے میں کافی مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اسرار کر رہے تھے کہ یہ کتا ہرچیز کھاتا ہے لیکن مَیں نے اُن کی بیوی کے جذبات دیکھ کر اُس کو لینے سے معذرت کرلی۔ مجھے اُسے خریدنے کی خواہش تھی لیکن اپنے جذبات کی وجہ سے ایسا نہ کرسکا یقیناً کتا ایک اچھے مالک

اور گھر سے محروم ہوگیا ہوگا۔کارواں آگے بڑھ رہا تھا راستے میں آگے نکل کر کچھ جنگلی درخت جن میں بید، سفیدے اور جنگلی گلابی پھول کے پودے نظر آرہے تھے جن کے درمیان ایک ندی بہتے دیکھ کر بہت سکون و مسرت ملی۔

سفر کے دوران سرسبز علاقوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے باسیوں نے ان بیابان جگھوں کو آباد کرنے میں کتنی محنت کی ہوگی۔ سست اور کاہل ہونے کے باوجود ان لوگوں نے کوہلوں کی تعمیر میں جتنی محنت کی ہے اتنا فائدہ نہیں باوجود اس کے کہ ان کی زراعت کا انحصار آبپاشی پر ہے۔ ہم نے راستے سے تھوڑا اوپر ایک کوہل دیکھا جسے پہاڑی کو چیر کر چٹانوں کی کگروں پر بڑے بڑے پتھروں کے ڈھارس کے ساتھ لکڑ سے پانی کی روانی کو اس انداز سے روا کیا گیا ہے جیسے کوئی منحنی خط یا سانپ بل کھاتا چل رہا ہے۔ بارش اور سیلاب کی وجہ سے یہ کوہل جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے جس کی تعمیر نو ان غریب لوگوں کی بس کی بات نہیں۔ ان کے گورنر نے اُن سے نصف زمین کے بدلے اس کوہل کی دوبارہ تعمیر کا وعدہ کیا ہے لیکن لوگ ایسے معاہدے سے اپنا نقصان کرنا نہیں چاہتے۔ اس قطعہ زمین کے محاصل چھے گنا بھی نہیں اس لئے ان سے بہرحال فائدہ لینا چاہئے۔اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ اِن لوگوں کے پاس پچھلی فصل کا اناج ختم ہوچکا ہے نئی فصل تیار نہیں لوگ بہت حد تک فاقوں کا شکار ہیں۔ اس مشکل وقت میں اناج کا انتظام ممکن نہیں نہ ہی ہنزہ والوں کی طرح خوبانی کی کثرت ہے جس پر گزرا کیا جاسکے۔

ہمارا قافلہ کھوہ کے آخری گاؤں پنگل پہنچ چکا ہے جو کافی خوبصورت مگر ناہموار ہے۔ ہم نے مشاہدہ کیا کہ غذر کے لوگ چترالیوں سے بہت متاثر ہیں وہ نہ صرف کھوار زبان بولتے ہیں بلکہ چترالیوں کی طرح آنکھوں میں سرمہ لگاتے

ہیں۔ آنکھوں میں کاجل لگانے کی روایت ہندوستان کی خواتین میں عام سی بات ہے لیکن یہاں مرد اور بچے بغیر نہائے غلیظ اور گندی حالت میں سرمہ لگاکر خوبصورت بننے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ اِن کے پاس اصلی سرمہ بھی دستیاب نہیں نقلی یا کوئلے کے سرمہ کے استعمال کی وجہ سے یہ رسم بالکل فضول لگ رہی ہے۔

پنگل سے آگے وادی بہت تنگ ہوتی جارہی ہے راستے میں پتھروں کی دیواریں، رکاوٹیں اور ایک چٹان پر کنکروں کا ڈھیر لگا دیا گیا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کسی لشکر نے اپنی تعداد دکھانے کے لئے جمع کیا ہوگا یہ چیزیں ماضی کے جنگ وجدل کی عکاس ہے۔ ماضی کے حملہ آوروں سے بچنے کے لئے بنائے گئے قلعے کی حالت خستہ ہوچکی ہے دیواریں گرنے کی وجہ سے قلعہ مسمار ہو چکا ہے۔ ماضی کے اہم دفاعی جگھوں کی اب اتنی ضرورت نہیں رہی ہے۔ اس علاقے سے آگے روّت کی وادی کافی کشادہ، پہاڑیاں کم بلند اور سرسبز دکھائی دے رہی تھی۔

یہاں تک کے سفر کے دوران ہمیں یقین ہوگیا تھا کہ غذر کے بالائی علاقے خشک، بے ثمر، بنجر اور بے ذوق ہونگے لیکن درکوت کے آگے سے نکل کر اس تصور میں بہت حد تک کمی آگئی۔ اس گاؤں میں پہنچتے ہی لوگ اردگرد جمع ہونے لگے دولت بیگ اور عبداللہ نے ان سے سوالات شروع کردیئے، ’آپ لوگ ایسے پست، کچے اور باڑوں میں کیوں رہتے ہو؟ تم سردیوں میں تین فٹ برف کے دوران ان مکانات میں کیسے رہتے ہو؟ ان سائبانوں سے بہتر اپنے لئے گھر کیوں نہیں بناتے ہو؟ یہ تمام سولات سن کر کے ہجوم نے بہت بیوقوفانہ جوابات دیئے جو بالکل مناسب نہیں تھے۔ انہوں کہا کہ' ہم سست اور کاہل ہونے کے ساتھ

آرام طلب ہیں محنت مشقت سے عاری ہونے کی وجہ سے ان خستہ حال سائبانوں میں مقید ہوکر نئے گھر نہیں بناتے۔ ان لوگوں سے اس طرح کا ردعمل سن کر ہمیں اس علاقے کے لوگوں کے ذہنی معیار اور کردار کا ادراک ہوگیا۔

ہم چھشی گاؤں کے نزدیک سڑک کے دائیں طرف سے آگے بڑھ رہے تھے، اچانک دو بیضوی مسطح پتھر دیکھنے کو ملے جن کو دیکھ کر ماہرین آثار قدیمہ بھی دنگ رہ گئے ہوتے۔ یہ گول مسطح پتھر آٹھ سے دس فٹ بلندی پر صحرای مٹی، کنکروں اور بڑے تودوں کی طرح ہموار تھے۔ تین فٹ نصف دائرے کی شکل میں سے ایک فٹ زمین کی طرف جھکا ہوا تھا جبکہ گھسی ہوئی مٹی چارفٹ سے نصف فٹ تک اونچی تھی۔ پتھر کی طرح نوکدار درمیانی حصہ قدرتی یا حادثاتی طور پر بڑے قاعدے سے رکھا ہوا تھا۔ یہ دو ایسی گول چیزیں تھیں جو سوائے گوپس کی چند قبروں کے کہیں اور نہیں پائی جاتی ہے۔ مقامی لوگوں کو ان آثار کے بارے میں کوئی مستند علم نہیں جس کی وجہ سے ان کو کوئی تحفظ حاصل نہیں ہے۔

راستہ یہاں سے آگے چھشی کی طرف جارہا تھا جس کے نیچے مٹی کی چھتوں کے گھر نظر آرہے تھے۔ ہر چھت پر ایک روشن دان دھوئیں اور روشنی کے لیے بنایا گیا ہے جہاں سے آسانی کے ساتھ کوئی بھی چیز اندر پھینکی جاسکتی ہے۔ سڑک کے کنارے ایک خاتون چمڑے کے مشکیزے کو غبارے کی طرح جھولا رہی تھی۔ یہ اس علاقے میں دودھ سے لسی اور گھی بنانے کا دیسی طریقہ ہے۔ یہ مشکیزہ اتنا بڑا تھا کہ اس کو جھولانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہمیں اس سے آگے ایک بڑے ٹیلے کے اوپر چڑھنا تھا جس نے پورے علاقے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اس ٹیلے کی وجہ سے پھنڈر کی جھیل بنی ہوئی ہے جس سے آگے بہت خوبصورت سرسبز زمینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ دریا ان کے درمیان ہموار سطح سے گزر رہا تھا۔ مقامی

لوگ اس خوبصورت جگہ کو چھوٹا کشمیر پکارتے ہیں۔ یقیناً یہ کہنا حق بجانب ہے کیونکہ جہاں سے ہم گزر رہے تھے بہت ہی خوبصورت جگہ ہے۔ سفری تھکاوٹ کے باوجود ہماری آنکھیں اس سرسبز چراگاہ کے سبزے اور دلدل کو دیکھ کر راحت محسوس کررہی تھیں۔

دریائے غذر میں انگلش ٹراؤٹ مچھلیاں ڈالی گئی تھیں جس کی وجہ سے لوگ ماہی گیری کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ مقامی لوگ منہ ہلا ہلا کر بغیر ہڈیوں کے لذیز گوشت کی تعریف کررہے تھے۔ بدقسمتی سے بڑی محنت کے باوجود ہم قراقرم کی انگلش ٹراؤٹ مچھلی نہ کھا سکے۔ ان مچھلیوں نے مقامی دیسی مچھلیوں کو کھا کر دریا سے ان کا خاتمہ کردیا ہے۔

اس بستی سے آگے غیر مہذب بندوبستی علاقہ نظر آرہا تھا جہاں وسیع میدان اور دلدلی سرسبز زمینیں تھیں جن میں درخت بہت کم دکھائی دیتے تھے۔ جگہ بہت اچھی مگر دس ہزار فٹ بلندی کی وجہ سے فصل بہت دیر سے پکتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک خاتون (Marghon) نیلے جری پھول کے تنوں اور پتوں کو سکھا رہی تھی جس کو وہ موسم سرما میں پکا کر کھاتے ہیں۔

ہم غذر کے آخری گاؤں ٹیرو کی طرف بڑھ رہے تھے، جس کا فصل آب (Watershed) چترال کے قریب بہت بلندی پر واقع ہے اتنی دوری کی وجہ سے سبزاہٹ کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت مایوس کن ہے۔

ہمارے سامنے مغرب کی جانب اُونچے پہاڑی سلسلے کے درمیان میں دو چھوٹے گلیشیرز بھی دکھائی دے رہے ہیں لیکن پچھلے دو ہفتوں کی سفری مشکلات کے بعد ہم اس طرح کے دلچسپ منظر کی آغوش میں آسکے ہیں۔

جوں ہی ہم شندور کے انتہائی خوبصورت سرسبز وشاداب مقام پر پہنچے

چرند، پرند اور درندے سب اپنی آزاد دنیامیں خوش وخرم قدرتی حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور کوئلیں گنگنارہی تھیں۔میدان چراگاہ دُور بلندی تک پھیلا ہوا تھامگر ٹیرو کے دربدر زمینداروں نے یہاں بھی گرمیوں کی فصلوں کی بوائی اور گہائی کے لیے جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔

سڑک آگے کی جانب اِن دلکش نظاروں سے نیچے تنگ وادی کی طرف جا رہی تھی جہاں پر جنگلی بید، پھول،جھاڑیوں اور سبزے نے سڑک کو پھولوں کی طرح خوبصورت اور دیدہ زیب بنارکھا تھا۔چراگاہ کے درمیان میں چھوٹے چھوٹے جانور جبکہ کافی دُور فاصلے پر خوش گاوٗ (Yak) کے ساتھ گائے بیل بھی چرائی میں مصروف تھے۔اس منظرکو دیکھ کر میرے ہمسفر ہُنزہ کے لوگوں کے منہ میں پانی بھرآیا تھا اور وہ حسد سے عش عش کر رہے تھے۔ یہاں سے آگے کچھ فاصلے پر قابل توجہ شندورکا آخری فصل آب(منبع) واقع ہے۔ درّہ شندور دونوں اَطراف سے انتہائی سادہ مناظر کے حامل ہونے کے ساتھ چوٹی کی دوسری جانب غذر اور گلگت ایجنسی کی آخری ریاستی جغرافیائی سرحد کی حدود واقع ہیں۔

☆☆☆☆

باب نمبر4
ریاست یاسین یا ورشگوم

پندرہ جولائی 1933ء کو چغار چترال کے سرحدی مقام پر ہم نے کیمپ لگایا جہاں سے مڑکر درکوت کے راستے دوبارہ گلگت ایجنسی کی حدود کی طرف نکلنا تھا۔ چترال کے بارے میں جان کاری میرے دورے کا مقصدنہیں تھا۔ اس لئے شمال کی جانب درہ شندور کی آخری سرحد کی طرف رُخ کیا۔ وہاں سے مڑ کر اسی درّے روانہ ہوئے جو درکوت پاس کی طرف تھا۔ یہ سرحدی علاقہ سطح سمندر سے تقریباً 15380فٹ بلندی پر واقع ہے جو یاسین کو چترال سے الگ کرتا ہے عموماً یاسین گوپس سے آنے جانے کا یہی راستہ ہے مگر اس دفعہ ہم اُسی راستے سے جارہے ہیں جس پر پامیر بونڈری کمیشن کے لوگ واپس نکلے تھے۔

ہمیں برف باری ہونے سے پہلے ہی اس مشکل علاقے سے گزرنا تھا لیکن نکلنے سے پہلے ہی برف شروع ہوگئی۔ ہلکی برف باری میں آرام آرام سے سفر کا آغاز کیا کیونکہ ہمارے ساتھ موجود خوش گاوٗ برف میں تیز چلنے سے قاصر تھے۔ تقریباً پانچ گھنٹے کی مشکل مسافت کے بعد ہم درّہ کے پار پہنچے۔ ہمارے قافلے کی روایت کے مطابق جس علاقے میں داخل ہوتے اُسی علاقے کے قلی سامان سفر لینے پہنچ جاتے تھے۔ ایسا نہ کرنے پر کم ازکم ایک بکری جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ میرے دوستوں نے اس راستے کی مردم بیزاری اور دشواری کی بہت شکایت کی ۔ بہرحال وہ کئی بار اس راستے سے گزر چکے تھے یقیناً میں نے بھی اس دشواری کو محسوس کیا۔ ایک طرف یہ درّہ کافی اترائی اور چڑھائی پر مبنی تھا دوسری طرف پھر سےکیمپ لگانا پڑ رہا تھا۔ چترال کی جانب راستہ بہتر تھا لیکن درکوت کی طرف

حالت بتدریج دشوار ہوتی جارہی تھی۔ اترائی اور برفانی سفر کے دوران ایک گلیشیر بھی طے کرنا پڑاجو بہت ناگوار تھا ان تمام مشکلات سے گزر کر اخرکارہم داوی درکوت پہنچ گئے۔

پونیال اور غذر کے بنجر، ویران اور بے رونق علاقوں کے سفر کے بعد شندور اور اس نئ وادی کے سبزہ زاروں نے ہمارا نقطہ نظر بدل دیا ہے۔ہم درکوت کے چھوٹے سے گاؤں میں پہنچنے کے لئے تین گلیشیرز بڑی محنت اور مشکل سے پار کرچکے ہیں۔ نیچے گاؤں کی جانب ایک مشہور گرم چشمہ واقع ہے جس کے بارے میں گاؤں کے نمبردار نے بتایا کہٗ اس گرم چشمے کے برابر پوری دنیا میں کوئی چشمہ نہیں ہوگا۔ اس میں ایساگرم پانی ہے جس میں کوئی بیمار یا مریض نہائے تو وہ بہت سے بیماریوں سے شفایاب ہوسکتا ہے گویا بیماروں کے لئے یہ چشمہ باعث شفا ہےٗ۔

یہاں سے آگے چراگاہ پھولوں اور جھاڑیوں سے پُرتھی۔ اس طرح کے نظارے کا مشاہدہ ہم نے چترال کی جانب بھی کیا تھا بلکہ اس چکنی مٹی میں اس سے بھی بہتر چمکتے پھول، جڑی بوٹیوں اور سبزے کا منظر تھا۔ ہم مسلسل اترائی سے وادی کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ہمارے ساتھ رنگدار داڑھی والا مولائی پیر (اسماعیلی پیر) دو دن سے ہمسفر تھا جو بڑے غرور اور فخرسے مسلسل اپنی سفری مشکلات کا تذکرہ کر رہا تھا اِس وجہ سے میں نے اُسی کے ساتھ کافی ہمدردی کی کیونکہ وہ اپنے مرشد سے ملنے اور اُن سے دینی وروحانی فیض حاصل کرنے کے لئے زیبک افغانستان کی طرف اِسی راستے سے آتاجاتا رہتاتھا۔

ہم دس گھنٹے طویل سفر کے بعدتھک ہارکردرکوت کے دروازے پر پہنچے تھے اس دوران پچھلی منزل سے یہاں تک آتے ہوئے پہاڑی کے قلعہ بند فصیلوں

کے حصارمیں رہے، تنگ گھاٹی کی اونچی چٹانوں کے درمیان دریا کے کنارے سے گزرتے ہوئے سرسبز وشاداب نظاروں کے آغوش میں رہے۔

درکوت پہنچنے پرراجہ نے شاندار استقبال کیا۔ راجہ یاسین شاہ عبدالرحمٰن خانٗ جوخوش وقت خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور گوپس کے غیرمہذب راجہ کے بھائی ہیںٗ 23 میل کی مسافت طے کرکے مجھ سے ملنے تشریف لاچکے تھے۔ طویل سفری تھکاوٹ کی وجہ سے میں کسی سے بھی ملنے کے قابل نہ تھا۔ دولت نے مجھے اس علاقے کے بارے میں کچھ ہلکی پھلکی معلومات بتاکر راجہ صاحب سے استدعا کی کہ صاحب ابھی گپ شب کے موڈ میں نہیں ہیں۔جس کی وجہ سے راجہ صاحب دس منٹ تک میرے ساتھ چارپائی پر تشریف رکھنے کے بعد چپ چاپ باہر چلے گئے۔ چندلمحوں کے بعد نہاکرمیں گپ شب کے لئے تیار ہوگیا۔ راجہ شاہ عبدالرحمٰن کی عمر اِس وقت ساٹھ سال کے قریب پہنچی ہے اور بڑا مدّبر اورہوشیار شخصیت کے مالک ہیں۔ راجہ صاحب نے میرے ساتھ چائے نوش کی اوربڑی احتیاط سے عزیزو کا لذیز کیک کھانے کی کوشش کی کیونکہ ان کے نچلے جبڑے میں صرف تین دانتوں کے علاوہ اوپر کے دانت گرچکے تھے۔ اس وجہ سے موصوف دانت لگوانے کشمیر جانے کی تیاری میں اپنی رعایا اوررشتہ داروں سے پیسہ اکھٹا کررہے تھے۔ میں نے سنا کہ راجہ نے مہتر چترال سے اس مد میں ایک ہزار روپے مانگاہے اُس نے کتنے پیسے اِن کو دے دیئے یہ معلوم نہ ہوسکا۔ راجہ بہت زندہ دلٗ پرمیزاح ٗشریف النفس اور ملنسار آدمی ہے جس کی وجہ سے گپ شب کا بہت مزاآیا۔ چائے اور گپ شب کے بعد ہم نہر کے کنارے پولو کے میدان کی جانب نکلے جو آدھا سرسبز اورباقی آلودہ مٹی پر مبنی تھا۔ اس کھیل میں کھلاڑیوں کی تعداد کاکوئی علم نہ ہو سکا جس کی وجہ سے کوئی مزہ نہیں آیالیکن انہوں نے حیرت انگیزکھیل کا مظاہرہ کیا۔

امریت اور بادشاہت (راجگی) جیسے نظام حکمرانی میں اصل جمہوریت تب ہوسکتی ہے جب سب کے حقوق یکساں ہو اس کے برعکس کھیل کے دوران راجہ، نمبردار اور باقیہ غریب اپنے اپنے گھوڑے لیکر سب میدان میں بغیر کسی فرق کے مزے سے خس وخاشاک اورمٹی کے آلودہ کیچڑ میں کھیل کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔

ہمارے مشاہدے میں یاسین کے پولوکی حالت بالکل خراب تھی کیونکہ اس کے لئے بھی تیاری کی ضرورت پڑتی ہے۔گرمیوں میں کھلاڑی اپنے کھیتوں میں مصروف ہوجاتے ہیں اور اُس وقت ان کے گھوڑے چراگاہ میں ہوتے ہیں۔ سردیوں میں برف کی وجہ سے کھیل نہیں سکتے۔ ان علاقوں میں دیسی موسیقی کے بغیر پولو کا تصورنہیں اس لئے تین آدمی بڑے جذبے کے ساتھ قطار میں ڈھول، تال اوربانسری شدومد سے بجارہے تھے۔ یہ عموماًراجہ کے نجی موسیقار ہیں جو موصوف کے ساتھ یاسین سے آئے تھے۔

شام کومحفل موسیقی کا اہتمام کیا گیا آگ کے بڑے سے آلاؤ کے گرد لوگ دائرے میں جم گئے اور باری باری مختلف گیت گاتے ہوئے رقص کرنے لگے جس سے ہم بہت لطف اندوز ہوئے۔ راجہ نے مودبانہ مگرمعذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ ’آپ جانتے ہیں کہ یہ دیہاتی جنگلی لوگ ہیں اس لئے خواتین ایسے مقامات پرکہنے کے باوجودبھی تماشا دیکھنے کم آتی ہیں‘۔ اُس نے یہ بات اِس خوف سے کی ہوگی کیونکہ محفل سے کچھ فاصلے پر دیواروں اورچھت سے گاؤں کی خواتین اپنے نوجوان مردوں کے رقص کو شوق سے دیکھ رہی تھیں، جن کو میں نے دیکھ لیاتھا۔ موسیقاروں اور رقص کرنے والوں کو نمبردار بڑے[جذبے اورلگن سے تالیاں بجانے اور شورشرابے پر اُبھار رہا تھا۔سب نے بڑی مہارت سے رقص کیا لیکن سب سے بہترین رقص ایک گونگھے اور بہرے آدمی نے کیاجس کیلئے سب

تماشیوں نے نعرۂ تحسین پیش کیا۔ ہرایک رقاص نے چوغہ پہن رکھا تھا اور رواج کے مطابق چوغے کے لمبے بازوں تان کر ہاتھوں اور بازوں کو پھیلا پھیلاکرگول گول گھومتے رقص کر رہے تھے۔ رقاصیوں نے بعض گانے فارسی، چترالی اور مقامی زبان بروشسکی میں گائے۔سب زبانوں کو وہ سمجھتے تھے لیکن سب سے زیادہ اپنی زبان کو ترجیح دی۔ ایک بوڑھا شخص ایک جوان کے ساتھ گھر سے اپنے مخصوص چوغے پر مقامی ٹوپی پہن کردلچسپ اور مزاحیہ گانے کے ساتھ میدان میں اترے تاکہ لوگ پیسہ اور پھول لگاسکے جس کو تماشائیوں نے بہت پسند کیا۔ ایک اور آدمی نے گانے کے ساتھ رقص کیا اس کے ساتھ ساتھ تماشائی بھی جھوم اُٹھے۔

اس محفل میں سب کچھ مشرقی اسلوب کے ساتھ ایک آواز میں نہیں تھا۔ تماشائی تالیاں بجانے کے لئے ہاتھوں کو بڑے جذبے کے ساتھ ہوامیں لہرا رہے تھے اور رقاص شدومد سے جذباتی اندازمیں ناچ رہے تھے۔ اچھلتے کودتے شور مچاتے بڑے غوغاکے ساتھ آدھی رات تک موسیقی سے سب نے لطف اٹھایا اور تھک ہارکرسونے اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

درکوت مشہورزمانہ انگریزمحقق جارج ہیورڈ کی قتل گاہ کامنظر یاد دلا رہی تھی جو 18جوالائی1870ء کو یاسین سے بدخشان جاتے ہوئےقتل ہوا۔ اُس کی جارحانہ قتل کی کہانی سرہنری نیوبولڈ(Sir Henry Newbolt)نے بیان کی ہے لیکن میں اُن کی کہانی کی تصدیق نہیں کرسکتا کیونکہ اِس میں اس واقعے سے کوئی مطابقت نظرنہیں آتی۔ کرنل لوکہرٹ، سر ویلیم لوکہرٹ اور کمانڈرانچیف (Colonel Lockhart, Sir William Lockhart and Commander-in-Chief in India,) جوکہ گلگت مشن پر معمور تھے، اس علاقے کا 1885ء اور1886ء میں دورہ کیا اورعینی شاہدین سے انٹرویوز لیکراس

واقعے کے بارے میں لکھی گئی شاعری کی تفصیلات بھی جمع کی ہیں۔

مختصراً ان کی تفصیلات کے مطابق جارج ہیورڈ کو میرولی مہتر یاسین کی جانب سے قتل کی خبردی گئی تھی۔ وہ ساری رات نیند پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے لکھتے رہے لیکن بالا آخر نیند غالب آ گئی۔ نیندکی حالت میں قاتلوں نے اُن کو گرفت میں لیکر باندھ دیا اور ٹیلے پرایک بارطلوع صبح کا نظارہ کرایا ۔ صبح سورج کی کرنیں ان کے خوبصورت بالوں کو اور بھی خوبصورت بنارہی تھیں وہ بہت وجیہہ لگ رہے تھے اسی وقت وہ نیچے اترے اور کہا کہ میں تیار ہوں۔ مشن کو فراہم کردہ عینی شاہدین کی تفصیلات کے مطابق اسی اثنا میں ان کو اچانک قتل کیا گیا

میرولی فوراًچترالیوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا جن کی قیادت، مہتر چترال امان الملک کی طرف سے محی الدین(پہلوان بہادر) بعد میں یاسین کے راجہ بن کر کافی شہرت پائی۔ پہلوان بہادر نے مفرور قاتل کے سوتیلے بھائی ہونے کے باوجود میرولی کوقتل کردیا مگر یہ کوئی جارج ہیورڈ کا بدلہ نہیں تھا۔

اِن لوگوں نے میرولی کا تعاقب کیا اور دیکھتے ہی اس پر فائر کر دیا گولی سیدھی ران میں لگی جس کی وجہ سے وہ اپنے گھوڑے سے گرگیا۔ اُس کے بھائی پہلوان بہادر نے فوراً اُن کا گلہ کاٹنے کا حکم دیا۔جوں ہی دو آدمی اس کی طرف بڑھنے لگے تو اُس نے زخمی حالت میں اپنی انگریزی پستول سے فائر کرکے دونوں کو مار دیا۔ دو دیگر جوان اس کی طرف بڑھے جن کو اپنی تلوار سے نشانہ بنایا۔ بابیکو نامی پونیالی خادم نے شیرکی طرح اپنے آقا کا دفاع کیا اور آخری دم تک اپنے راجہ کو بچانے کی کوشش کی وہ پہلوان کے لوگوں پر چیخنے لگا کہ اپنے راجے کوتم کیوں مار رہے ہو؟ بحرحال میرولی کوقتل کردیا گیالیکن اس کا جانثار خادم بابیکوزندہ رہا جو 1922ء کو گاہکوچ پونیال میں انتقال کرگیا۔

جارج ہیورڈ کا بدلہ لینے کے لئے انڈین حکومت نے کوئی خاص اقدامات نہیں کیے مگر مہترچترال نے میرولی کو ٹھکانے لگاکر جان چھڑائی تاکہ یاسین کی حکومت اور جائیداد کسی اور رشتہ دار کو دے سکیں۔ اس بات کی حقیقت کو کوئی سمجھ نہ سکا کہ مہتر امان الملک اپنے عزیز کو انگریز کے بدلے قتل کرواکر کیا حاصل کرنا چاہتا تھا؟

برطانوی محققین اور سیاحوں پر شمال مغربی جنگلی علاقوں میں کبھی کبھار حملے ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے لوگوں کے اُن حالات کے بارے میں لوگوں سے پوچھ کچھ میں تکلیف محسوس کررہا تھا لیکن ہمسفر ہنزہ کے ساتھی درکوت کے لوگوں کی زبان میں ان سے بات چیت کررہے تھے۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ دراصل جارج ہیورڈ کو اُس کے پانچ خادموں نے کھانے کے دوران پکڑ کر اشکومن وادی کی جانب نازبر (جگہ کانام) کے ٹیلے کے اوپر مل کرتلواروں سے قتل کردیا۔ جارج ہیورڈ نے حملہ آوروں کو نہ مارنے کے بدلے میں سب کچھ دینے کی استدعا کی لیکن ان ظالموں نے ایک نہ سنی اور کہاکہ آپ کا مال ویسے بھی ہمیں ہی ملنے والا ہے۔ اُس کو کمپ سے نصف میل دور وادی کے اوپر ایک چٹان کے نیچے ٹیلے پر قتل کیا گیا جونیابر(نازبر) کے بالکل شروع میں واقع ہے۔ آج کل یہ نالہ فرنگ بر یا فرنگی نالہ کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کے منشی نے گاؤں میں لوگوں سے کہا کہ صاحب مزید نالے دیکھنے گئے ہیں حالانکہ وہ قتل کے وقت موجود بھی نہیں تھے۔ ایک مہینے بعد اس کو جھوٹ کی پاداش میں قتل کردیا گیا۔

یہ روایت مجھے ڈریو(Jammu and Kashmir, by Frederic Drew.) کی کہانی سے مشابہ دکھائی دیتی ہے Sir William Lockhart اور دیگر لوگوں کی تفصیل کے برعکس جو یہ کہتے ہیں کہ موصوف کو نیند کی حالت میں قتل

کیا گیا تھا۔ یقیناً ہیورڈ کو کافی دور دیودار کے جنگل میں لے جا کر تلوار سے ہی قتل گیا گیا تھا۔ بہرحال ڈریو نے جارج ہیورڈ کے جسد خاکی کو گلگت کے قبرستان میں دفنا دیا۔

درکوت کے دیہاتیوں کے بقول اس قتل کے جرم کے تمام انتظامات بلینی (Bileni) نامی ایک چترالی شخص کے ہاتھ میں تھے اور اصل قاتل شمالی یاسین کے ایک گاؤں برکلتی کے مشیرالدین اور مجبی حاکم تھے۔ اس جرم میں سندی کے نمبردار نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ ہیورڈ کی باقیات میں سے ایک دوربین جوتا اور ایک پستول ابھی بھی یاسین میں ایک شخص کے پاس موجود ہے۔ دوربین جس آدمی کی ملکیت میں ہے وہ کہتا ہے کہ اس کو یہ دوربین ایک مولائی پیر نے دیا ہے جن کو یہ ممبئی میں آغاخان نے تحفہ دیا تھا۔ یقیناً اس علاقے میں ہر کہانی میں پیر کا تذکرہ ہر صورت ہوتا ہے ۔

میں نے استفسار کیا کہ میر ولی نے اس محقق کو کیوں قتل کروایا؟ لوگوں نے جواب دیا کہ' صاحب کا اس علاقے میں دوسرا دورہ تھا، شاید برطانیہ والے اس کی حکومت چھیننے والے ہیں' راجہ نے اسی گھبراہٹ میں اُسے قتل کروایا۔ مجھے شبہ ہے کہ میرولی نے لالچ ،طمع اور دیگر محرکات یا اپنی ظالمانہ خصوصیت کی وجہ سے وحشیت کا مظاہرہ کیا ہوگا۔ جیسا کہ Newbolt's کی شاعری میں ایک نظم میں لسپور کے پہاڑ کے بارے میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تمام چوٹیاں برف میں چھپی نظر سے اوجھل ہیں لیکن لسپور اپنی اونچائی کی وجہ سے سورج کی سب سے پہلی کرن کی چمک کا شکار ہوتا ہے۔

دیہاتی اس واقعے پر افسردہ ہیں کہتے ہیں کہ جب سے ہیورڈ کا قتل ہوا

ہے تب سے تمام مارخور اس علاقے سے غائب ہوچکے ہیں۔ بغیر مبالغہ کے ماضی میں زیادہ مارخور ہوتے تھے ان کی یہ حالت تھی کہ فصل کی کٹائی کے وقت ایک طرف وہ کھڑے گندم کی گہائی کر چکے ہوتے تھے دوسری طرف فصل کی کٹائی لیکن اب وہ سب مناظر نہیں رہے اب یہاں کوئی مارخور نہیں!

میں نے درکوت والوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ ہیورڈ کے قتل کے بعد ان کے دل میں یہ قتل سرایت کر چکا ہے۔ مشاہدہ کے مطابق یہ دیہاتی ادھا گھنٹہ بھی ایک دوسرے سے لڑے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔ ہم نے سنا کہ کچھ سال پہلے سنٹرل ایشیا سے پانچ چھ مسلمان حج کے سفر پر یہاں پہنچے وہ بھوک اور تھکن سے پریشان تھے لیکن مسلمان ہوتے ہوئے ان لوگوں نے اُن حاجیوں کی کوئی مدد نہیں کی۔ایک دفعہ ایک آدمی نے پولیٹیکل ایجنٹ کے گھوڑے کو گھاس دینے سے انکار کیا لیکن اُس کے دوسرے بھائی نے گھاس فراہم کردی بدلے میں اس کو ایک روپیہ ملا جس کی وجہ سے دونوں بھائی ایک سال تک لڑتے جھگڑتے رہے۔

جب میں درکوت میں تھا ان دنوں ایک لنگڑا آدمی بھاگ نکلا،ہم نے پوچھا کہ وہ کیوں بھاگا ہے؟ کہا گیا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں اس نے ایک چرواہے کی بیٹی کو اغوا کیا ہے ۔لڑکی کا والد جو اس علاقے کا نہیں تھا مغوی کے بھائی کے پاس گیا اور واقعہ پیش کیا۔ بحث ومباحثے کے بعد یاسین کے اغواکار کے بھائی نے ایک بھیڑ مہمان کے لئے ذبح کرکے کھانے میں بڑی آؤ بھگت کی جس پر لڑکی کا باپ بہت خوش ہوا اس امید سے کہ اس کے بدلے کچھ اور بھی معاوضہ ملے گا۔ مہمان نے مجسم گوشت کی درکوتی روایت کا تقاضا کیا جس پر میزبان نے چاقو اس کے دل میں گھونپ کر مارڈالا ۔کسی نے اس واقعے پر کوئی معذرت نہیں کی! قاتل مزے سے چھوٹ گیا اور اس کے بھائی نے اس لڑکی سے شادی کرلی۔

درکوت کے نزدیک ایک زبردست چراگاہ پائی جاتی ہے لیکن یہاں کی بھیڑ اور بکریاں دور جانے سے کترا کر دلدل والی گھاس کھاتی ہیں جو ان کے لئے صحت بخش نہیں بلکہ سستی کی انتہا ہے۔شاید یہ سستی اور اکتاہٹ چترال سے درکوت منتقل ہوئی ہے۔

ہمارے قافلے میں آج کل بچھڑے کی خرید اور ذبح کا معاملہ شدت اختیار کر چکا ہے کشمیری بہت مضطرب اور مسلمانوں کے لئے ذبح کا کوئی مسئلہ نہیں لیکن ہندو کے لئے یہ عقیدے کا معاملہ ہے۔ مجھے ان دونوں صورتوں میں کوئی فائدہ ہونے والا نہیں کیونکہ ہمارے باورچی عزیزو کے پاس بچھڑے کا گوشت پکانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ آخرکار میرے حصے کا گوشت گاؤں کے کتے کھائیں گے!! واہ کیا مزہ دار اور چٹ پٹا گوشت کاش یہ اچھا پکایا گیا ہوتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب نمبر 5
یاسین پائین

چترال سے درّہ درکوت پار کر کے یاسین پہنچنے کے لئے ہم نیچے کی طرف روانہ ہوئے جہاں ریاست یاسین کا دارالحکومت اور قلعہ ہے وہاں سے ایک طرف وادی تھوئی جا کر واپس ایک نئے گمنام راستے سے درکوت جبکہ دوسری طرف درکوت سے نئے راستے اور نئی امید کے ساتھ وادی اشکومن پہنچنا ہے تاکہ ہم کم وبیش ریاستی علاقوں کو دیکھ سکیں۔ موسم سہانا ہو تو سفر کا فاصلہ اتنا طویل نہیں ہوتا۔یقیناً بزرگ راجے نے ہماری بہت قدر افزائی کی اور لوگوں کا رویہ بھی دوستانہ تھا۔ تھوڑے آرام کے بعد بہت شاندار زرخیز میدانوں سے ہم یاسین کی طرف روانہ ہوئے۔ یقیناً ریاست میں خوشحالی تھی محدود وسائل اور سبزہ زار غذائی اجناس کی قلت کے باوجود احتیاط اور عقلمندی سے غذائی ضروریات کو نہ صرف پورا کیا جاتا ہے بلکہ برآمد بھی کیا جاتا ہے۔ یاسین میں پانی کی بہت فراوانی ہے۔ سطح مرتفع بہت بلند ہونے کے ساتھ گرمائی موسمی حالات بھی نسبتاً مختصر ہوتے ہیں جس کی وجہ سے پورے سال میں صرف ایک ہی فصل بوئی جاسکتی ہے گندم اور جو مشہور فصلیں ہیں۔

چھاؤں کے سبب فصل متاثر ہونے کے خوف سے لوگ پھلدار درخت کھیتوں میں نہیں لگاتے ہیں اس کے باوجود اخروٹ' سیب' خوبانی اور شہتوت کے کافی درخت نظر آرہے تھے جو ایجنسی کی دوسری ریاستوں کی نسبت کافی کم ہیں۔ یاسین کے کاشتکار بہت محنتی اور اچھے زمیندار لگتے ہیں لیکن یہ ہر تین سال بعد اپنے کھیتوں میں گوبر کی کھاد ڈالتے ہیں کیونکہ چراگاہ کی کمی کی وجہ سے ان کے

پاس اتنے مال مویشی نہیں کہ ہرسال دیسی کھاد کھیتوں کوفراہم کرسکے۔

قافلے کی روانگی کے ساتھ میں سوچ رہاتھا کہ یہ ریاست بہت خوشحال اور آرام دہ ہے۔ پانی کی فروانی کے لئے ہر گاؤں کا اپنا گلیشیرہے۔ میدان اور ذرخیز زمین ہونے کی وجہ سے آبپاشی بھی آسانی سے ہوسکتی ہے۔ ان کے گھر بہت عمدہ اور باغات اگرچہ چھوٹے ہیں لیکن بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ کھیت لہلہارہے ہیں اور ساتھ خمیر کی خوبصورت روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔شائشہ اورخوش مزاج لوگوں کی پرمسرت اورشادماں ریاست ہے۔

ہم مہترمیر ولی کے بوسیدہ اور خستہ حال قلعے سے گزرے جس کے تمام نقشے اور دوسری دستاویزات گورنر کے پردادا مہترگوہر امان جو کہ ایک بہادر' طاقتور' قاتل مگر مردم بیزارشخص تھا' کی یادیں تازہ کررہی تھیں۔ ہمارے محافظ بڑے سست اور کاہل ہیں وہ اس ریاست کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتے کہ برٹش کے آنے سے وہ یہاں سے غائب ہوگئے۔ ایک محافظ نے ہماری سوچ میں جان ڈالتے ہوئے قلعہ کے بارے میں کچھ معلومات دی اور اس چٹان کے بارے میں بھی اگاہ کیا جہاں پہلے 'صاحب' یا ان کے گھوڑے اِستادَہ رہا کرتے تھے۔

دریائے یاسین کی کشادگی اتنی زیادہ تھی کہ ایک میل کے نزدیک پوری وادی میں پھیلاہواتھا۔ خشک کناروں پر گرم بھوری چٹانیں شکستہ حالت میں پڑی تھیں جو عموماً نہریں بناتے ہوئے توڑی جاتی ہے۔ تھوڑآگے بڑھ کر یاسین کی کشادگی سمٹتی گئی۔ دریاکے دائیں جانب ایک معلق پُل پارکرکے ہم بنجر اور دشت وصحرا 'دشت طاؤس' کے پُرفریب نظاروں میں پہنچے۔

پہنچتے ہی محافظوں سے کہا؛'دولت سے کہو کہ کہیں سے ایک بندوق لائے تاکہ ہم طاؤس کا شکارکھیل سکیں'۔ انہوں نے حیرت سے جواب دیا؛ کیا کہا آپ

نے ؟ کہاں! طاؤس اورکیسے؟ کیوں نہیں' میں نے کہا'۔ اور کہاں !اِسی میدان میں جہاں ہم کھڑے ہیں۔ کیا ہم ہندوہیں کہ ان کا شکار بھی نہ کریں؟ میں نے ان کو ٹوکا۔ او ہو!' نہیں صاحب !یہ بات نہیں ۔یہاں کوئی طاؤس نہیں اور نہ ہی پہلے تھے ۔۔۔' انہوں نے برجستہ کہا۔او! تو پھر یہ نام کیسے رائج ہوا یہ فریب کاری بھی ہوسکتی ہے؟

کئی سال پہلے یہاں کاشت کاری کی جاتی رہی تھی جس کے آثار شکستہ کوہل کی باقیات میں واضح نظر آرہے ہیں۔موجودہ راجا بھی اسی کوہل کی تعمیر نو کی کوششوں میں لگے ہیں تاکہ دوبارہ ان کھیتوں میں کاشت اور باغوں میں درخت لگائیں یا اگائے جاسکیں۔ اس دلچسپ کہانی سے بھی میں اس جگہ کے نام اور طاؤس میں مشابہت تلاش نہ کرسکا۔

بحرحال اس نام کے لئے پہلا نکتہ نظر یوں ہے؛ مور چمک دمک شان و شوکت اور دولت وجلال کی نشانی ہے۔ ایران میں طاؤس کو شان وشوکت اورتخت تاج کی تمثیل کے طور دیکھا جاتاہے۔ اگرچہ یہ زمین اب بنجر صحرا کی مانند ہے لیکن پھربھی سونے کی طرح چمکدار اور مور کے پروں کی طرح جھلملاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ نام کے پس منظر کے لئے شاعرانہ تشریح سے کسی کو قائل نہیں کیا جاسکتاہے۔

میں نے دوسرے نکتہ نظر کوکسی حد تک اس نام سے موافق پایاجو کچھ یوں تھا۔ سالوں پہلے ایک زمیندار کا راجا کی بیٹی سے پیار ہوگیا لڑکی بھی اُس کو چاہتی تھی لیکن ان کی محبت راجہ کو پسند نہ تھی۔ تاہم راجہ نے لڑکے کے لئے شرط لگا رکھی تھی کہ' اگر وہ طاؤس تک بنجر اراضیات کوکوہل نکال کر پانی پہنچا دے تو لڑکی کا رشتہ اُس سے کرایا جائے گا'۔ نوجوان چل پڑا بڑی محنت ومہارت سے پہاڑ کھود کرکوہل

تیار کر کے پانی پہنچا کر اپنی تلوار کو ہل کے دائیں طرف گھاڑ دیا اور واپس آ کر کہنے لگے 'بادشاہ سلامت (راجہ حاحب) ! وہ دیکھو کوہل سے آبشار کی طرح پانی اور ساتھ تلوار مور کے پروں کی طرح چمک رہی ہے۔ لڑکا مشقت بھری جدوجہد سے لڑکی پانے میں کامیاب ہو گیا۔ پیار ومحبت کی یہ کہانی میرے نزدیک ایک افسانہ ہو سکتی ہے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہ میدان دوبارہ قابل کاشت ہوسکتا ہے لیکن طاؤس کی دم کی طرح چمکنا مشکل ہے۔ بنجر داس (اراضی) کے درمیان پرانے قلعے کے آثار اب تک نظر آرہے ہیں جس کو چین والوں نے اپنے قبضے کے دوران بنایا تھا ہوسکتا ہے اِس کی آباد کاری کے بعد وہ فارم ہاؤس بن جائے!!

اسی دوران گاؤں کے قریب راجا کا بیٹا ملا، وہ گلگت سکاؤٹ میں صوبیدار تھا، ہمیں ریسٹ ہاؤس لے گیا۔ پیچھے پہاڑی کے اوپر کافی بلندی پر ایک تاریخی یادگار دکھائی دے رہی تھی جو ملکہ برطانیہ کی یاد میں بنائی گئی تھی، دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ بہت محترم خاتون ہیں جن کے لئے ان قبائل میں بھی احترام ہے بحرحال اُن کی صحت یابی کے بعد ضرور ان سے بات ہوگی۔

میری ملاقات گورنر سے قلعے کے پاس ہوئی جہاں خوبانی کھاتے ہوئے اتنی گپ شب کی کہ جلدی واپسی ممکن نہ تھی۔ ہمارے پیچھے راجہ کا بیٹا ملیریا کی وجہ سے اپنے بستر پرسویا ہوا تھا۔ راجا نے شکایتاً کہا کہ ڈاکٹر کچھ اور کہتا ہے لیکن یہ لڑکا صرف جُو کا پانی پی رہا ہے۔ اس کی ماں، بہن اور بیوی ہر وہ چیز اس کو کھانے دیتی ہیں جو یہ مانگتا ہے مثلاً کچے خوبانی، چھوٹے گوشت کا روسٹ وغیرہ۔ دراصل راجا مجھ سے ان کی شکایت کر رہا تھا کہ یہ لوگ اپنے باپ کا بالکل نہیں سنتے ہیں۔ دراصل یہ مشرقی بے قوفانہ روایتی انس وشفقت کی بدانتظامی کی داستان تھی، جو عام

سی بات ہے۔ مریض کوئی بھی چیز کھانے سے رکتا نہیں اور خواتین مریض کی ناراضگی مول لئے بغیر سب کچھ کھانے کے لئے فراہم کر دیتی ہیں۔

شام کے کھانے پر راجا بھی تشریف لا چکے تھے۔ کھانے میں شرکت سے وہ کافی پریشان دکھائی دے رہے تھے کیونکہ ان کے صرف تین دانت کام کر رہے تھے مگر کھانا بہت نرم بنایا گیا تھا تا کہ بغیر دانت والے بھی کھا سکے۔ کھانے کے شروع میں ہی موصوف نے معذرت کی اور کہا کہ' آپ لوگ بُرا نہ منائیں میرے دانت نہیں اس لئے ہاتھ کی انگلیوں سے ہی گزارا کرونگا'۔ راجا نے ہاتھ دھوکر آستینیں چڑھائیں اور چھوٹے چھوٹے نفیس نوالے بنا کر آوازیں نکالتے ہوئے کھانے لگے۔ میں اسی مشرقی فطری کھانے کے اندازکو پسند کرتا ہوں۔ مغربی لوگ کاٹون کی طرح چمچ، چاقو اور کانٹے سے اس طرح کھانے پر لگ جاتے ہیں کہ شروعات میں ہی تیز دستی میں ٹکڑے اُچھل کود کر ٹیبل پر گرنے لگتے ہیں۔ میرے پاس بدقسمتی سے کوئی شراب نہ تھی کہ مہمان کو دے سکوں ہوسکتا ہے اُنہوں نے برا منایا ہوگا جو پینے سے زیادہ محبت کرتے ہیں! مجھے اُس کے کھانے کا بہت مزا آیا کیونکہ میں ان لوگوں سے ویسے بھی نفرت کرتا ہوں جو کھانے کے ساتھ کھلونوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کچھ دیر کے لئے چاندنی میں بیٹھ کر گپ شب کرنے لگے۔

صاحب !مجھے پکارتے ہوئے راجا نے کہا، 'میں اپنے کھانوں کو پسند کرتا ہوں اور لوگ مجھے 'روٹی بہادر' کہتے ہیں اور اسی بات پر دوسرے راجے مجھ پر ہنستے ہیں لیکن جب میں کشمیر سے اپنے نئے دانت لگوا کر آؤنگا تو انشاء اللہ چھوٹا بڑا سب گوشت کھا سکوں گا کچھ عرصے سے میں صرف چاول اور کری پر گزارہ کر رہا ہوں'۔ مچھروں کے کاٹنے کی وجہ سے ہمیں گپ شب منقطع کرنا پڑی۔

اگلے دن تصویریں بنانے کے دوران انہوں نے مجھے پرانے ڈوری قلعے کی باقیات دکھائیں جس کا صرف ایک برج باقی رہا تھا۔ ماضی میں وہاں ایک چھوٹا شاندار درباری کمرہ تھا جس میں کشمیری آرٹ سے مزین نقوش' نقش ونگار پر مشتمل حجرے کے ساتھ دوستون ہیں۔ کشمیریوں نے1863ء میں یاسین پر قبضے کے وقت اِسی کمرے میں لوگوں کو چابک مارکرقتل کیا تھا۔ کمرے میں آٹھ کونے والا بہت خوبصورت روشندان بنایا گیا تھا جہاں سے باہر کا خوبصورت نظارہ ہوسکتا تھا۔ بعدازاں صفت بہادر نے اس قلعے کومسمارکرکے اس کی جگہ محل بنانے کی نیت ٹھانی تھی لیکن وہ اس کی تعمیرسے پہلے ہی وفات پا گئے۔

یاسین میں گندم کی پیداوار بہت اچھی ہے اس لئے گلگت ایجنسی کے سرکاری خریدار ان سے سالانہ تین ہزار من گندم خریدتے ہیں۔ لوگ بڑی خوشی اور توکل سے سب بیچنا چاہتے ہیں لیکن حکومت نے ان کے لئے مخصوص حدمقرر کی ہے تاکہ سردیوں میں یہاں کے لوگ بھی کسی تکلیف کا شکارہوئے بغیراپنے جینے کا انتظام کرسکیں۔

گورنر اپنی رعایاسے سالانہ 1100من غلّہ لیتا ہے۔ یہ دیکھنے میں بڑی مقدارہے لیکن ان کے لئے بہت ناکافی ہوتی ہے۔ اس ریاست کے دستور میں سب خادموں کو کھلانا راجہ کی ذمہ داری ہے جس کے ساتھ 150لوگ جن میں اُس کے بیٹے' وزیر اورلاتعداد ماتحت مفت خوروں کا اژدھام شامل ہے۔ اس ماندہ روایت کو دوبارہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے' جس میں بن بلائے مہمانوں کا آنا، وغیرہ شامل ہے۔ یقیناً اس قسم کی ضروریات کو پوراکرنے کیلئے راجا کے پاس محدود وسائل ہوتے ہیں اس لئے اُن سے بھی لگان(ٹیکس) لینے کی ضرورت ہے۔ خاص کر جب پولوشروع ہوتا ہے توکسی بھی وقت صبح ہو یاشام لوگوں کے غول کے

غول آتے ہیں جو تماشا دیکھنے کے ساتھ کھانے پینے اور سونے کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔ کچھ دفتری لوگ اپنے شہزادے وغیرہ سے ملنے آتے ہیں اور وہ بھی کھانے پینے کاتقاضہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے راجا کے بیٹوں کو جو باپ کے زیرکفالت ہیں دوستوں اور احباب کی خاطر مدارت میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔جب کوئی بیٹوں سے ملنے آتا ہے تو ان کو بھی چائے پانی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ہمیشہ یہ لوگ راجا کی طرف سے مفت کھانے پینے کا سوچتے ہیں۔ جاگیرداری کے قدیم تصورات اب بھی باقی ہیں جن کو بدلنے کے بارے میں سوچنا مشکل کام ہے۔ 'ہاتھ میں کچھ نہیں کیا لاؤں' کے خوش آمدی الفاظ پرعمل درآمد ان پہاڑی ریاستوں میں بہت دقیق مسئلہ ہے۔حکمران لوگ مہمانوں سے بھی کچھ نہ کچھ کی اُمید رکھتے ہیں یہاں تک کہ چند خشک میوہ ہی کیوں نہ سہی لیکن جب اُن کی طرف سے کچھ دینے کی بات آتی ہے تو ان پر ناگوارگزرتی ہے۔ اکثر حکمران کنجوس' بخیل' حریص اورکم دست ہوتے ہیں تعجب ہے کہ اس معاملے میں یورپ کے اکثر لوگ بھی شامل ہیں۔کسی قریبی رشتہ دار کو کچھ ملنے پر بھی وہ حسد کرنے لگتے ہیں۔عموماً شرفاء اور اعلیٰ خاندان کے لوگ اپنا ہی خیال رکھتے ہیں لیکن یاسین کے دوست اس معاملے میں بڑے فراخ دل ہیں ان کو اس بات سے کوئی سروکارنہیں۔ راجا کے علیل بیٹے کی شادی ہنزہ کے میر کی بیٹی سے ہوئی ہے اب تک کافی تعداد میں اُن کے مہمان یہاں موجود ہیں۔ انہوں نے کھانے پینے کے حوالے سے یاسین کے لوگوں کی انتظامی معاملات کی بڑی شکایت کی ہے۔ مجھے اس بات پر کوئی حیرت نہیں کہ راجا بڑے خوش اخلاق اور کفایت شعار بھی ہیں۔

یاسین کی زرخیززمینوں اور کشادہ فصل کے باوجود یہاں کے باسی کافی سست اور کاہل ہیں ان کو ہم ہنزہ اور پونیال کے لوگوں کے بعدتقریباً اچھے درجے

کی نسل سمجھتے ہیں جو بندروں کے ہجوم کی طرح پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں۔ یہ اپنے کھانوں کو بہت پسند کرتے ہیں اس لئے دن میں موقع ملے تو چھے سے سات مرتبہ کھاتے ہیں۔ یہ کثرت سے دودھ اور نمک کی چائے پیتے ہیں۔ دوسرے قبائل کی طرح ان کو بھی صرف موسم سرما میں گوشت کھانے کو ملتا ہے۔مخصوص جانور نسالو کے دنوں میں ذبح کر کے سردیوں کے لئے رکھ لیتے ہیں اور سردیوں میں صرف اِسی سوکھے گوشت پر گزارہ کرکے کام کرتے ہیں۔ اچھی پیداوار کے باوجود اس ریاست کا محل وقوع کاروبار کے مواقع کے لئے مناسب نہیں۔ جنس کے بدلے جنس کا نظام رائج ہے جس کی وجہ سے کاشت کاروں کو کافی نقصان بھی اٹھانا پڑ رہاہے۔

یاسین میں مجھے ایک پرانے دکاندار دوست شیر غازی ملے جو چترالی زبان بولتے ہیں ان سے پہلے ترکستان میں ملاقات ہوئی تھی انہوں نے بڑی خاطر مدارت کی۔ وہ ترکی انداز میں بڑے مہمان نواز ثابت ہوئے۔ مجھے اپنی کاروباری ر اہ گزاریاں سنائی وہ نقد پیسے کی کمی کی وجہ سے پریشان نظر آرہے تھے۔ ان کو چائے اور کپڑے لینے کے لئے نقد پیسے دینے پڑتے ہیں جبکہ یہ لوگ صرف غلہ کے بدلے ہی سامان لیتے ہیں جو پہلے ہی ان کے پاس ایک ہزار من سے زیادہ پڑا ہے۔ پانچ سوگدھوں پر غلہ گلگت پہنچاکر منافع کمانا بہت مشکل کام ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ اگرچہ لوگوں کے پاس غلہ موجود ہے لیکن نقدی نہ ہونے کی وجہ سے چائے، صابن، نمک اور مسالہ جات نہیں خرید سکتے ہیں۔جنس کے بدلے مال کے بارے میں کافی گفتگو ہوئی لیکن اس کاروبار کے لئے یہ موزوں طریقہ نہیں اس میں کھاتہ پر عملداری مشکل ہے۔

واپسی کے موقع پر راجہ شاہ عبدالرحمن سے ملاقات بھی نہ ہوسکی کیونکہ وہ

نئے دانت لگوانے سری نگر جاچکے تھے۔کشمیری انتظامیہ نے ان کو سرکاری مہمان کا درجہ دے رکھا تھا جس سے وہ بہت لطف اندوز ہوئے ہونگے۔ راجا نئے دانت لگواکر بہت خوش تھے لیکن واپسی پر برزل ٹاپ پار کرتے ہوئے ان کے پیٹ میں جلن شروع ہوئی۔ راجا نے جلن کو نظر انداز کیا جس کی وجہ سے پیچش لگ گئی۔گلگت پہنچ کر راجا اپنے دوستوں خاص کر راجا پونیال کے ساتھ طعام وشراب کی محفل سجاتے رہے جس سے ایجنسی کے سرجنوں کو ان کے بیماری کا علم نہ ہوسکا۔ انہی دنوں میں (یاسین میں) راجا کا علیل بیٹا پرہیز نہ کرنے کی وجہ سے ملیریا کے مرض سے انتقال کرگیا لیکن لوگوں نے راجا کی چھٹیوں کو خراب نہ کرنے کی وجہ سے اس اہم خبر کو مخفی رکھا۔ تاہم گاہکوچ پہنچنے پر ایک کشمیری پنڈٹ نے اپنی بدخواہی اور خبیث خاصیت کی وجہ سے بے موقع اُن کے بیٹے کی موت کی خبر دے کر تعزیت کی۔ اِس بری خبر سے راجا کو بڑا دھچکہ لگا اور وہ کمزور ہوتے گئے یہاں تک کہ 26 ستمبر 1933ء کو گاہکوچ میں وفات پاگئے۔(ان کی جگہ میر بازخان بروش کو یاسین کا گورنر مقرر کیا گیا جو بہت اچھے اور قابل انسان تھے)۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں رکھے وہ قراقرم و ہندوکش کے پہاڑی علاقوں میں واحد بہت اچھے نیک اور بزرگ انسان تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب نمبر 6
یاسین کے بالائی علاقے

یاسین کے گورنر بھی دوسرے شاہی امراء کی طرح بہت ساری بیویاں رکھتا ہے جن کے کئی بیٹے ہیں اُن میں سے بیشتر ناجائز(not lawful) بھی ہیں ۔ جب ہم یاسین سے تھوئی کے راستے دوبارہ درکوت جارہے تھے تو راجہ نے ایک اور بیٹے کو ہمارے ساتھ روانہ کیا۔ یہ راجا خاندان کا محمدنادرخان تھا جو ہمیشہ گھوڑ سوار ہونے کی وجہ سے پیدل چلنے میں عارمحسوس کرتاہے۔ پہاڑی دشوارگزار راستوں میں جہاں گھوڑے نہیں چل سکتے تھے اس کو بڑی مصیبت اور تکلیف ہوتی ہے۔ اُس نے سنہرے رنگ کے بھورے مخمل کا کوٹ' ڈھیلے ڈھالے لینن کی شلوار جس پر چم چم نیلے رنگت کی پٹیاں لگی تھیں کے ساتھ دیسی موزے پہن رکھے تھے۔ وہ بہت اچھا خوشنما' خوش اخلاس اوراچھی طبیعت کا مالک تھا جسے میں کہیں بھی پہنچان سکتا ہوں۔

ہمارے سفرکی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس علاقے کی زبان وہی ہے جو ہنزہ میں بولی جاتی ہے لیکن راجہ صاحب چترالی بولتا ہے جو اس کی مادری زبان ہے۔ سَندِی اورقرب وجوار میں بھی بروشسکی بولی جاتی ہے۔

یاسین کے بنجر طاؤس سے گزرکر ہم وادی تھوئی میں داخل ہوئے جہاں سے چترال کیلئے عمومی راستہ ہے۔ پہلے مرحلے میں ہمارے ساتھ دوگھوڑیاں تھیں جن کے گردن کے گرد گنڈا ڈال دیاگیاتھا تاکہ وہ کسی ناخوشگوار واقعے سے بچ سکے لیکن ان میں کوئی بھی کسی حادثے کا باعث نہیں بنی۔ ہم بہت سست رفتاری کی وجہ سے چلنے کا اپناجذبہ کھوچکے تھے۔ یاسین کے قُلی باربرداری کے مختلف مشورے

دیتے جا رہے تھے جیسا کہ وہ سامن مچھلی کی طرح آگے نکلنے والے ہیں حالانکہ یہ کام ہمارے ہنزہ کے ساتھیوں کا تھا کہ کس طرح بوجھ کا انتظام کرناہے۔ ہمارے قافلے والوں کے پاس بہت پرانی رسیاں ہیں جوکسی بھی جھٹکے سے ٹوٹ سکتی ہیں۔

میرے دلیر ساتھی اپنے کام کے ساتھ دوسروں کی بھی مدد کرتے تھے جبکہ وہ لوگ نہ اُن سے کچھ سیکھتے تھے نہ ہی خود کچھ کرسکتے تھے۔ بڑے تلخ' گالم گلوچ اور بدعاؤں کے ساتھ آخرکارتھوئی کے پہلے گاؤں ہرپ پہنچے جہاں ایک خوبصورت چھوٹے باغ میں کیمپ کا انتظام کیاگیا تھا۔تھوئی میں جَو کی فصل کی کٹائی کے ساتھ بہت بدشگون موسمی بارش بھی ہورہی تھی۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ جو کی فصل جب بھی کاٹنے کا وقت آتاہے بارش ہوتی ہے۔دوسری طرف دیسی کھاد کی کمی کی وجہ سے فصلی پیداواربھی کم ہوتی ہے ۔ ان کی شکایات کا ہمارے پاس نہ کوئی حل تھا اور نہ ہی کچھ کرسکتے تھے؟ پھر بھی ہم نے اُن سے بڑی ہمدردی کی۔ یہاں کی خواتین ہنزہ اور پونیال کی طرح کھیتوں میں کام نہیں کرتی۔ وہ گھریلو کام کے ساتھ بہت محدودسبزیاں اگاتی ہیں۔ ہم نے مشکل سے کچھ سبزیاں خرید لیں۔

حرب سے چارمیل آگے چل کر ہم شمال کی جانب ایک غیرآباد وادی دسپرمیں داخل ہوگئے۔ ہم بڑی جان فشانی اورمحنت سے ڈھلوان علاقے سے اوپر چڑھتے چڑھتے بہت تنگ گھاٹی سے گزرے جہاں برفانی تودوں کی باقیات سے بڑی بڑی ریتیلی اورپتھریلی سنگلاخ چٹانیں بنی ہیں۔قلیل ہموار زمین کے علاوہ پتھروں اور سنگلاخ چٹانوں کے ایسے بڑے بڑے ڈھیر ہیں جن کے قریب پانی کثرت سے موجود ہے جس کی وجہ سے درخت اور جھاڑیاں اُگی ہیں اور کچھ کھیت بھی نظرآتے ہیں۔ پہلی دفعہ میں نے بے مثال گنے درخت دیکھے جن کے دامن میں پناہ لی جاسکتی ہے۔چرواہوں کے انوکھے مخروطی چھپرگھر اورموسمی کاشت کے

رہائشی گھر بھی بنائے گئے ہیں۔ کئی مقامات پر قدیم کھیتوں کے بنجر آثار دیکھے جو برفانی تودوں کی وجہ سے بنجر پڑ چکے تھے جن کو دیکھ کر ہمیں سمجھ آئی کہ یہاں لوگ مستقل رہائش پذیر کیوں نہیں ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ خراب راستے کی وجہ سے باورچی عزیزہ کو بھی بڑی تکلیف کا سامنا ہے جو ایسے دشوار راستے کے چلنے کا کم تجربہ رکھتا ہے۔ وادی کے بالکل منبع کے قریب آگے بہت زیادہ نالے نکلتے ہیں اُسی مقام پر گلیشیر کے نیچے کیمپ لگایا جہاں چھوٹا سا میدان بنا ہوا تھا جس کے مخالف اطراف میں دیوہیکل برفانی گلیشیر منہ پر ہی پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کچھ جھونپڑیاں بنی ہے جو ہمارے لئے گرج چمک کے ساتھ بارش میں نعمت ثابت ہوئی۔ گندگی' غلاظت اور پسو کے علاوہ پرانی ہڈیوں کے اوپر توشک کے کیڑے بھرے پڑے تھے اس کے باوجود ہمارے قلیوں کے لئے خیرمقدمی جگہ تھی۔ اگلے دن ہم غمو بر پاس کی طرف نکلے ۔ غمو بر مقامی نام ہے جس کے معنی گلیشیر کی وادی ہے مگر بدقسمتی سے یہ بہت تنگ جگہ ہے جہاں گلیشیر ہی گلیشیر ہے۔ خاص وادی آگے مغرب کی طرف نکلتی ہے جہاں برف ہی برف اور دور دور تک یخبستہ گلیشیر نظر آتے ہیں۔ ہم یہاں سے مشرق کی جانب پانچ گھنٹوں میں گلیشیر کے کنارے پر پہنچے جہاں ہمیں پہنچنا تھا۔ دولت نے عزیزو کی کافی حوصلہ افزائی کی کیونکہ وہ ایک سلیٹی ترچھی چٹان پر لٹکتے ہوئے خاموش مایوس اور تھکاوٹ سے ایک جوان مارخور کی طرح اکیلے اوپر چڑھ رہا تھا۔ تھکاوت اور تندخوئی کی وجہ سے عزیزہ نے دولت کی ان باتوں کو کوئی خاص اہمیت دی نہ ہی ان کو پسند کیا۔

ہمارے دائیں جانب عظیم گلیشیر ہے جہاں سے اوپر کی جانب اونچائی سے گردوپیش اور نیچے درکوت دریا کے ساتھ وسیع جنگل اور سرسبز کھیتوں کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک بڑی چڑھائی کے بعد ہم بہت تیزی کے ساتھ خوشی سے نیچے

جھومتے چلے جارہے تھے ۔کثیر جنگلی بنفشی پھول اور دیگر خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوکر ہم دوبارہ تازہ دم ہوئے تھے۔ برف کی نرم گوشوں' تودوں کے ڈھیروں اور سفر کی تکلیف سے بہت تھکاوٹ کے بعد ادھر اُدھر دیکھ کر بیدوں کے سائے میں درکوت کے عظیم گلیشیر کے بالکل ناک کے نیچے دریا سے چند یارڈ اوپر رات گزارنے کے لئے کیمپ لگا دیا۔ میرے ٹینٹ کے سامنے مرغولہ سی جگہ تھی جہاں زیادہ سرسبز کھاس کے ساتھ جنگلی پھول مہک رہے تھے۔ ہر سمت جنگلی گلابی رنگ کے پھولوں کی بہار تھی جس کو میں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ لمبا سفر اور قلیوں کی تھکاوٹ کے باوجود دوسرے دن 23 جولائی 1933ء کو ہم درکوت پہنچ گئے۔ راستہ ریشہ دار ہونے کی وجہ سے بہت تنگ تھا۔ گلیشیر کے کنارے دو میل تک صرف چھے انچ تنگ پتھروں کے ڈھیر کی تکلیف اور اکثر لوگوں کے بیمار ہونے کی وجہ سے ہماری رفتار بہت سست ہوچکی تھی۔ درکوت گلیشیر کو تین گنا سے زیادہ مشاہدہ کرتے ہوئے پہاڑ کی سوئی جیسی چوٹیوں' برف اور یخبستہ گلیشیرز کی اونچائی سے اترائی میں نیچے درکوت کے خوبصورت کھیت' درخت اور نہریں نظر آتی تھیں۔ خوش باش ملنسار دوستوں کے ساتھ بہت سرد اور پیچیدہ گلیشیر کو انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ طے کر کے اپنی منزل تک پہنچے۔

درکوت میں کچھ دن قیام کے بعد ریاست کے دوسرے دروازے وادی اشکومن کی طرف نیوبر کی چڑھائی سے نکلے جو درکوت کی آبیاری کا منبع ہے۔ ایک بار پھر اِس طرف سے درکوت کے خوبصورت نظاروں اور کھیتوں کا مشاہدہ کیا جسے لوگوں نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ لوگوں نے قُلنگ جو ایک خشک تنگ گھاٹی ہے' کی بہت شکایت کی جہاں سے سخت بارشوں میں سیلاب آکر نیچے سرسبز کھیتوں کو خراب کرتا رہتا ہے۔ انہوں نے ایک اور بڑی جگہ دکھائی جہاں سے سیلاب آتا تھا

جس کی وجہ سے کھیت پتھروں کا ڈھیر بن گئے ہیں۔

وادی کی چوٹی پر پہنچتے ہی ہم نے خوبصورت گاؤں' کھیت اور گھر دیکھے جہاں ایک خوشنما مگر گندے کپڑوں میں ملبوس بوڑھے شخص نے چائے پلاکر خوش آمدید کہا۔سفری تکلیف سے میں بہت تھکا ہواتھا۔ گرمیوں میں یاسین کے دیہاتی اس جگہ مال مویشی لیکر آتے ہیں اس لئے رہائشی جھونپڑیاں درختوں کی شاخون سے بنائی گئی ہیں جن کے اندر صرف کھانا پکاتے ہیں۔ میں بڑی ہوشیاری سے کنارے کی چارپائی پر بیٹھ گیا مجھے یقین تھا کہ پسو یہاں بھی بہت ہونگے مگر امید ہے کہ یہ کیڑے مکوڑے باہر نہیں آئینگے۔ یہاں بہت سارے بچے مختصر پاجامے یا بالکل ننگے موجود ہیں۔ موسم بڑا سہانا اور سورج اپنی آب وتاب سے چمک رہا ہے جس کی وجہ سے شاید ان بچوں نے کچھ نہیں پہن رکھا ہے۔ میں نے ان خوش مزاج لوگوں کی کچھ تصویریں بھی بنائیں لیکن سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ جنگلی وحشی لوگ تصویر بنانے سے اتنے خوش کیوں ہوتے ہیں؟ یہ لوگ اتنے خوش ہیں جیسے کہ ہم نے ان کو بہت کچھ دیا ہے۔ میں تصویریں صاف کرکے ان کو بھیجنے کا وعدہ تو کرسکتا ہو لیکن کیا پتایہ واعدہ پورا ہو یا نہ ہو کیونکہ یہ دنیا میرے اور ان قدیم باشندوں کے لئے کامل نہیں فانی ہے۔ بہرحال یہ لوگ تصویریں ملنے کی امید سے بڑے خوش ہیں۔

ہم نے اس علاقے میں بہت شاندار چراگاہ دیکھی حیرت کی بات ہے کہ یاسین والوں کے لئے سردیوں میں چراگاہ نہیں اس لئے ان کے پاس گھی کی کمی رہتی ہے۔ یاسین کے راجاکے لئے یہ معاملہ بہت تکلیف دہ ہے کیونکہ کھو اور غذر کی راجگی اس کے بھائی کے پاس ہے جہاں ان چیزوں کی کثرت ہے۔ اُس کے پاس گھی بہت ہونے کے باوجود کبھی بھی اپنے یاسین کے بھائی کونہیں بھیجتے

ہیں۔ راجا یاسین ایک پوری چراگاہ اس معاملے کے لئے گوپس کے بھائی سے لینا چاہتا تھا لیکن وہ نہ اس تجویز کو سنتا ہے نہ ہی گھی بھیجتا ہے۔ دونوں بوڑھے راجوں کے درمیان گھی پر ہونے والے اس جھگڑے کو سب دیہاتی مذاق اور مزاحیہ انداز میں سناتے رہتے ہیں یقیناً یہ معاملہ مذاق کے علاوہ ان کو جھگڑے پر اُکساتا بھی ہے۔ میں اس معاملے میں ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ یاسین کے رہائشی چراگاہوں کی طرف مہم جو نہیں ہیں۔ وادی اشکومن کے پہاڑی علاقے میں سرسبز چراگاہ اور ایندھن کی لکڑی دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کیونکہ یاسین کے باسی ان دو چیزوں کی کمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں یہی چیزیں قراقرم کے سلسلے میں بہت نایاب ہیں۔

ہم افقی سمت میں اوپر کی جانب بڑھتے ہوئے کافی سرسبز کھاس دیکھ رہے تھے جولائی کے گرم موسم میں سبزے کی کوئی کمی نہیں ایسی جگہوں میں زیادہ ریوڑ ہونے چاہئے لیکن اس پہاڑی پر بہت کم ریوڑ نظر آتے ہیں۔

موسم گرما اس علاقے میں اتنا مختصر ہوتا ہے کہ لوگ گھاس کی کثرت کے باوجود سردیوں کے لئے اس کو اکٹھا نہیں کرپاتے ہیں۔ یہ کام بہتر سوچ اور منصوبہ بندی سے سرانجام دیا جاسکتا ہے مگر یاسین کے لوگ اس معاملے میں بہت سست اور کاہل ہیں جس کی وجہ سے وہ اس قدرتی دولت سے مستفید ہونے کا انتظام نہیں کر پاتے۔دولت اور حاصل ہنزہ سے تعلق رکھتے ہیں اس پہاڑی علاقے کی سرسبز مرغزاروں اور اس کے وسائل کو ضائع دیکھ کرایک طرف حرص ولالچ اور دوسری طرف غصے سے ان کی آنکھیں اُبھری ہوئی تھیں۔

وادی کے درمیان پہنچ کر بہت سارے ایسے پکھان بید(ایک پھول جس کا ست شامل کرنے سے دوابے حدکڑوی ہو جاتی ہے) دیکھے خاص کر نیلے بڑے

پکھان جنہیں بڑی تلاش کے بعد بھی پورے قراقرم میں نہ پا سکا۔ چوٹی کے نیچے پُرسکون سرسبز گھاس کے درمیان کیمپ لگا کر آگ سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اوہو! ہمارے ارد گرد نیلی انکھوں والی خُرمکس (جنس مکھی کی بڑی مکھی جو گھوڑوں کا خون چوستی ہے) بھنبھنا رہی تھی جو کسی طرح ڈس کر خون چوسنا چاہتی تھی مگر ہم نے کافی محنت سے اپنے آپ کو اس مکرو مچھر سے بچایا۔ سورج ڈھلتے ہی تھوڑی سردی محسوس ہوئی مگر تمام مچھر ایک دم غائب ہوگئے۔خوش قسمتی سے خُرمکس' جو ہمیشہ ناک میں دم کرتی ہے، غائب تھی ۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا اور دیگر کیڑے مکوڑوں سے بچنے کی کوشش کی۔اگلے دن کچھ گھنٹوں کے سفر کے بعد آٹر پاس کی چوٹی پر پہنچے جو اشکومن اور یاسین کے درمیان فصیل آب(منبع) (watershed) ہے۔ درکوت کی جانب سے یہ بہت آسان گزرگاہ ہے۔ راستے میں چڑھائی کے ساتھ ذرد' سرخ پتھربیل' زرد گل اشرفی اور کثیر تعداد میں ناخوردنی جنگلی پیاز پائے جاتے ہیں۔

یاسین کے قلیوں کو ہم نے بہت پسند کیا۔ وہ بڑے شوق 'مہارت اور مضبوطی سے گدھوں اور گھوڑوں پر سامان لاد سکتے تھے۔ ہماری خواہش کے مطابق امید بھی نہ تھی کہ سرحد کی چوٹی پر اشکومن کے لوگ پہنچ سکیں گے لیکن چوٹی پر پہنچنے سے قبل ہی اُس طرف سے لوگ کثیر تعداد میں پہنچ کر ہمارے انتظار میں تھے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی کہ آخر ہمارے پہنچنے کی اطلاع ان لوگوں کو کیسے دی گئی۔ بہرحال یہ معاملہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ سرحدی داخلے کے وقت قلیوں کے تبادلے کا بہت سخت رواج ہونے کی وجہ سے ہمیں درکوت کے دوستوں کو الوداع کہنا پڑا۔ جس کے بعد ہم اشکومن کے لوگوں کے ساتھ ان کے علاقے کی جانب روانہ ہوئے۔

باب نمبر 7
اشکومن اور اس کے گلیشیرز

اشکومن کی طرح یاسین میں بھی ہمارا قافلہ پچھلے دروازے سے داخل ہوا تھا۔عموماً گلگت سے وادی اشکومن جانے کے لئے سنگل کے قریب بہت عمدہ خچر پاس سڑک ہے جہاں گرمیوں میں بہت گرمی پڑتی ہے۔

اشکومن کے قلی ہمیں آٹر پاس کی بلندی سے اپنی طرف لیکر نکلے۔ ہمیں اندازہ ہوا تھا کہ قلیوں کے تبادلے کے بعد کوئی ہنرمند دستہ ہاتھ نہیں لگا ہے۔ وزن اور جسمانی ساخت دیکھے بغیر بوجھ اٹھانے کی وجہ سے راستے میں وہ بہت بوکھلاہٹ کا شکار ہوئے۔ دولت بیگ نے ان کے بوجھ اٹھانے کی حالت دیکھ کر غلط نہیں کہا تھا کہ 'ہنزہ کی ایک گوجالی خاتون ان تین بیکار مردوں سے بہتر ہوتی ہے'۔

ہم بتدریج ڈھلوان سے اترائی کی جانب جلدی کی بجائے آرام آرام سے چل رہے تھے۔ مگر قلی غیر معتدل سانس لیتے ہوئے باربار کچھ یارڈ چل کر رُکتے، توتو'میں میں کی تکرار میں لگے ہوئے تھے۔ اس معاملے کے باوجود ہم ان کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ میں اترائی میں اکیلے ترچھی چٹان سے گزر رہا تھا کہ اچانک سامنے سے راجا کا بیٹا میر احمد خا جو بڑا خوبرو اور ہوشیار نوجوان ہے، تین ادمیوں کے ساتھ نمودار ہوا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں دف' رباب اور دوسرے کے ہاتھ میں خوبانی سے بھری ٹوکری تھی۔ مجھے ان کی خوش اخلاقی کے باوجود یہ منظر اچھا نہیں لگا۔ طویل سفر کی وجہ سے ہماری جسمانی حالت خراب'

کپڑے گندے اور غلیظ ہو چکے تھے ۔ داڑھی اور نہائے بغیر مزدور کا حلیہ بنا کر جلدی اُن سے علیک سلیک کر کے ملن کے مشکل رسومات سے نکل کر ہم وادی سے نیچے نکل پڑے۔ میں ان موسیقاروں سے بہتر تھا جو ہم سے آگے تیزی سے میوزک کے ساتھ شینا میں گیت گاتے ہوئے چل رہے تھے۔

یقیناً میں یہ کہوں تو مذاق یا بے محل بات ہوگی کہ ہم ہندوکش کے بلندیوں پر گلیشیر کے ساتھ میدانوں سے چلتے ہوئے خوش قسمتی سے ایک ندی نالہ کے پاس پہنچے! جس میں نہا دھو کر شکل میں تھوڑی بہتری آئی ورنہ ہم اس عجیب راستے پر قابل نفرت میوزک کے ساتھ آگے چلتے ہوئے کمپ تک پہنچنے والے تھے۔ میں نے اس نامعلوم گزرگاہ سے آٹر یا آٹروسر(جھیل) دیکھنے کی خواہش کی تھی جو تقریباً دومیل لمبی ہے مگر پہلے پہل میں نے اس پر توجہ نہیں دی کیونکہ یہ ساج کے پتے کی رنگ کی طرح غیر معمولی نظارے کا باعث تھا۔ یہ جھیل دو برفانی تودوں کے پتھروں کے ڈھیر کی وجہ سے وجود میں آئی ہے جنہوں نے نشیبی حصے کو روک رکھا ہے۔ اس وجہ سے گلیشیر کا گدلا پانی اس کو بھرنے کے ساتھ اس کی رنگت کو بھی سیاہ کر رہا ہے۔جھیل مغربی کنارے کی جانب نصف میل تک خشک ہو چکی ہے جس کی وجہ مسلسل برف اور گلیشیر کے پانی کی مداخلت ہے جو کئی عرصے سے جھیل کو بھرنے میں کردار ادا کر رہا ہے۔ اگرچہ اس چھوٹی سی برفانی ندی سے یہ کام ممکن نہیں اس لئے مقامی لوگ بھی پہلی بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ راستہ سنگلاخ چٹان، پتھروں کے ڈھیر، ڈھلوان اور دشوار گزار ہونے کی وجہ سے پہاڑی پگڈنڈی پر ایک گھنٹہ فی میل کے حساب سے جھیل کے جنوبی کنارے سے آہستہ آہستہ چل کر مشرقی کنارے پر پہنچ کر سبزہ زار میں گھاس پھوس کے نشیمن پر گھنے جنگلی درختوں اورجھاڑیوں کے سائے میں کمپ لگا کر قیام کیا۔مشرق کی جانب

بلندوبالا عظیم کمپر(کمپر یا کمپیر کے معنی ہے بوڑھی عورت) کی چوٹی اپنی خوبصورتی کے ساتھ گلیشیر کے اوپر ایستادہ حسین منظر کی عکاسی کر رہی تھی۔

یہاں کے قدرتی مناظر بہت خوشنما اور دلربا ہیں خاص طور پر آٹر کے درّے کی انتہائی بلندی سے بہت دور ہنزہ کی بلند چوٹیاں نظر آتی ہیں۔قریب ہی ہمارے دائیں جانب گلیشیر کا منبع واقع ہے۔ ہمارے پیچھے درکوت کے عظیم پہاڑی سلسلۓ ان کے گلیشیر اور گھاٹیاں سب کے سب آنکھوں سے اوجھل ہوکر ایسے لگ رہے ہیں جیسے پتھروں کا ڈھیر۔ ہم بہت بلندی یا غلط جگہ پر کھڑے ہیں جہاں ان پہاڑی چوٹیوں کی حسن نے درکوت کی خوبصورتی کو مات دے رکھی ہے۔

بلندوبالا درّے سے صبح و شام چل چل کر ہمارے میلان اور عیش ونشاط میں کمی آرہی تھی۔ آگ بنانے کے لئے لکڑی کی کثرت اورمہمان نواز میزبانوں کی موجودگی میں ہم نے پژمردگی کو رخصت کر کے کھیل تماشہ کی تیاری شروع کی۔ اشکومن کے لوگوں نے پرجوش ذوق کے ساتھ موسیقی کا مظاہرہ کیا کاش وہ ہمارا بوجھ اٹھانے کیلئے بھی ایسے ہی پرجوش ہوتے! میں نے کافی دیر سے ان کا مشاہدہ کیا جب وہ آگ کے آلاؤ کے گرد فضا سے بہت پست قد کے ساتھ اچھل کود کر ناچ رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی پرورش بہت غربت و افلاس میں ہوئی ہے۔ چھوٹے قدوقامت کے باوجود لمبے دامن و آستین کے ساتھ آگ کی روشنی میں زبردست اچھل کود کر بغلیں مار رہے تھے۔ واقعی دولت بیگ نے صحیح کہا تھا کہ یہ لوگ مرغی کے چوزے جیسے لگ رہے ہیں۔مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ اشکومن کے رہائشی بدتمیز، کمزور جسامت،کند ذہن اور عجیب پہاڑی لوگ ہیں۔

جب میں نے تینوں موسیقاروں سے گپ شب کی جو بڑے انہاک اور زور زور سے بجا رہے تھے تو پتہ چلا کہ اس پوری وادی میں کوئی پیشہ ور موسیقار

نہیں۔ اس لئے کوئی بھی بانسری بجانے کا صحیح گر نہیں جانتا نہ ہی وہ ڈھول کو درست بجاسکتے تھے۔ ان عجیب پست قد لوگوں نے میرے سامنے اپنے موسیقی کے اوزارکو المناک طریقے سے بجا کراشکومن کے ٹیلنٹ کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ مقامی طور اس حوالے سے کچھ بھی نہیں بنا سکتے ہیں جب ان کو موسیقاروں کی ضرورت پڑتی ہے تو ہنزہ سے منگواتے ہیں۔(مقامی بزرگوں کے مطابق ہنزہ اشکومن سے بہت دور ہے موسیقار ہمیشہ پونیال سے منگوائے جاتے تھے لیکن فاضل مصنف نے نہ جانے ہمسفر ہنزہ کے لوگوں کی ترجمانی کی ہے: مترجم) اشکومن میں قیام کے دوران مجھے ان لوگوں کی قلیل صلاحیتوں کا پتہ چلتا گیا۔ رات کو جب ایک موسیقار کا ڈڈنگ پھٹ گیا تو اگلے دن صرف دو آدمی ہی موسیقی بجاتے رہے لیکن شوروغوغل اس قدر زیادہ تھا کہ ہمیں اُس چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔

ہم اترائی سے نیچے کی طرف بہت زیادہ گرمائی چراگاہوں اور سبزہ زاروں سے ہوتے ہوئے شفیال(فیال شینا میں کھانے کی طشتری کو کہتے ہیں: مترجم) میں لوگوں سے ملے۔ شفال ایک مقامی رواج کا نام ہے جس میں عورتیں ایک بڑی چادر سے راستے کو روک کر چپاتی(جس کو مقامی لوگ اشپری کہتے ہیں) پیش کرتی ہیں جس پر کچھ پیسے رکھنے سے راہ چھوڑ دیتی ہیں ان کے بعد نمبردار ہاتھ میں لکڑی کی ایک بڑی تھالی میں روٹی اوردیسی گھی لیکر حاضر ہوا۔ہم سب نے ایک ایک لقمہ لیا اور آگے چل دیئے۔

پورے متھن تر کی وادی میں اصل صنوبر کے بہت زیادہ درختوں کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا اور بڑی مسرت ہوئی جو پوری وادی میں پھیلے ہوئے تھے۔جنگلی سفیدے اور بیرج(ایک درخت جس سے کاغذ بنتا ہے) کی کثرت تھی سفیدوں سے کثرت کے ساتھ روئیں داررینشے گرگر فرش پرڈھیر لگے تھے۔ تاجکستان کی ہنرمند

خواتین ان سے تکیے بناتی ہیں لیکن اشکومن کے لوگ ان سے تکیے وغیرہ کچھ نہیں بناتے ہیں۔

راستے کی حالت قابل رحم تھی لکڑی کی کثرت کے باوجودغیر ضروری بے ڈنگ اور بے ترتیب ایسے پل بنائے گئے ہیں جیسے درخت گر پڑے ہوں۔ ہم سبک رفتاری سے اسی پگڈنڈیوں سے گزر رہے تھے جو بہت پیچیدہ اور یہاں بسنے والوں کے ذہین کی طرح تنگ و دشوارتھیں۔کوئی بھی ان راستوں کو دوبارہ بنانے کی فکر میں نہیں یہ تمام ان کی سہل انگاری اورسستی کی نشانیاں ہیں جس سے میں بہت پریشان تھا۔

مجھے بتایا گیا کہ اس ملک میں نہ تو کوئی مستری ہے اور نہ ہی کوئی ترکھان جس کی وجہ سے عمارت بنانا یا کوئی تعمیراتی کام ان کی سوچ سے باہر ہے۔ ان کے دریا میں سوناپایا جاتا ہے لیکن کسی مرد عورت یابچے کو اس کا گر نہیں آتا۔ کوئی بھی سلیقے سے کھررا کپڑا نہیں پہن سکتا ہے جس کی ہمسایہ علاقوں میں مثال دی جا سکے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی کچھ بھی نہیں کرسکتا ہے ستر فیصد لوگ علیل دیکھ کر میں بہت افسردہ ہوا۔

لوگ مولائی فرقہ(اسماعیلی نزاری) سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ممبئی میں اپنے موروثی امام سے فیض حاصل کرتے ہیںان کی مذہبی رسومات غیرضروری طور پر قلیل کر دی گئی ہے جس کی وجہ سے دنیامیں موجود دوسرے فرقوں کی نسبت یہ لوگ سب سے کم مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ مذہبی محرکات کے ساتھ ساتھ مذہبی ضوابط دونوں مستور ہیں۔ شراب نہ صرف پیتے ہیں بلکہ شراب پینے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔شراب کشید کرنے کے معاملے میں یہ لوگ ایک دوسرے سے آگے ہیں۔ بد بودار اور بدمزہ طریقے سے شہتوت کشید کر نکالتے ہیں۔ یہ زہریلی شراب

وسیع پیمانے پر استعمال کی جاتی ہے۔ ایک آدمی تانبے کا برتن ہمیشہ چائے بنانے کے لئے اپنے ساتھ رکھتا تھا ہمیں بھی چائے بنانے کے لئے اس میں پانی ابالنے لگا تو اس کی ناگوار بو اتنی پھیل گئی کہ ہم نے نہ صرف اس کو چائے بنانے سے منع کیا بلکہ اس گندے برتن کو لیکر دور نکلنے کو کہا۔

ہم گرمائی چراگاہ ہندس سے گزرے جہاں دریا کے دونوں اطراف بہت کشادہ زمینیں اور پانی کی کثرت تھی اس کے باوجود یہ لوگ سال میں صرف ایک فصل کاشت کرتے ہیں۔ ممکنہ طور پر خراب موسم یا بیکار کاشت کاری کی وجوہات ان تنگ ذہنوں سے زیادہ پریشانی کا سبب نہیں جتنی ان کی بیمار معیشت جو ان کی کاہلی کی وجہ سے ہے۔

ہم اگلی منزل اشکومن خاص کی جانب روانہ ہوئے جو اس ملک کا واحد قدیم رہائشی گاؤں ہے جہاں صرف اس علاقے کے اصل باشندے اشکومن والے آباد ہیں۔ قرب و جوار میں وخی ایمت کی جانب، باقی لوگ چترال، یاسین، زریں گوپس، یہاں تک کہ چند پٹھان اور کچھ بچے کچے سید(rubbishy Seyyids) اشکومن کے نشیبی علاقوں میں رہائش پذیر ہوئے ہیں لیکن اصلی قدیم رہائشی اشکومن خاص کے لوگوں کو ہی کہا جاسکتا ہے جو دریائے اشکومن کے کنارے آباد باج گزار تھے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کو یہاں کیوں دوبارہ آباد کیا گیا ہے؟ ان کے راجا کا کہنا ہے کہ تمام علاقوں سے دور یہ لوگ اتنے تنہا اور نظرانداز تھے کہ اپنے اعمال خود ہی بھگت رہے تھے ان کی بہتری کیلئے کوئی بھی محرک نہ تھا۔ اشکومن وسیع پیمانے پر کھیتوں کے ساتھ ایک چھوٹی ریاست تھی جس کی کوئی خاص ممتاز حیثیت نہ تھی۔ان کا قلعہ خستہ حالی کی وجہ سے گر چکا تھا جس پر نہ کسی نامور

گروہ نے حملہ کیا ہے اور نہ ہی کوئی بڑا پیر ٹھہرا ہوا ہے۔ مگر ان کے بزرگوں کے مطابق یہاں کوئی لڑائی ہو نہیں سکتی تھی کیونکہ قلعہ کے ہر سمت تنگ گھاٹی، صرف چار یارڈز (بارہ فٹ) کشادہ تھی جہاں سے گلیشیر کا پانی قدرتی طور پر تنگ کوہل میں نہر کی طرح زور دار بہہ رہا تھا۔

ہماری اگلی منزل ایمت موجودہ راجہ کا دارالحکومت ہے جو دریا کے بائیں جانب افغانستان کی سرحد تک پھیلا ہوا ہے جہاں قرمبر سے دریا نکل کر دریائے اشکومن سے جا ملتا ہے۔ہمیں بتایا گیا کہ اس وقت دریا میں پانی بہت زیادہ اور گہرا ہے جس کی وجہ سے ہم ایک پل پار کر کے بارہ میل دور نیچے کی طرف دریا کے دائیں جانب آگے چکر کاٹ کر دریا کے بائیں جانب پچیس کلومیٹر دوبارہ چل کر بڑی مشکل سے ایک رسّی کے پل تک پہنچے۔ مجھے بہت پریشانی تھی کہ ہمارا باورچی عزیزو کیسے وہ پل پار کرے گا؟ معمے کا حل نکل آیا اُن پر قسمت مہربان ہوگئی ہم نے تو کچھ نہیں کیا۔

ہم اشکومن قصبے سے بنجر پہاڑی نشیبی چکر کاٹ کر پل کی جانب جارہے تھے راستے میں ادھر اُدھر نہیں دیکھا(پورا علاقہ بنجر پڑا تھا جس کی وجہ سے میں نے کسی پر بھی توجہ نہ دی)اچانک نظر کے سامنے دریا کے مخالف سمت سے ایک گھوڑسوار تنگ اور دشوار راستے سے ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے بہت الجھن ہوئی کہ کس نے یوں طغیانی میں کم پایاب پانی کی جگہ سے دریا پار کیا ہوگا۔ یقیناً یہ اشکومن کے گورنر راجا میرباز خان ہونگے جو بہت ہمت و حوصلہ والے عظیم انسان ہیں۔ ہم نے اس معاملے کا حل یہ نکالا کہ اگلے گاؤں دلتی جو خوش قسمتی سے نزدیک ہی تھا، بہت مزہ دار خوبانی کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر راجا کا انتظار کیا۔ٹوکریوں سے مزہ دار خوبانی کھا کر وقت جلد گزرا جنہیں گاؤں والوں نے ہماری حوصلہ افزائی

اور خاطرمدارت کے لئے بھیجا تھا۔ آخرکار راجا پہنچ ہی گئے ۔ہم نے ایک دوسرے سے گلے شکوے اور معذرت کے ساتھ درختوں کے سائے میں چائے نوش کی۔

دلتی میں خوبانی کی کثرت تھی دولت بیگ رشک و شکایت سے میرے پاس آئے اور کہا کہ دیکھو اشکومن کے آدمیوں نے کتنی خوبانی کھائی ہے؟ میں نے دیکھا کہ یہ لوگ دائرے میں ایک کمبل کے اوپر خوبانی کا بڑا ڈھیر ختم کر کے گٹھلیوں کو کھانا شروع کر چکے ہیں جو بہت زبردست ذائقہ دار تھے۔ ہم رات گئے تک ان کی گٹھلیاں توڑنے کی آوازیں سن رہے تھے۔ اس موسم میں سڑک کے کنارے ہر پتھر پر خوبانی خشک کرنے اور گٹھلیوں کے چھلکے پائے جاتے ہیں۔ اچھی خوبانی کی یہ خاصیت ہے کہ زیادہ مقدار میں کھانے کے باوجود کوئی بیمار نہیں ہوا ۔مقامی لوگ کہتے ہیں کہ یہ پھل زود ہضم ہے لیکن گٹھلیاں بعد میں کھانی چاہیے۔ اس موسم میں ہفتوں تک لوگ انہی پر گزارا کرتے ہیں خوبانی کی کثرت ان کے لئے صحت بخش بھی ہے۔

اگلے دن ہمیں دوبارہ اشکومن قصبے سے تنگ گھاٹی اوردریا کے بائیں جانب چند میل دوری پر دریائے قرمبر کے قریب پہنچ کر دریا کو عبور کرنا تھا۔ دو دریاؤں کے سنگم پر بھوری رنگت چٹان جس کے گرد وسیع بنجر زمین پتھروں کی ڈھیر کے ساتھ دریا کا بہاؤ تھا۔ جب ہم یہاں پہنچے تو دریا پانچ ندیوں میں منقسم تھا لیکن کبھی طغیانی سے ایک طرف بھی بڑھ سکتا ہے جس سے عبور کرنا محال ہوگا۔ راجا کہتے ہیں دریا اتنا زیادہ اور گہرا نہیں کہ عبور نہ کر سکے مگر مشکل یہ ہے کہ اس کے درمیان گول گول پتھر ہیں جن پر پاؤں رکھنے سے کسی بھی وقت انسان پھسل کر گر سکتا ہے۔ تاہم میرے لئے ایک اونٹ باقی لوگوں کے لئے خوش گاؤ فراہم کردیئے گئے۔ اونٹ بڑی مستقل مزاجی اور سبک رفتاری سے دریا پار کرنے لگا

لیکن خوش گاؤ بڑی گھبراہٹ' جلدبازی اور مخصوص آوازیں نکالتے ہوئے افراتفری میں پار نکلے۔ یہ ایسی مشکل جگہوں سے نکلنے کیلئے انتہائی موزوں جانور ہیں جو حیرت انگیز طور پر پیر پھسلے بغیر پار نکل سکتے ہیں۔ پہاڑی تنگ راستوں سے نکلنا ان کیلئے کوئی مسئلہ نہیں صرف ان کیلئے گرمی خوف کا باعث ہے۔ سردی کے موسم میں یہ بہت کچھ کرسکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرمبر کا ٹھنڈا پانی ان کے لئے بہت موزوں ہے۔ ٹھنڈے اور گہرے پانی کی موجیں ان کے اوپر سے گزر رہی تھی وہ ہچکولے کھاتے ہوئے پانچ بڑے ندی والے بھنور پار کر گئے ہم ان کے پیٹھ پر چمٹ کر ایسے بیٹھے تھے جیسے سڑکوں اچھلتی کودتی بندر۔ ہم بغیر کسی ہیجان کے دریا کے اس پار نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ خوش گاؤ عموماً جلدباز سرکش اور تنگ مزاج ہوتے ہیں لیکن یہاں وہ ایک طرف صف آراء تھے۔ دریا کے بائیں جانب گاؤں ایمت چند میل دوری پر تھا جہاں گورنر نے مہمانوں اور اپنے لئے اچھا گھر تعمیر کروایا ہے۔

بوڑھے وخی راجا علی مردان شاہ کی وفات کے بعد ان(راجا میرباز خان) کی پہلی آمد پر اس علاقے میں چند ہی خستہ حال جھونپڑیاں بنی تھیں۔ موصوف ایمت میں اصل خانہ بدوش کی طرح واخان واپس جانے کی امید سے مستقل رہنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ وہ بڑے روشن خیال اور پرامید تھے مگر عقل نہیں مانتی کہ افغانی اُن کو وہ کچھ دیں گے جو ان سے چھین لیا گیا تھا۔علی مردان صرف ایک وعدے کی خلاف ورزی کی وجہ سے افغانستان سے ہجرت پر مجبور ہونے کے بعد بھی اُن پر اعتماد کرکے بے وقوفی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ وہ اشکومن سے واپس جانے کی اپنی خواہش کی تکمیل میں ناکام ہو چکے تھے۔ ان کی رعایا بھی انتہائی کسمپرسی اور خستہ حالی میں دن گزار رہی تھی۔ راجا کی

وفات کے بعد نصف سے زیادہ لوگ اپنی آزادی‘ بے احتیاطی‘ بے ضابطہ خانہ بدوش زندگی گزارکر بڑی امید سے واپس واخان چلے گئے۔۔۔ ان پر جھوٹے الزامات لگے۔۔۔ ان شرائط کی وجہ سے وہ عجلت میں دوبارہ ایمت کی طرف واپس آگئے ۔

مکانات کی تعمیردرختوں کے باغات اور فصلوں کی کاشت کاری سے موجودہ گورنر نے ان لوگوں کی زندگی میں عمومی تبدیلی لائی ہے۔ وخی لوگ بے قوف نہیں وہ اشکومن میں اچھی نسل کے لوگ ہیں جب ان کو احساس ہوجائے کہ ان کی گڈریے والی زندگی اب اختتام کو پہنچنے والی ہے تو وہ باقی زندگی جدوجہد کرنے کے بہت جتن کرسکتے ہیں۔ وخی بڑی مقدار میں تمباکو کاشت کرکے اشکومن کے بے وقوف لوگوں کو بیچ دیتے ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ اس فصل کو کاشت کرنے سے وہ مرسکتے ہیں۔شکر ہے راجہ کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ان لوگوں نے بھی اپنی فرسودہ سوچ ختم کرکے چندایک نے کاشت شروع کر دی ہے مگر اب بھی وہ ناخوش‘ خائف اور سراسیمگی کا شکار ہیں۔

ایمت میں ایک گرم چشمے کی بہت شہرت ہے میرے خیال میں سلفر کی وجہ سے اس کا پانی گرم رہتا ہے، اتنا گرم بھی نہیں کہ جولائی کی گرم دھوپ میں ہاتھ نہ لگایا جاسکے۔ ہم سب کے علاوہ باربار نہانے کی سخت مخالفت کے باوجود ہمارے باورچی عزیزو نے بھی نہایا۔

ایمت مکھیوں اور کتّوں کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہے۔ تمام رات مسلسل ان لاغر خون خوار حشرات نے ہمارے کمرے کے گرد چکر لگائے اسی شوروغل میں صبح ہوگئی۔ دن بھر کمرے میں مکھیاں بھنبھناتی رہی۔ راجہ کتوں کے ساتھ تو نمٹ سکے لیکن مکھیوں کے بارے میں بڑے بے بس تھے۔

ایمت سے آگے قرمبر کی جانب چترال اور افغانسان کے لئے مناسب راستہ ہے جہاں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر گرمیوں میں زیادہ پانی کی وجہ سے یہ راستہ دشوار گزار اور بند ہوجاتا ہے۔ تاہم اسی نام(قرمبر) سے گلیشیر اور دریا کافی نیچے تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم نے اسی وادی سے اس ملک کے بالائی علاقوں کی مزہ دار سیر کی۔تاہم یہ تمام جگہیں ہمسایہ علاقوں کی طرح ڈھلوان‘ ویران اور بنجر پڑی تھیں کچھ کوّوں کے علاوہ کوئی پرندہ نظر نہیں آیا۔ راستے میں کافی وخی گاؤں نظر آئے جس سے اس بات کی عکاسی ہوتی ہے کہ وہ قدیم خانہ بدوش رہائشی ہیں جو اس ملک کے لئے بڑا اثاثہ ہوسکتے ہیں۔

قرمبر گلیشیر پہنچ کر دریا پار کرکے بڑی حیرت اور خوشی ہوئی یہاں کثرت سے بید‘ پنسل دیودار‘ صنوبر اور گھاس پھوس کے علاوہ کاشت کی زمینیں سب دریا کے دائیں جانب کافی اونچائی پر واقع ہیں۔ عظیم گلیشیر کے نیچے پوری وادی کے نشیبی علاقے دلکش اور دلربا منظر کے ساتھ حقیقی معنوں میں گرمائی کیمپ لگ رہے تھے۔ وادی کے منبع سے 23000فٹ بلندی پر گلابی شکل کی مخروطی چٹان کے ساتھ برفیلی چوٹیاں، عظیم گلیشیر کے درمیان کئی جگہ بڑے بڑے شگاف پڑے ہیں جن پر سورج کی تپش سے پانی آنسو کی طرح بہہ رہاتھا۔ شام کے وقت سورج کی شعاعیں عظیم گلیشیر پر پڑتی ہیں تو ریشمی گلاب کی طرح چمکتا ہے اورڈھلوان سطح پر عجیب سے خوبصورت عکس بن جاتا ہے یہ یقیناً پُرجلال کرشمہ ہے۔

ہم یہاں سے گلیشیر کے منبع کی طرف نکلے جہاں حیران کردینے والا سبزہ ہمارے لئے تقریباً سدِراہ تھا۔ وادی کے دونوں اطراف پست جنگلی بید کی گنجان مقدار عموداً لکیر کی طرح سیدھی ڈھلوان تھی جس کی وجہ سے سست رفتاری سے نیچے اترے۔ ہم جھاڑیوں میں سے جھولتے جھولتے جڑوں اور ٹہنیوں کو پکڑ پکڑ کر پیشہ

ورانہ بندروں کی طرح نکلے۔ سفری تکلیف اور مشقت سے گلیشیر کے منبع پر بہترین سبزہ زار سے ہمکنار ہوئے۔

ہمارے ساتھ راجہ کا دوسرا بیٹا تھا، جو بہت اچھے اور مشینری سکول سرینگر سے تعلیم حاصل کر چکا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے میں کافی بوریت محسوس کرتا ہے۔ ایشیاء کے دوسرے لوگوں کی طرح یہ بھی سوچتا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سوائے نوکری کے اور کیا کیا جاسکتا ہے ۔ جیسے میں اور دولت بیگ نے پورے مشن کے دوران کسی سے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ یہ بات ان کو بالکل سمجھ نہیں آئی کہ مگر وہ اپنی روایت اور رواج کے مطابق جہاں بھی موقع ملا کھاتا پیتا رہا۔ عموما میری خواہش پر یہ لڑکا ہر دن ہمارے پاس چائے پینے پہنچتا تھا جس کے دوران میں بحث ومباحثہ اور گپ شپ کی شروعات کیا کرتا تھا۔ وہ ایک بہترین دوست ہونے کے ساتھ اپنے بھائی میر احمد کی طرح نفیس اورنرم خو انسان تھا جو پولو اور گھوڑ سواری بھی کیا کرتا تھا۔ مگروہ عموما اپنی قسمت اور مجبوریوں کی کہانیاں سناتا تھا جیسا کہ اپنی غربت' مواقع کی کمی اور عام انسانی ضروریات زندگی کی بے لطفی۔ وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اتنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ محض گاؤں کے سکول کا معلم ہے جو صرف بیس روپے کی ماہانہ تنخواہ پر کام کرتا ہے۔ میں نے ان کو اس کوفت سے نکلنے کے بہت گر بتلا دیئے لیکن وہ بیچارے اپنی خاندانی عظمت کی وجہ سے مجبور تھا۔ گشپور اور حکمران خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے دوسرے تمام لوگوں اور کاموں سے دور تھا۔ اس طرح وہ کیسے اپنے خاندان کی دوراندیشی سے پرورش کر سکے گا جب تک کہ وہ اس بیکار رواج سے باہر نہ نکلے مگر ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔

ایک یورپین شخص ایسے ایک فرد کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہے

جو نوجوان قابل ' صحت منداورتعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ وقت کی قدر اور نفع نقصان جانتا ہے؟ غریب محمد ایوب خان بھی ان دوسرے گشپوروں کی طرح بالکل بے کار اور لفنگہ ہے ان کی تعلیم پر اخراجات بھی فضول صرف ہوئے ہیں۔ وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا کہ' آپ صاحبان ہمیشہ مصروف ہوتے ہیں، کیوں! ہمارے ہیڈ ماسٹر کی بیوی باغ میں کام کریگی کاش کہ اس کے پاس وقت گزارنے کے لئے کچھ ہوتا!' تمام حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے ایک مشورہ دیا کہ 'اُس کو چند ایک پہاڑوں پر چڑھنا چاہئے لیکن وہ ہر کام کرنے سے معذرت کرتے ہیں'۔ ان کی روایات اور رواج اتنے سخت ہیں کہ وہ ان سے نکل کر کوئی اور نیا کام نہیں کرسکتے ہیں نہ ہی ان کے لئے کوئی تدبیر کرسکتے ہیں یہ مشکل معاملات ہیں۔

بورتھ اور بدصوت کے کافی گلیشیر کی سیر کے بعد ایمت پہنچ کر وہاں ایک شیر دیکھا جس پر ہماری نظرنہیں پڑی تھی۔ تبت بابا کی زیارت اپنے معجزاتی پتھر کی وجہ سے شہرت کے حامل ہے جو چکی کے پتھر کی طرح گول ہے۔ اشکومن کے لوگوں نے بڑی لالچ سے تین دفعہ اس پتھر کو چراکر اپنے گاؤں لے جانے کی کوشش کی مگر تینوں دفعہ یہ پتھر معجزانہ طور پر بغیر کسی انسانی مداخلت کے واپس اپنی جگہ پر آیا۔ اب اس پتھرکو چارمربع فٹ گول اور دو فٹ بلند ایک مختصرمٹی کے چبوترہ کے درمیان رکھا گیا ہے جسے اندر باہر سے رنگ برنگ جھنڈیوں سے سجایا گیا ہے۔ ہم نے تعظیم اور باریکی سے اس عمدگی سے تراشے ہوئے پتھر کا جائزہ لیا لیکن کوئی بیرونی' قدیم رسوم یا آثار کے کوئی نشان نہیں پائے۔ ایک چھوٹی مسجد اس کے ساتھ بنی ہے لیکن تبت باباکے بارے میں کوئی کچھ بھی نہیں جانتا۔ اس زیارت کا متولی ایک کشمیری تھا جو خیرات جمع کرتا تھا لیکن اس پیشہ سے کچھ فائدہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ یہاں سے بونجی گیا ایک مہینہ گزرگیاہے۔ وہ اس گرم موسم میں وہاں

کی سیر سے ناخوش ہے اور اپنے کیئے ہوئے گنا کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے یقیناً یہی کام اس کے لئے مناسب تھا۔

کافی دن قیام کے بعد اشکومن سے نکلنے کا وقت آیا میں اپنے مہربان گورنر کو الوداع کہہ کر سیدھا گلگت جانے ولا ہوں تاکہ مقامی انتظامیہ سے اپنے لئے دوبارہ سامان سفر کا ذخیرہ لا سکوں۔ میرے پاس موجود سامان سفر میں سے پیسے، فوٹوگراف کی تمام فلمی پلیٹس اورتین جوڑہ انگریزی جوتے ان تین مہینوں کے سفر کے دوران ختم ہوگئے۔ میرے ساتھیوں کا بھی یہی حال ہوا ہے۔ سنگلاخ پہاڑی راستے بہت پتھریلے ہیں جو چمڑے کو پھاڑکر ناخن سے خون نکال لیتے ہیں۔ یقیناً ان چیزوں کی حالت سے ظاہرہوتا ہے کہ یہ سفری راستے بہت دشوار گزار ہیں ۔

ہم نے ایک اور رات ایمت میں گزاری ۔دولت نے اپنے پرانے دشمن عزیزہ کو ایک بار پھرسلفر جیسے گرم چشمہ میں نہانے کو کہا۔’آہ‘ اس نے باورچی سے کہا! آپ کا چہرہ پہلے نہانے سے چمک رہاہے اب ایک بار دوبارہ نہانے سے مزید اچھا ہوگا؟ عزیزو نے قہقہہ لگایا اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور وہ دیکھاوے کا غصہ کرنے لگا ۔’دوسری دفعہ غسل کرنے کے لئے میں نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے مزید اس کو اکسایا اور کہا‘ کیا آپ گھر جاکر دوسری شادی کرنے کے لئے تیار ہیں؟ یہ بات کوسن کر وہ مزید پھڑ پھڑاکر برہم ہوا وہ اتنا غصہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ بلاآخر وہ چشمہ کے قریب جاکر پانی میں اترنے سے مکر گیا مگر بڑی عقلمندی سے کنارے بیٹھ کر ہی نہانے لگے۔

ہمارا سفر پہلے مرحلے میں یہاں سے نیچے وادی پکورہ پھر پکورہ پاس سے آگے نلتر سے نومل پھر گلگت جانا تھا۔ گول لمبے چکر پھٹے پرانے جوتوں کے ساتھ

کافی ٹھنڈے اور خوبصورت علاقے سے گزرنا تھا۔

پہلے پہل تقریباً ایک میل کے قریب راستہ طے کرکے ہم چٹورکھنڈ پہنچے جو اس ریاست کا سب سے بڑاگاؤں ہے۔ جہاں میرے دوست راجہ کے بیٹے کی سرپرستی میں سکول قائم ہے، ایک ڈسپنسری کے ساتھ رسٹ ہاؤس بھی موجود ہے۔ راجا اس علاقے میں اپنے لئے ایک مکان بھی تعمیر کررہے ہیں۔ چٹورکھنڈ دو حوالوں سے مشہور ہے ایک پیر اور دوسرا اس کا کھٹل۔ دوسرے کے بارے میں کیا کہیے! یہ تو ہر جگہ موجود ہیں اور ہر چیز کھانے پہنچ جاتے ہیں ان کی استحصال کی ہر کوشش کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

موجودہ پیر جمال علی شاہ ایک نوجوان ہے جو مشہورزمانہ پیر سید جلال علی شاہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ یقیناً اس علاقے سے باہر پونیال تک اس کے مریدوں کی کثرت کے ساتھ مذہبی مقتدر حلقوں میں بھی ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کی والد ماجدکا ورثہ ہے۔ مولائی(اسماعیلی نزاری) اپنے پیروں کا بہت احترام کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی سماجی حیثیت کے ساتھ معاشی حالت بھی کافی بہتر ہے۔موجودہ نوجوان پیر کی چھوٹی بہن کے ساتھ میر آف ہنزہ نے شادی کی ہے۔چھوٹے بزرگ مجھ سے ملنے آئے وہ بہت خوش مزاج‘ خوبصورت اور کم گوشخصیت کے مالک تھے۔ اُن کا یہ منشاء تھاکہ وہ بالکل بولتے نہیں تھے، وہ یقین رکھتے تھی کہ خاموشی بڑی نعمت ہے، اسی خاصیت سے وہ شہرت پاگئے ہیں۔ میرے پاس تشریف لانے کے بعد ایک دفعہ بھی منہ نہیں کھولا، خوش آمدید کے لئے دو لفظ نہ ہی الوداع! بلکہ بڑے سلیقے کے ساتھ چارپائی پرتشریف فرما رہے۔ وہ میرے لئے کچھ فروٹ لیکر آئے تھے میں نے ان کو عطر کی ایک بوتل ، چارمختلف رنگ کے رومال اور سگریٹ کا ایک ڈبی پیش کیا۔ ان کے ساتھ

اُن کے بوڑھے چالاک چچا بھی تھے جو اپنے بھتیجے کی خاموشی کی تلافی کررہے تھے۔ گاؤں کے لوگ اور مریدوں میں اتنی شرافت ہے کہ وہ پیر کے نہ بولنے پر ناراضگی کی بجائے اسے برداشت کرتے ہیں۔ سب کی کوشش اور خواہش ہوتی ہے کہ صاحب سے گفتگو کریں لیکن موصوف ہمیشہ خاموش رہ کر ان کو چکرا دیتے ہیں۔

میں مسلسل ہر ایک کو تحائف دیتا رہا لیکن کوئی بھی مطمئن نظر نہیں آیا۔ یہ کافی مشکل مرحلہ ہے۔جب میں نے یوروپین بے قوفانہ طریقے سے ہر ایک راجا، وزیر اور گشپور کو تحائف دینے میں قناعت پسندی ظاہر کردی تو میرے بے ذوق ہنزہ کے ساتھیوں نے طنزیہ کہا کہ اگر آپ اپنے پاس موجود ہر چیز ان لوگوں کو پیش کریں تو بھی یہ راجا، وزیر اور گشپور خوش نہیں ہونگے۔ یہ بالکل سچی بات تھی۔ میر سے لیکر مفلس گشپور تک سب کے سب میں سے کسی کو قناعت پسند نہیں دیکھا۔ یہ تقریبا بہت دشوار مرحلہ ہے کہ کب ان تمام لالچی پہاڑی وحشی ریاستی لوگوں کا پیٹ بھرجائے گا۔ ہرنسل کی اپنی خامیاں ہوتی ہے لیکن ان معزز لوگوں کے لالچ کو دیکھ کر حیرت ہوئی جو دوسری طرف اس علاقے کے حکمران ' قابل اعتبار دوست اور لائق بھی ہیں۔ یہ روّیہ بہت خطرناک اور کردار برا ہے خاص طور پر ان لوگوں کے لئے بدقسمتی اور بدشگون ہے جو اس عمل کی چکی میں پس رہے ہیں جس کا کوئی حل نہیں۔ تمام سیاح خاص طور پر یوروپین' جو ان علاقوں میں مشن یا کسی اور وجہ سے آتے رہتے ہیں، اس شکایت کو رپورٹ کرچکے ہیں۔ بہت کوشش کے باوجود وہ مقامی لوگوں کی اس حرص و ہوس والی طبیعت کو مطمئن نہ کرسکے۔

اب مجھے پکورہ پاس سے اوپر نالہ کی طرف جانا تھا اس لئے راجہ میر باز خان سے رخصت ہوا جو اس سفر کے دوران بہت مہربان' مہمان نواز اور بہت

معاون تھے ۔ میرے خیال میں راجا بہت زیادہ قابل اور ان کی برطانوی ریاستی افسروں کے ساتھ عرصے سے تعلقات نے ان کو ایسا مقام اور مطمع نظر دیا ہے جو ان کے کسی اور ساتھی کے پاس نہیں۔ وہ بہت ہوشیار اور زیرک ہے ہر چیز کا اس طرح تعارف کراتے ہیں جو ان کی ریاست کے لئے مفید ہو۔ انہوں نے بڑے پیانے پر شجرکاری' کوہل' سڑک اور مکانات کی تعمیر کے ساتھ وہ سب کچھ کیاہے جو ان کے بس میں تھا۔ وہ اس وقت تقریبا ڈیڑھ سال سے چٹورکھنڈ میں مقیم ہیں جو اس علاقے کے لئے مفید ہے۔ یہاں مٹی کی کثرت ہے لیکن معیاری نہیں اس کی ذرخیزی کے لئے بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے کھاد بھی ناکافی ہے۔ میں جانتا ہوں راجہ لوگوں کو زراعت کی بہتری کے لئے بہت تکالیف بھی دے گا جو ان کیلئے بہت مفید ہے۔ یہاں تک کی وہ ان کھٹملوں کا بھی علاج کرے گا۔ اس نے پہلے ہی سیدوں کی آبادکاری کا انتظام کیا ہے جو سماج میں بہت بیکار اور تخریب کار لوگ ہیں، ان کے لئے باربرداری اور مزدوری کا اہتمام بھی کیا ہے۔ انہوں نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ یہ چالاکی سے اپنے آپ کو نبی محمدؐ کی اولاد ہونے کا جعلی بناوٹی اور غیر مصدقہ حربہ اپنا کر کام سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہت افسوس کی بات ہے کہ راجہ میرباز خان کی اہلیت کے مدمقابل ذرائع بہت محدود ہیں دوسری طرف اشکومن کی آبادی کم ہونے کے ساتھ قدیم جنگلی روّیے اور فاترالعقل وجوع ترقی پسند نہیں، ساتھ یہ ضلع ایک ایسی مخلوط آبادی پر مشتمل ہے جو ناپسندیدہ تارکین وطن سے حال ہی میں آباد کیا گیا ہے جن کے وسائل ترقی پسند حکمران کے لئے بالکل بھی کافی نہیں۔

پکورہ پاس کی طرف نکلنے سے قبل انتظامیہ سے اصرار کی وجہ سے نکموں میں سے بہتر قلیوں کو ہمارے ساتھ روانہ کیا گیا پھر بھی ان قلیوں نے شکایت

شروع کردی حالانکہ یاسین کے قلیوں نے بڑے آرام سے یہی سامان داس پور سے اُٹھایا تھا۔ انہوں نے زور سے چوں چوں اور آہ وبکا کی تو ہم نے ان سے بڑی معذرت سے کہا کہ ہم بھی کبھی اتنی گرم سڑک کی بلندی سے گلگت نہیں گئے تھے، پران بزدل اور خبطی لوگوں نے اس معاملے میں بڑا تنگ کیا۔ ایک تنومند آدمی چلاکر کہنے لگا کہ' ہم کمزور لوگ ہیں یہ کام نہیں کرسکتے ہیں'۔اتنے میں ایک تھپڑ کے ساتھ ڈانٹ کی آواز آئی اور اپنا کام دکھا گئی۔ یہی ان کام چوروں کا علاج تھا جو اپنی انا پر بضد تھے اور یہ بات ہم سب جانتے تھے۔ راجا کا بیٹا ہمارے ساتھ تھا لیکن وہ اپنے والد کی رعایا کے ساتھ ہمارے سلوک سے خوش نہ تھا۔ ہم نے ان کو سمجھایا کہ وہ ان کو سدھانے میں کچھ کریں ورنہ ہمیں ان سے خود نمٹنا ہوگا کیونکہ ہم نے پکورہ میں پورا موسم گرما رہنا تو نہیں آگے بڑھنا بھی ہے۔ وہ ہماری بات فوراً سمجھ گیا اور ڈانٹ ڈپٹ کر مظاہرین اور مضبوط پٹھے والے قلیوں کو متوجہ اور سیدھا کرنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔

ہمیں پتہ چلا کہ اشکومن کے لوگوں کے پاس خوش گاؤ بہت کثرت سے ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ'تم لوگ ان جانوروں سے باربرداری کا کام کیوں نہیں لیتے؟ ہمیں بتایاگیا کہ وہ ان جانوروں سے کوئی کام نہیں لیتے باربرداری اور نہ ہی ان پرسواری کرتے ہیں۔ وہ ان سے نہ دودھ حاصل کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے قیمتی بالوں سے کچھ بناتے ہیں۔ اس طرح کا نقصان بہت بڑی مجرمانہ غفلت ہے۔خوش گاؤ کو ان کے مالک جنگلی چراگاہوں میں کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور کبھی کبھی نئے بچھڑے کی پیدائش پر نشان لگانے یا گوشت کی ضرورت کے موقع پر ان کو لانے جاتے ہیں۔ غذر، پونیال اور یاسین میں بھی یہی رواج ہے لیکن ان جانوروں کو صرف وخی لوگ ہی کافی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کے

لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ معذرت کے ساتھ مجھے خدشہ ہے کہ اشکومن کے لوگ پورے شمال مغربی انڈیا میں سب سے کمتر انسانی گروہ ہیں جن کی بیماریاں بڑی مشکل سے بہتر ہونگی۔ میں ان سب چیزوں کی ذمہ داری ان کے راجا کے اوپر نہیں ڈال سکتا۔

باب نمبر8
ہنزہ اور نگر کی سڑک پر

دریائے ہنزہ چار میل کے فاصلے پر واقع اس گاؤں سے نیچے دریائے گلگت میں اسی نام سے جاملتاہے باقی پوری وادی ہنزہ کے نام سے جانی جاتی ہے سوائے اٹھارہ میل پچھلے منبع آب کے' دو ریاستیں ہنزہ نگر کی ملکیت ہیں۔ جب سے شمال مغربی انڈیا سے چینی ترکستان تک ہنزہ سے سڑک گزری ہے تب سے یہ دو ریاستیں ہنزہ نگر بہت شہرت پاگئیں ہیں۔

گلگت سے سفر کے پہلے دو مرحلے انتہائی غیر موثر ہیں: دریائے گلگت کے معلق پل سے گزرنے کے بعدسڑک دریاکے افقی جانب بنجر خشک پہاڑی سے آگے دائیں جانب اوپر ہنزہ کی جانب نکلتی ہے۔ پہلے پہل سڑک (Silbish) سل بش (چرمش داس) کے کیچڑ سے بھرے ہوئے راستے سے ٹھنڈے فیض رساں دریائے ہنزہ تک پہنچتی ہے لیکن قابل کاشت علاقہ آٹھ میل دور نومل کے مقام سے شروع ہوتا ہے۔ یہ نامعقول جگہ ہے صرف انگور کی وجہ سے مشہور ہے جو بہت چھوٹے' کڑوے اور بڑی گٹھلی کے ساتھ بدمزہ اور تعریف کے لائق نہیں۔

نومل نلتر کی ندی پار کرکے اگلی خوبصورت وادی تک پہنچنے کے لئے اتنی آسان رسائی نہیں مگر نومل سے سات میل دور ایک چھوٹا گاؤں گیوچ (Gwech) کے مقام پر دریا کے بائیں جانب کشمیر کی ریاستی حدود اور آگے نگر کے میر کے زیرانتظام علاقے سے داخل ہوسکتے ہیں۔

سڑک بہترین خچرپاس اور جگہ جگہ پُل بنانے کی وجہ سے بہتر ہوئی ہے

مگر ماضی میں اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ہنزہ کی تنگ گھاٹیاں' پہاڑی پگڈنڈیاں' دشوار چٹانیں اورہیبت زدہ روڑ کے علاقے ہنزہ نگر کی دورافتادگی کی وجہ سے نہیں بلکہ پُرخطر اور دشوار گزار راستے کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔گیوچ (Gwech) سے تھوڑا آگے مشہور چچر پڑی (Chaicher parri) کلیدی جگہ ہے جہاں پہلے پہل خوبصورت چٹان سے شفاف بوندیں دریا میں گرتی تھیں۔ مسافر اس جگہ سے گزرنے سے پہلے اپنے ایک بندے کو کھڑی چٹان کے بالکل نیچے بھیج دیتے تھے جو رسی سے ایک مضبوط لکڑی کی میخ چٹان سے باندھ دیتا تھا پھر تمام مسافر چمٹ کر گزرنے کے بعد اس رسی کو اٹھاکر راستہ بند کیا جاتا تھا۔ اس کا متبادل راستہ دریائے ہنزہ پر ایک معلق رسی کا پل بنایا گیا ہے جس کو پار کرنے کے بعد ضرورتاً تباہ کیا جاتا ہے۔

ان چٹانوں سے آگے حالیہ سالوں میں بجلی گرنے سے راستہ ہولناک حالت اختیار کرچکاہے خاص طور پر کر بونگ سلائی(Bong Tsilai)جوتنگ ڈھلوان کٹاؤ کی وجہ سے سرحدی نشان بن کر رہ گئی ہے۔ برف اس خندق نما جگہ پرنہیں رکتی تودے نیچے گرکر راستے کو تباہ کرکے پوری وادی کومنقطع کر دیتے ہیں۔ بونگ (bong) دراصل بکری کے چمڑے کے حلق یا منہ کو کہتے ہیں جس میں دہی بنائی جاتی ہے۔ جب اس کا حلق کھول دیتے ہیں تو سفید چمکتی دہی نظر آتی ہے۔ جیسے (tsil) کے معنی پانی کے ہیں۔ اس مناسبت سے سردیوں میں برف اور گرمیوں میں ندی کا شفاف پانی بالکل سفید رنگ کا ہوتا ہے جو دہی کی طرح (bong) کو کھولنے سے نکلتا ہے۔

اس وادی کا پہلا (settlement) رہائشی گاؤں چھلت ہے جو اپنے خستہ حال قلعہ' متروک سٹور' ایک چھوٹے ہسپتال کے ساتھ ماضی کی اپنی تاریخی

اہمیت کا عکاس ہے۔ یہاں کاشت کاری کثرت سے کی جاتی ہے۔قلعہ راجا خسرو خان کی ملکیت ہے جومشہور زمانہ مرحوم میر آف نگر کا بڑا صاحبزادہ ہے۔گھوڑوں کے بارے جتنا وہ جانتا تھا شاید کوئی اور جانے وہ جنگلی جانوروں کوخرید کر ان کو کارآمد بناتا تھا۔ اگر کوئی شخص بیکار گھوڑوں کو کارآمد بنا سکتا تھا تو وہ یہی ہے۔ اُس کی زندگی بڑے نشیب وفراز سے گزری ۔ اس نے جیل کاٹی' جلا وطن ہوا اورغلطی نہ ہونے کے باوجود اپنی سلطنت کا تاج بھی کھو دیا۔ وہ قتل ہونے سے بھی بچ نکلا اور حیرت انگیز طور پر اپنی زندگی پرانے دستور کے مطابق گزارکر وفات پائی۔ وہ فہم وفراست کے پیکر تھا، اس کو پچھلے پندرہ سالوں میں ایک ایک چیز کا علم تھا۔ موصوف نہ صرف ایک بہترین شکاری' گھوڑ سوار اور کوہ پیما کے ساتھ ذہین بھی تھا۔ فطری طور پر جب تک وہ تاج وتخت کی کرسی پر رہا تب تک وہ بہت کچھ تھا اور بہت کچھ بجا طور پر جانتا تھا۔

وادی چھلت میں ایک ٹیلی فون سیٹ بھی تھا جو ہنزہ اورنگر کے حکمرانوں کی پھٹکار میں ردعمل کے لئے بہت کارآمد رہتا تھا۔ مہذب دنیا میں یہ قطعی ضرر رساں چیز ہونے کے ساتھ اس کے اچھے اوصاف بھی ہوسکتے ہیں لیکن ایسے وحشی لوگوں کے لئے جنہوں نے صرف پندرہ سال پہلے پاجامہ دیکھا یا پہنا ہو ان کے لئے یہ بہت خطرے کا باعث ہوسکتی ہے!

چھلت سے آگے چھپروٹ کی وادی ہے جو پہلے کبھی کشمیری فوجی چوکی ہوا کرتی تھی، جوماضی میں اور آج کل بھی ہنزہ اورنگر سمیت سب کے لئے فساد کی جڑ کا باعث بنی ہے۔سب اس پر دعویٰ کرتے ہیں لیکن سب کا دعویٰ مبہم ہے۔ ماضی میں یہ گلگت راج کی ملکیت اور جاگیر ہونے کے ساتھ ایک مضبوط بازو بھی تھی۔

پچھلے ساٹھ(60) سالوں سے ہنزہ کے جفاکش اور ماہر کاشتکار جو پورے ایشیا میں مشہور ہیں انہوں نے چھپروٹ کو اپنے قبضے میں رکھا تھالیکن جب میں یہاں سے گزرا تو میرے ساتھیوں نے حسرت سے کہا کہ یہ سب کھیت' باغ ' میدان اُن کے اپنے ملک کے مزدوروں نے بنائے ہیں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ((Sir William Lockhart) کی قیادت میں گلگت مشن کے موقع پرہنزہ کے دورے کے دوران اس علاقے پر میر غزن خان نے چڑھائی کی تھی۔'مجھے چھپروٹ دے دو' میر نے کہا ' اور پھر جہاں تک جانا چاہو جاؤ'۔مگرعظیم بات ہے کہ ہر علاقہ ہنزہ والوں کونہیں دیا گیا اور اس وقت سے یہ علاقہ گلگت سے الگ ہو کر میر آف نگر کی ریاست نگرمیں شامل ہے۔ چھپروٹ جب ہنزہ کے ہاتھوں میں تھا تب ہنزہ نگر کو دریا نے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا جب سے برطانوی آفیسر گلگت میں آئے ہیں اس علاقے میں امن ہے لیکن پہلے ایسا نہیں تھا۔ یہ دو ریاستیں آپس میں بہت نفرت کرتی ہیں اگر ان کو تھوڑا بھی موقع ملے تو ہنزہ والے چھپروٹ پر دوبارہ حملہ کرسکتے ہیں۔چھپروٹ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ' اس علاقے کو نگر والوں سے چھینا اتنا اسان ہے جیسے کہ مرغی کے نیچے سے انڈہ'۔ یہی وجہ ہے کہ چھپروٹ ان کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ یہ ہنزہ کی تصویرکا دوسرارخ ہے ان کے جفاکش لوگوں نے ان کھیتوں میں مشقت کی ہے جن کی محنت کے آثار کو کوئی بھی تباہ نہیں کرسکتا ہے۔ چھپروٹ وادی بہت خوبصورت اور دلکش ہے یہ پورے گلگت ایجنسی میں سب سے زیادہ دلکش اور مرکز سے بہت مناسب دوری پر واقع ہے۔

چھلت سے آگے نکل کر دریائے ہنزہ کے بائیں جانب معلق پل سے پار کرنے کے بعدکافی دور سے ہم نے سامان کے ساتھ کچھ لوگوں کو آتے ہوئے

دیکھا۔ دولت بیگ نے اختصار سے کہا' ہنزہ کے آدمی ہیں' ۔ پوچھا گیا کہ' آپ نے کیسے پہچانا'؟ میں نے کوئی غیر فطری نہیں بلکہ وثوق سے کہا کہ سب پہاڑی لوگ دور سے ایک جیسے نظر آتے ہیں آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ ہنزہ کے ہیں حالانکہ وہ کافی فاصلے پر تھے۔'دولت نے آہ بھرتے ہوئے کہا' کہ اتفاقاً ان کی چال سے کیونکہ نگر کے گندے (swine)لوگ ایسے ڈھلوان نشیب پر پھرتی سے کبھی نہیں چل سکتے ہیں' وہ صحیح کہہ رہا تھا۔ ہنزہ کے کچھ لوگ پھل فروٹ لیکر گلگت جا رہے تھے۔ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جو اپنے علاقے کے پھل فروٹ لیکر نیچے قصبے کے بازار میں بیچتے ہیں خاص طور پر آڑو اور سیب جو ان علاقوں میں تھوڑی دیر سے پکتے ہیں۔ آڑو ہنزہ میں اٹھ پائی کے بیس جبکہ گلگت میں اسی قیمت میں سولہ دانہ بیچتے تھے ہنزہ کی نسبت گلگت میں بہتر قیمت کی وجہ سے منافع کافی ملتا تھا۔

اب ہم نگر کی ریاست میں داخل ہوئے جو دریا کے ساتھ حیرت انگیز اور بہت ہی ذرخیز پٹی ہے۔ اس ریاست میں ہنزہ کی طرح زمین کی قلت نہیں ہے۔

نگر ایک خوبصورت ریاست ہے۔اس ریاست میں صنوبر کے جنگل کی کثرت ہے مگرہنزہ میں ایک بھی نہیں اس لئے ایک روپیہ فی بالش لکڑی یعنی آٹھ انچ سفیدے کا درخت فی روپیہ کے حساب سے اپنے مکان بنانے کے لئے خریدتے تھے۔ سفیدے کی لکڑی موسمی طور پر درست نہیں وہ سردی اور گرمی میں پھٹ جاتی ہے۔ یہ واحد لکڑ ی ہے جو ہر وقت دستیاب ہوتی ہے خاص کر نگر میں عمارتی لکڑی کی کثرت کے ساتھ چرائی کی جاتی ہے۔

دومانی یا رکاپوشی (25,550 feet) نگر کے کھیتوں سے عموداً اوپر نظر آتی ہے بالکل اوپر ساتھ ہونے کی وجہ سے اس کا نظارہ صحیح نہیں ہوتا ہے۔ دریا کے پار

ہنزہ سے اس کا بہترین نظارہ ہوتا ہے اور وہ دلکش نظر آتی ہے۔

ان تمام ریاستوں میں عموماًروڑ کے ساتھ ایک جھونپڑی ہوا کرتی ہے جس کا ایک مربع کھڑکی یا چھوٹاجھکاہوا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتاہے جہاں ایک سطح نیچے کوہل میں پانی کا ذخیرہ ہوتاہے یا قریبی ندی کا پانی بہتاہے۔ یہ (ghurk) ہے جو ایک مربع لکڑی بکس جیسا ہے جہاں سے نیچے پلی کے ذریعے گہرائی سے پانی نکلا جاتاہے جس کو'تنوس' کہتے ہیں۔ پیاسے مسافر اس گہرے کنویں سے ٹھنڈا پانی پیتے ہیں۔ یہ گریگ (ghurk) بنانا قابل تعریف عمل ہےعموما اس کوکسی رشتہ دار کی وفات پر یااس کی یاد میں بنایاجاتاہے یا کسی کم حیثیت(rascal) بدمعاش کے مالک کی یاد میں تعمیر کئے جاتے ہیں۔گریگ بمشکل صحت افزا ہوتے ہیں۔ ہر جاندار انسان سے لیکر کتے تک سب کے سب یہاں سے پانی پیتے ہیں دوسری طرف اس کی پلی بھی باہر رکھی جاتی ہے جو ہرقسم کے چیزوں سے گندی ہوسکتی ہے۔گلگت ایجنسی کے لوگ خاص کرنگر والے اس گندگی کومعمولی چیز بھی نہیں سمجھتے ہے نہ ہی ان کو اس بارے میں کوئی فکر ہوتی ہے۔

دوسری اہم چیز 'بلدی'(baldi) ہے جو سڑک کے ساتھ برآمدہ کی طرح عموماً مسجد کے ساتھ تعمیر ہوتی ہے جہاں مسافر آرام کرسکتے ہیں۔مردوں کے لئے یہ بہترین جگہ ہیں خاص کر مرتضیٰ آباد کے پاس بنائی گئی جگہ جس کو قاسم کی بلدی کہتے ہیں، دلکش اور بہت مشہورہے۔ مسافر یہاں پر دوران سفر آرام کرسکتے ہیں اگر وہ رات گزارنا چاہے تو گاؤں کے لوگ ان کو بسترا اور کھانا فراہم کرتے ہیں۔ یہ آرام گاہ (بلدی)نسبتاً رات گزارنے کے لئے کافی قلیل ہوتی ہے۔شاید خدا ترسی انسانیت دوستی قلیل معیشت والے لوگوں کے لئے یہ مناسب ہوسکتی ہے جو اگلی نسل کے لئے بڑا بوجھ نہیں لینا چاہتے۔

عورتوں کیلئے۔۔۔خاص طور پر۔۔۔پتھروں کے ڈھیر سے سڑک کے ساتھ یادگار طور پر (mans) 'من' بنائے گئے ہیں جہاں قلی اپنے بوجھ رکھ کر آرام کرتے ہیں۔ وہ چھوٹے چبوترہ کی طرح مناسب بلندی کے ساتھ جہاں وہ بوجھ اتارے بغیر آرام کر سکتے ہیں۔ یہ 'من' عموماً ایسے علاقے میں نعمت سے کم نہیں جہاں سب چیزیں انسان ہی کر سکتے ہیں۔

نگر کے مشہور گاؤں نلت (Nilt) جس کا قلعہ 1891ء میں ہنزہ نگر کی جنگی منظر کی یادگار ہے۔ آج کل لوگ بغیر کسی عداوت کے اپنے بہت سارے محلات یا جگہوں کو دکھا کر ان پر فخر کرتے ہیں۔ کیونکہ زمانہ امن میں فوجی مہمات کی باتیں کرکے ان کو اکسایا جاسکتا تھا۔ نلت ایک کھائی کے بائیں جانب واقع ہے جس کی وجہ سے دومانی گلیشیر اور برف سے آنے والے پانی کی آواز سنی جاسکتی ہے کیونکہ وہ بالکل اس کے اوپر واقع ہے۔ نیچے گہرائی میں دریائے ہنزہ کا گدلا پانی کراہت سے بہہ رہا تھا جو اس خوبصورت منظر کے درمیان ناگوار گزرتا اور طبیعت پر ناگوار لگتی ہے۔ نلت سے تھوڑا پیچھے تنگ گھاٹی میں ایک سیب کا درخت تھا جب میں 1933ء میں یہاں سے گزرا تو وہ نہیں تھا۔ اس کھوکھلے تنے والے درخت کے اندر ہمیشہ کوئی نہ کوئی چھپ کر فوجی قافلوں پر فائر کیا کرتا تھا جوابی فائر کے کئی واقعات ہونے کے باوجود اندر چھپے شخص کو گولیاں نہیں لگتی تھی۔ اس کے بچنے کی وجہ سے لوگ بہت تنگ آئے اور اس درخت کو کاٹ دیا گیا جس پر بہت افسوس ہوا۔ درخت کو بھی بہت زیادہ گولیاں لگی تھی لیکن اپنے مکین کی طرح اس پر بھی اثر نہ ہوتا تھا۔

ہر ایک سیاح کے لئے یہ بہت مشکل مرحلہ ہوتا تھا کہ وہ ان دو ریاستوں کے درمیان کچھ فرق کر سکے۔ نگر میں سب چیزوں کی کثرت ہے۔دریا کے پار

اونچے چٹانوں کے انبار سے پانی تو بہتا ہے لیکن ہنزہ کے ہر گاؤں میں پانی کی کمی کے باوجود باغات اور پھلوں کی بہت کثرت ہے۔ ہم نے عموماً (khuraput) کے سنار کو دریا کے پانی میں سونے کو چھانٹے دیکھا۔ ہنزہ کے دریا کے ساحل کے ساتھ تقریبا آٹھ مقامات پر یہ لوگ سونے کی تلاش میں دریا کے ساتھ رہتے تھے وہ گاؤں کی کوئی بھی ذمہ داری لینے سے معذرت کرتے ہیں لیکن ان کے کام کی بھی کوئی خاص اجرت نہیں جو وہ پانی میں سونے کی تلاش میں اپنے پرانے اوزار سے ریت چھانٹتے رہتے تھے۔ یہ بہت افسردہ کردینے والا کام ہے کیونکہ جتنی مشقت اٹھانی پڑتی ہے اتنا سونا حاصل نہیں ہوتا۔

اخروت اور مکھیاں نگر میں بہت زیادہ ہیں۔جب میں نے مواخرالذکر کی شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ ہم اخروت کے پتوں سے ہی ان مضر چیزوں کے انسداد کی کوشش کرینگے۔ ہم نے اخروٹ کے پتوں والے کلیہ کو آزمایا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا البتہ مکھیوں کی تعداد کچھ کم ضرور ہوئی ہے۔

یہاں سیاہ گندم کثرت سے کاشت کی جاتی ہے اور یہی اس موسم کی آخری فصل ہے۔ یہ فصل دیکھنے میں بہت خوبصورت اور اس کے گلابی مائل پھول دلکش دکھتے ہیں لیکن اس کی خوشبو اتنی مغلوب کردیتی ہے کہ متلی یا قے آجاتی ہے جو بہت نفرت انگیز ہوتی ہے، یہ غسل کے پانی کی طرح انسانی فضلے کا سبب بنتی ہے۔ جب ان وسیع کھیتوں پر ہوا چلتی ہے تو بے ہوش کر دیتی ہے۔ یہ تلخ سیاہ گندم کا چھوٹا سا پھول معنی خیز لیکن اتنا عام نہیں۔ سبزیاں بھی یہاں بہت کثرت سے اگائی جاتی ہے ان کے سنہرے پھول پتیاں سکھا کر کھائی جاتی ہیں۔نگر کے پھل اچھے نہیں ہیں کیونکہ لوگ بہت سست اور کاہل ہونے کی وجہ سے محنت سے جی چراتے ہیں۔ دوسری طرف ہنزہ جیسی یہاں دھوپ نہیں پڑتی ہے جس کی وجہ

سے پھل بہتر نہیں ہوتے ہیں۔

نلت سے نکل کر سیدھے نیچے تھول، جو اپنے بدھ سٹوپا کی وجہ سے شہرت یافتہ ہے۔ یہاں سے گزر کر غلمت پہنچے جو کسی زمانے میں اس ریاست کا دارالحکومت تھا یہاں پر سید شاہ ولی کی زیارت کے ساتھ دیگر اہم لوگوں کے مقبرے ہیں۔ یہاں گری تھم اور ملک دین ،جن کو ان کے بھائی آزر خان نے 1891ء میں مار دیا تھا یہی دفن ہے۔

آستانہ اور مسجد کے ساتھ بہت سایہ دار چنار اور دوسری طرف گھنے باغات ہیں جہاں ہم نے کیمپ لگایاہے۔نگر کے حوالے سے میری یادداشت میں صرف اور صرف مکھیاں ہیں جنہوں نے مجھے بڑا تنگ کیاہے اس علاقے میں سب سے زیادہ مکھیاں یہی پر ہیں اس لئے ہنزہ کے لوگ کہتے ہیں کہ زیادہ مکھیاں ان گندے نگری لوگوں کی گندگی کی شہادت ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کیا ہنزہ میں مکھیاں نہیں ہوسکتی ہیں؟

ہم 'یل' میں سے گزرے یل(Yal) کے معنی چھاؤں کے ہیں جہاں سردی میں کوئی دھوپ نہیں پڑتی اس لئے کہ یہ گلیشیر کے ساتھ ہے۔ پھر پسن پہنچے، جہاں سے دریا کے اوپر کھری چٹانیں فصیل اور برج نما بہت دشوارگزار ہیں۔ دو سو فٹ نیچے دریا کے ساتھ بہت شفاف اور خوبصورت گاؤں ہے لیکن یہ کوئی صحت افزا مقام نہیں۔اس کے بعد ہی ہم مناپن (Minapin) پہنچے یہ دومانی کے اُونچے پہاڑی سلسلے کا آخری گاؤں ہے۔

موسم گرما کی تپتی دھوپ میں ایسے دیہات کے سفر کی خوبصورتی بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں۔لوگ گندے بیوقوف اور بے پروا نقال بندر کی طرح ہیں جن کو یہ تناظر ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ اوپر دومانی کے عظیم گلیشیر اور چوٹی کے ساتھ

برفانی چٹانیں ہیں جن کے نالے کے ساتھ چمکتی تیز دھار کے نیچے کثرت سے فصل اور پھل فروٹ کے باغات ہیں۔ اخروٹ کے چمکتے پتوں کے ساتھ دلنشین سرسبز خوبانی کے پھل کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ نیچے دریا کی طرف سخت کھدرے پہاڑ کے پیچھے ہنزہ ہے۔ اس تمام منظر کی شان وشوکت کا ہم پلہ پورے ہمالیہ میں نہیں۔ اس طرح کی بلندی کے ساتھ کوئی پہاڑی سلسلہ نہیں جہاں سے عموداً سب نظاروں کو دکھا جاسکے۔

نگر کے لوگ بڑے سست کاشتکار ہیں وہ اپنی ذرخیز زمینوں سے اتنا نہیں اُگا سکتے ہیں جتنا کہ اُس کی صلاحیت ہے۔ یہ لوگ محنت کم کرکے زیادہ پیداوار کی توقع رکھتے ہیں مگر پیداوار اتنی ہی ہوتی ہے جتنا وہ کام کرتے ہیں۔

مناپن کے مقام پر ہنزہ کے مخالف سمت ایک خستہ حال قلعہ ہے۔ اس قلعے پر نظر پڑتے ہی دولت شاہ کی انکھوں میں انسو آگئے کیونکہ کچھ عرصہ پہلے ان کا نانا ادھر اچانک قتل کیا تھا۔ ہنزہ نگر میں مسلسل دشمنی کی وجہ سے ماضی میں ایک دوسرے پر چھپ کر گولیاں چلائی جاتی تھیں جس کے نتیجے میں بہت سی جانیں ضائع ہوتی رہی، خاص طور پر کھیتوں میں کام کے اختتام پر زندگی اجیرن رہتی تھی۔ اب یہ سلسلہ تبدیل ہوا ہی تھا کہ(بقول دولت شاہ) ایک دن دریاکے پار ایک گائے نے بچھڑے کو جنم دیا گائے دریا پار کرکے ہنزہ کی جانب آئی اور بے چارہ بچھڑا پار ہی رہ گیا۔ دولت بیگ کا نانا بچھڑے کو گائے سے ملانے کی غرض سے دریا پار کر گیا تو نگر والوں نے فائر کر دیا جس کا وہ نشانہ بن گیا۔ جب وہ دریا کے پار گئے تو نگریوں نے فائر کرکے ان کو نشانہ بنایا۔ اس کا بھائی حیدر بیگ قریب ہی ہنزہ کے قلعے میں تھا۔نگر والے قہقہے لگاتے ہوئے حیدر بیگ کو پکارنے لگے 'ہاہا ،'ہم نے ایک مارخور کا شکارکیا ہے۔ آؤ یہاں آکر اس کا گوشت لے جاؤ

کیونکہ تمہارا بھائی گائے کے لئے نہیں بلکہ کسی اور کام سے آیا تھا ہم جانتے ہیں کہ اُن کو گوشت پسند تھا'۔ اس واقعے کے بعد حیدر بیگ نے دریا پار کیا ان پر حملہ کرکے اپنے بھائی کی لاش کو واپس اس طرف لایا۔ اُس دوران بھی انہوں نے بہت فائرنگ کی کچھ گولیاں اُن کے لمبے بالوں پر لگیں جس کی وجہ سے وہ کافی زخمی بھی ہوا لیکن اپنے بھائی کی لاش کو اس طرف نکالنے میں کامیاب ہوا اور ان کی تدفین کی۔ وہ بدلہ اورانتقام لینے کی تاک میں رہا۔ کچھ دن بعد اُس نے دیکھا کہ نگر کے دو ہٹے کٹے نوجوان لڑکے دریا کے کنارے اپنے مویشی چرا رہے ہیں اُس نے اُن کا انتظار کیا جب وہ آرام کرنے کے لئے ایک جگہ بیٹھ گئے تو حیدربیگ نے پھرتی سے دریا پار کیا اور اُن دونوں کو رسی سے باندھ کر اِس پار نکال لایا۔ یہ ناقابل یقین کام تھا لیکن حیدر بیگ اپنی قوم کی طرح قوی چست وچالاک تھا۔ وہ اُن لڑکوں کو لیکر میر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میر نے زبردست انتقام لینے کے بدلے انعام میں ایک چغہ اور لمبا کوٹ دیا اور دونوں لڑکوں کو قیدی غلام بنا کر پامیر میں دو تفریحی کتوں کے عوض بیچ دیا۔ہنی کے مقام پر ہم حیدربیگ کے پوتے سے ملے۔'اُن کو دیکھو' دولت نے کہا،' سادہ اور شریف النفس انسان بہادر دلیر شخص کی اولاد ہے'!۔

مناپن سے آگے راستہ دوحصوں میں بٹ جاتا ہے ایک ہنزہ کی طرف اور دوسرا آگے نگر(خاص) تک پہنچتا ہے اسی ریاست کا مرکزی مقام ہے اور یہی 1933ء میں ہماری منزل تھی۔ ہمارے مخالف سمت میں آگے کی جانب ہنزہ کا علاقہ ہے۔ہم نے دیکھا کہ نگر کی طرف بہت عمدہ نقش ونگار والے مکانات تعمیر ہوئے ہیں جن میں خاص طور پر اسکرداس کے نمبردار کا گھر اور شایار (Shayyar) کی مسجد شامل ہیں جن کو شاندار آرائشی لکڑی کی تعمیرات کی مثال کے طور پر پیش کیا

جاسکتا ہے۔

دیہاتی جگہوں میں عموماً ہمیشہ سکوت ہوتا ہے ۔ہم بہت سارے باغات اور کھیتوں میں سے گزرکر نگر کی طرف گئے جہاں بہت سے کھیت چٹانوں کے گرنے کی وجہ سے خراب ہوئے تھے۔عموماً بالائی نگر کے علاقے کا راستہ بہت ڈھلوان پر ہے جس کی وجہ سے پھسلنا پڑتا ہے۔ کئی مقامات پر ہزاروں ٹن وزنی چٹانیں کھیتوں میں گر پڑی ہیں جو دیکھنے میں گھروں سے بھی بڑی نظر آتی ہیں۔ ان چٹانوں کے گرنے کی وجہ سے نہروں اور کھیتوں کو بہت نقصان پہنچا ہے اب ان کی مرمت بھی نہیں ہوسکتی ہے۔اتنا ملبہ پڑا ہوا ہے کہ کوئی پرسان حال نہیں سب ضائع ہوچکے ہیں۔نگرخاص موجودہ ریاست کا دارالحکومت ہے جو بہت تنگ گھاٹی میں واقع ہے۔ان پہاڑی چٹانوں کی وجہ سے نگر خاص کا رہائشی گاؤں بہت کم رہ گیا ہے۔ کچھ نیچے ان کا قلعہ تھا جو ابھی خستہ حال پہاڑ کے ساتھ کھلے چھپر کی طرح غلیظ پڑا ہے۔ یہاں پر ایک خستہ حال تالاب بھی ہے جس کے بارے میں نگری کہتے ہیں کہ یہ بہت گہرا ہے اس لئے وہ کبھی اس میں نہاتے دھوتے نہیں۔ قلعے سے تھوڑا اوپرایک شاندار پولو گراؤنڈ ہے جس کے ارد گرد چنار کے سایہ دار درخت ہیں اورساتھ بڑی بڑی تین مساجد بھی ہیں۔ تھوڑا اوپر (Dongsir) ڈنگسر کے مقام پر کھرنی کے ساتھ ان کے حاکم کا قلعہ بنا ہے۔ قلعے کی ایک طرف نگر دوسری طرف زمینی چٹان جنوب کی طرف سخت گیر اترائی کے بعد پولو گراؤنڈ ہے۔ ایسے نازک غیرمعین جگہ پر قلعہ کی تعمیر دیکھ کر میں دنگ رہ گیا اور خیال آیا کہ جلد یا بدیر یہ عمارت دریا کی جانب دھنس جائے گی۔ قلعہ کی مشرق کی جانب بلتستان ہے یقیناً زبردست منظر کی وجہ سے سیاحوں کو بہت جاذب نظر لگتی ہے۔ شمال جنوب اور مغرب کی جانب کوئی خاص نظارہ نہیں ہے۔ چٹان کے ساتھ ہی ایک بڑے امام

بارگاہ کی عمارت ہے جو بہت منفرد نہیں البتہ ایسے دور علاقے میں بڑی معقول بات ہے، اس کے ساتھ ایک مسجد بھی موجود ہے۔نگر کے لوگوں کے بارے میں یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ یہ بہت عقیدت مند شیعہ (اثناعشری) ہیں۔ قلعہ کے نیچے میر کا محل ہے جو بہت ہی شاندار اور قابل رشک آرام دہ عمارت ہے۔ ہر چیز غیر یقینی طور پر عمدہ اور سلیقہ کے ساتھ مزین تھی۔ یقیناً سب عمارتیں ایسی اونچی چٹانوں سے بنائی گئی ہیں کہ اس تنگ وادی میں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

نگر کے میر یاتھم شاہ سکندر خان اپنے حریف ہنزہ خاندان کی اولاد میں سے ہے مگر حالات نے ان دونوں شاخوں کو بہت دور دھکیل دیا ہے جس کا ادراک ابھی ممکن نہیں۔

موجودہ میر(1933ء) بہت ہی خوبصورت' لمبے اور نرم وملائم چہرے کے ساتھ اٹھسٹھ (68)سال عمر کے ہیں۔ موصوف عمدہ شکاری اورعقیدت مند مسلمان ہیں۔ دور دراز علاقہ میں رہنے کی وجہ سے میر کے یہاں کم سیاح (مہمان)آتے ہیں ساتھ دورافتادہ ہونے کی وجہ سے یہ ناتجربہ کار اور ہنزہ کے میر کی نسبت کم موقع پرست ہیں۔ اپنے مقامی معاملات اور ریاستی امور میں مصروف رہتے ہیں ملکی معیشت کی حالت اور انتظامیہ کے لوگ بھی انہی کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ سب کچھ خود تک محدود رکھ کر مطمئن بھی ہیں۔ یہ تمام باتیں ان کے ہمسائیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک چیز پر وہ بہت زیادہ فخر کرتے ہوئے ہر وقت کہتے ہیں کہ میں اسکندراعظم

(Alexander the Great) کی اولاد میں سے ہوں۔ مجھے تین دفعہ سے زیادہ بتایا کہ وہ قدیم مقدونیہ سے نسبت رکھنے والے اسلاف کے وارث ہیں۔میں نے بڑی شائستگی اور احترام سے سب کچھ تسلیم کرتے ہوئے اُن کو اِس چیز پر

مبارکباد دینے کی جسارت کی۔شاید میر صاحب اپنی پروفائل کو یونانی سکہ کی طرح بلند اور اعلیٰ سمجھانے کے لئے ملاقاتیوں سے یوں چالاکی سے پیش آتے ہونگے۔ مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاہم اس روایت کا شکریہ جس کی وجہ سے کافی قدیم چیزیں تازہ ہوگئی اور ہماری گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا ایسی متنازعہ روایت کے بارے میں محتاط گفتگو ہونی چاہئیے۔

محل کے آرام دہ کمرے میں گفتگو کا بڑا مزہ آیا لیکن میزبان کے ساتھ گپ شب میں مجھے کافی دقت محسوس ہوئی۔ جب بات شرقیہ(مغرب والے) کی ہو تو مجھے ہر دفعہ پہل کرنی پڑتی تھی یہ سلسلہ بڑا اُکتادینے والا ہوتا تھا۔ ماضی میں کئی دفعہ ہنزہ آنے جانے کے باوجود نگر خاص نہ آنے کی وجہ یا تو اپنی سستی تھی یا پھر اس علاقے کا عام رستے سے ہٹ کر واقع ہونا تھا۔ اس کے باوجود نگر کی دو اہم خاصیتیں نایاب ہیں۔ ان میں سے پہلی اذانِ فجر ہے جس سے موذن یا ملا نماز کے لئے صبح سویرے بلاتا ہے۔

موسم خزاں کے اوائل کی مختصر راتوں کے دوران اس طرح کی گڑگڑاہٹ کی انہونی آواز سن کر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن یہ سب کچھ اللہ کی مدح و توصیف کے لئے تھا اس لئے سب سے پہلے میں جاگا تھا۔'اللہُ اکبر' اللہُ اکبر' اللہ سب سے بڑا ہے! اللہ کی صدا اتنی گونجتی رہی یہاں تک کہ برف کی چوٹیوں تک پہنچ گئی۔ ایسا لگا کہ لوگوں کو مجبور کرکے ایسی عظیم والشان بجاآوری(عبادت) کے لئے آمادہ کیا جاتاہے۔ بحیثیت عیسائی اٹھنا اورمسجد ڈھونڈنا میرے لئے کافی تکلیف کا باعث تھا اس لئے میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ سوائے میر کوئی نگری نماز پڑھنے جانے والا نہیں۔ یہاں تک کہ میرا باورچی بوڑھا عزیزو جو اپنے راسخ الا عتقادی کے حوالے سے کافی سخت ملا ہے وہ بھی دست کش ہوا یہ ایسا ملا ہے جس

کے خراٹوں کی صدا پورے ایشیا میں سب سے زیادہ ہوسکتی ہے۔

میر کے پاس تصاویر کا ایک دلچسپ البم موجود ہے؛ جو اُس نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے دکھایا یہ اُس وقت کی تصاویر تھیں جو سرینگر میں لاڈ منٹو اور اُس کی بیگم کے دورے کے موقع پر لی گئی تھیں۔ تصاویر میں موجود عورتیں بڑی بڑی ٹوپیوں کے ساتھ high-necked dresses میں ملبوس تھیں یہ لباس اُس زمانے میں مشہور تھا۔ میر نے نفاست کے ساتھ کہا' آہ'، 'عورتوں کا وہ فیشن آج کی نسبت بہت اعلیٰ تھا' میں نے سرِتسلیم خم کیا۔

وزیر تیفور ایک بزرگ مہمان نواز اور بہت بڑی عمر کے دلچسپ آدمی ملے جس نے عرصے سے وزیر اعظم کی ذمہ داری اٹھا رکھی ہیں۔ میں ان کو کافی عرصے سے جانتا ہوں اس لئے وہ میرے پاس آئے اور اپنی سرخ داڑھی ہلاکر اپنے کشمیر کے سفر کے بارے میں کافی گفتگوکی جہاں وہ اپنی آنکھ کے عدسہ کے علاج کے لئے گئے تھے۔ میں نے توجہ سے ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی کیونکہ وہ بڑے عالم تھے لیکن حالات ہماری گفتگومیں خلل انداز ہوتے رہے اس لئے کافی بور ہوکر فضول ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔اگر تیفور عوامی خدمت نہ کرتے تو یقیناً وہ ایسے داستان گو نہ ہوتے۔

نگر سے عموماً ہسپر کی چوٹی دیکھنے کی مہم مروجہ ہے جہاں سے گلیشیر کا نظارہ بالکل خشکی سے معدوم ہوکر بے لطف منظر پیش کر رہا ہے۔ ہم ہوپر سے آگے میدانی علاقہ (Ghutum) کی طرف نکلے جو بہت وسیع سیلابی زمین ہے یہ علاقہ آبپاشی کے لئے مناسب ہے لیکن لوگ اس میں کوئی خاص کاشت کاری نہیں کرتے ہیں۔ ہم مشہور بزرگ شاہ بریا(Shah Buria) کی زیارت کے پاس پہنچے۔ یہ بزرگ یہاں ہوپر(Hopar) میں بلتستان سے آئے تو لوگ ان سے

بہت بدتمیزی سے پیش آئے۔ یہ بات حیران کن ہے کہ کیسے کینہ پرور مشرقی فقیر ہے اور کس طرح غیر مہذب اور عاقبت نا اندیشی سے یہ دیہاتی ان کا استقبال کرتے ہیں؟ شاہ بڑرا نے ہوپر کے لوگوں اور زمین کو بدعادی۔اس لئے اس علاقے میں وسیع پیمانے پر فصل پکتی ہے لیکن کاٹنے اور گاہنے کے بعد جب فصل کو گھروں میں اناج کے صندوقوں کے اندر رکھتے ہیں تو وہ بتدریج کم ہو جاتی ہے۔ اناج کو وہ جتنی احتیاط کے ساتھ محفوظ رکھتے ہوں موسم بہار کی آمد سے پہلے پہلے فروری کے مہینے تک خودبخود ختم ہوجاتی ہے۔ حقیقتاً یہ طاقتور بدعا ہے جو صدیوں تک موئثر رہی ہے۔

ہوپر کے قریب اُس بزرگ کا ساتھی ایک شگاف میں گرگیا تھا۔ ولی اللہ نے اپنے عصا کو اُس شگاف میں ڈال دیا تو آدمی صحیح سلامت گلیشیر کے کنارے کچھ دیر میں نکل آیا۔

شاہ بریا نے شاہی پولوگراؤنڈ کے ساتھ زیارت میں نماز پڑھنے کی خواہش کی لیکن ان کو وضو کے لئے پانی نہ ملا تو اپنے عصا کو زمین پر مارا جس سے اس جگہ پر پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا اور ہرطرف کیچڑ کی وجہ سے نماز پڑھنے کے لئے جگہ نہیں مل سکی آپ نے مصلا کی خواہش کی تو ایک پتھر نمودار ہوا جس پر بیٹھ کر آپ نے نماز کے لئے اپنے ہاتھ رکھے اور گھٹنوں پر جھک گئے جس کے نشانات آج تک موجود ہیں۔ اگرچہ وہ پتھر وہاں نہیں تاہم نگر کی آبادی اورفساد کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی مراقبے اور عبادت کی طرف توجہ کم رہی تو آہستہ آہستہ اُس کو کھیتوں سے پیچھے لے جایا گیا یہاں تک کہ آج وہ قریبی پہاڑی چٹان کے اوپر حفاظت کے ساتھ نصب ہوکر نگر کے جھگڑالو لوگوں سے دور محفوظ ہے۔ تاہم زیارت اور چشمہ پولوگراؤنڈ کے ساتھ ہی ہے۔ بزرگ کو غیر دوستانہ طور پر غلمت میں

دفنایا گیا ہے۔

میر اسکندر اور اس کے دارالحکومت کی مذیدار سیر وسیاحت سے فارغ ہوکر ہم وہاں سے آگے نکلے۔نگر کوئی دلچسپ جگہ نہیں بلکہ دور افتادہ علاقہ ہے۔میر کے ذاتی پولوگراؤنڈ کے ادرگرد برفانی چٹانیں ہیں جن سے پانی بہت زیادہ نکلتا ہے جس کی وجہ سے اُن کی اولاد اور خادم سب کے سب بیکار گھومتے نظر آتے ہیں۔نگر یقیناً سردیوں میں ایک افسردہ تنگ گھاٹی اور ہمیشہ سنسنی خیز قیدخانہ سے کم نہ ہوگی۔موسم سرما کے بعد نگر قراقرم کے عقب میں ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح پرسکون علاقہ لگتا ہے۔

باب نمبر9

ہنزہ

نگر کی سیر کے بعد ہم کوے کی اُڑان بھر کے ایک دن پیدل سفر کے بعد ہنزہ پہنچے جو کافی قریبی علاقہ ہے۔ دریائے نگر کو دو رسیوں والے پل سے پار کیا، اس ریاست کی دیگر چیزوں کی طرح اس کی حالت بھی قابل مرمت تھی۔ کشادہ دریا کے درمیان بڑی چٹان کے ساتھ حقیر سا عارضی رسی کا بنا پل خستہ تھا۔ پُل پر قلیوں نے بوجھ کے ساتھ کافی وقت لگا کر آرام آرام سے دریا کو ایک اچھے معلق پُل سے پار کیا اور گنش گاؤں کے قریب ہنزہ میں داخل ہوگئے۔ یہ دلچسپ اور خوبصورت گاؤں ہمارے دوست عبداللہ بیگ کا ہے۔ اس کا گھر چٹان کے کنارے پر دریا کے اوپر ہے۔ پرانی مسجد کے بلند مینار سے پوری وادی کا منظر دلچسپ چنار اور دیگر درختوں سے مزین نظر آتا تھا۔ قدیم زمانے میں گنش کے لوگ نگر پر حملے کرنے کی وجہ سے حملہ اور لوٹ مار میں ماہر ہو چکے ہیں۔

ہنزہ کے میر کے پاس کوئی ممتاز مہمان رہائش پذیر ہوتا تو میر اپنے بندوں کو نگر بھیجتا تھا جو پار جا کر دو یا تین آدمیوں یا لڑکوں کو پکڑ کر لاتے جن کو میر اُس مہمان کی خدمت میں پیش کرتا تھا۔ اس عملی تحفہ کی بہت تعریف کی جاتی تھی۔ اس مفید کام کے لئے میر کوئی قیمت نہیں دیتا تھا۔نگر والے بہت کمزور ہونے کی وجہ سے اپنا دفاع کرنے اور بدلہ کی طاقت نہیں رکھتے تھے جس کا فائدہ اٹھا کر ہنزہ والے ان کو اغوا کیا کرتے تھے جس کا کوئی حل نہ تھا۔ مغوی قیدیوں کو پامیر اور یارقند میں لے جا کر ایک بکری یا پرانے کھال کے عوض فروخت کر دیا جاتا تھا۔

گنش سے راستہ چڑھائی میں شُریس (Suriyas)یا کریم آباد تک پہنچتا

ہے جہاں میر گرمیوں میں رہتا ہے۔ یقیناً ہنزہ کے لئے نگر سے سیدھا راستہ مناپن کے مقام پر ہے لیکن وہاں کا پل چار سال پہلے اندھی کی نظر ہو چکی ہے جس کی وجہ سے ہم دریا کے کنارے گول گول چکر کاٹ کر مشکل سے پہنچے۔ ڈھلوان جگہ زیادہ اترائی کی وجہ سے کافی پھسلن کا مسلہ تھا اور ساتھ سڑک ٹوٹ پھوٹ ہو چکی ہے۔ دریا کے ساتھ پہاڑی میں گندھک کے کثیر ذخائر موجود ہیں جس سے بہت ناخوشگوار بو آتی ہے۔گندھک کے نرم گوشے راستہ بنانے کے لئے مناسب ہیں۔ تشوٹ کے نزدیک گرم چشموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں آتش فشاں پہاڑ کے آثار ہیں۔نگر سے ہنزہ جاتے ہوئے مرتضیٰ آباد کے قریب یاقوت کی سخت پہاڑی ہے جہاں اُنہیں چنا بھی جاسکتا ہے۔ یہ قدیم زمانے میں بندوق کی گولیوں کے ساتھ کبھی سیسہ اور غلاف بنا کر چھپائی کے کام میں بھی استعمال ہوتے تھے بہر حال یہ حالیہ دریافت معاملہ ہے۔ میں نے ان سے کچھ جمع کیا۔ یہ دیسی ساخت کے گولیوں کی طرح ہیں جو توڑے دار بندوق میں استعمال ہوتے تھے۔ یہ وہی گندھک کی گولیاں تھی جن سے 1891ء میں کرنل الجیرنڈ ڈیورنڈ کو نلت کے مقام پر زخمی کیا گیا تھا۔

اگرچہ میں کئی بار ہنزہ آچکا ہوں لیکن دریا کے ساتھ آٹھ میل لمبا اور چار یا پانچ میل چوڑا زرعی قطعہ ہر دفعہ دلکش اور خوبصورت لگ رہا ہے۔ ایک ایک انچ زمین پر قطار در قطار کھیت ڈھلوان چڑھائی اور اونچی اترائی کے ساتھ بنے پٹی دار کھیتوں میں قطار کے ساتھ سفیدوں کے درخت پھلدار درختوں سے اونچے نظر آتے ہیں۔ ان سے اوپر ڈھلوان اونچائی میں پہاڑ کے ساتھ انتہائی سخت بنجر زمین پڑی ہے جہاں نباتات یا سبزے کے کوئی نشان نہیں ہر طرف کراہت امیز خشک جگہ ہے۔ اس بھورے رنگت کی خالی بنجر زمین کے اوپر نرم وملائم برف کی سخت گیر

چٹانیں فصیل کی طرح بڑی عظمت کے ساتھ چوٹی پر کھڑی ہیں۔ ویران پیچ دار اور بنجر کشادہ کالے پہاڑوں کے درمیان گہرے شگاف کی طرح ان پر بنا کوہل نظر آتا ہے جس پر یہاں کے رہنے والوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ان میں سب سے بڑا کوہل بربر (Berber) کا ہے جو ایشیا میں مشہور ہے اس کی لمبائی چھ کلومیٹر ہے اور اس میں بہت عظیم مہارت سے کام ہوا ہے۔

اس کے بعد ثمر قند (Samarcand) کا کوہل ہے۔ اُلتر (Bultur glacier) گلیشیر سے پانچ کوہل مشرق کی طرف اور چار مغرب کی طرف نکالے گئے ہیں۔ ان تمام کوہلوں کو مقامی کسانوں نے اپنے ذہن اور ترکیب سے مارخور کے سینگ پتھر اور دیسی طریقوں سے نکالا ہے ان میں کوئی سائنسی طریقہ یا ٹیکنالوجی استعمال نہیں ہوئی ہے۔یہی کوہل ہنزہ کے لوگوں کو دوسروں سے ممتاز کر دیتے ہیں۔

ان کی قدیم آبپاشی کی مہارتیں رَمنج چپرسن کے کوہل میں استعمال ہوئی ہیں جو دس سال پہلے بنائی گئی تھی اب تک ان کی مہارت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ بہت شاندار آرٹ ہے۔۔۔اس لئے باقی ہے۔ اُس کوہل کو نکالنے میں پانچ سال اور آٹھ آدمیوں کی جانیں گئیں جن میں سے چھے کو چٹان کے اوپر ہی دفنایا گیا ہے۔کوہل بہت باریک تنگ وپیچ گھاٹی سے نیچے دو میل لمبا بنایا گیا ہے۔ ندی سے پانچ سو یارڈ بلندی پر عمودی چٹانوں سے لٹکتے چھید نکال کر پانی کے منبع تک بڑی ہوشیاری اور ہنرمندی سے تراشی گئی ہے تاکہ پانی نکلنے یا کوہل کے ٹوٹنے کا کوئی خدشہ نہ ہو۔ اس میں پانی ایسے روانی سے آتا ہے کہ کوئی بھی ہنرمند انجینئر ان دیہاتیوں کے کام کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ کوہل کے کنارے کا راستہ بہت باریک' پیچیدہ اور دشوار گزار ہے چٹانوں کے ساتھ بڑی احتیاط سے پکڑ پکڑ

کر گزرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے گھاٹی کی گہرائی کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔جہاں سلنٹی پتھر گرنے کا خدشہ ہے وہاں انہوں نے مہارت کے ساتھ زمین دوز سرنگ بنا لئے ہیں وہاں سے گزرتے ہوئے احتیاط برتنی پڑتی ہے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ہنزہ کس موسم میں سب سے زیادہ خوشنما لگتا ہے۔موسم بہار کے اوائل میں جب درختوں کے پھول کھلتے ہیں یا موسم خزاں کے آواخر میں جب خوبانی کے پتے سرخ سندور دلربا ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں موسم گرما کے عروج پر ہی یہاں کے مناظر عظیم دلکش اور حسین ہوتے ہیں۔تیار فصل زردی مائل رنگ لیے صبح کی خنک ہوا سے لہلہاتی ہے اور درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جھکی فطرت کا یہ حسین منظر ہر طرح سے قابل دید ہوتا ہے۔موسم خزاں میں جب فصلیں ختم ہوتی ہیں تو کھیت پھیکے اور خالی پڑ جاتے ہیں بس یہی سے موسم سرما کا آغاز ہوتا ہے۔

نگر میں زمین اور پانی کی کثرت کے ساتھ قدرتی وسائل بھی زیادہ ہیں لیکن یہاں (لیکن) ہنزہ میں زمین کی زبردست دیکھ بھال کے باوجود پیداوار کم ہے۔ آبادی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے وسائل کی کمی ہوتی جارہی ہے اس لئے بہت محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

میر یا تھم گرمیوں میں کریم آباد میں رہائش پذیر ہوتے ہیں جبکہ سردیوں میں پرانے قلعہ بلتت تشریف لے جاتے ہیں۔ گرمیوں کا وقت اچھا گزرتا ہے کیونکہ ان کے پاس مہمانوں کے لئے اچھی دیوار کے ساتھ بہترین بنگلے اور کشادہ باغات ہیں۔ اس لئے میر اپنی تسکین کے لئے ہر کارکن پر اپنی گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔میں کبھی کبھی اُن کی نظروں اور نگرانی سے بھاگتا تھا لیکن کوئی مخبری مجھے پسند نہ تھی اس لئے میرے ساتھ سخاوت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ کریم آباد میں پھل

سبزیوں اور پھولوں کی بہت کثرت ہے۔

میر باغ بانی کے بہت شوقین تھے اس لئے باغبانی میں نہ صرف گہری دلچسپی رکھتے بلکہ ایسا کام کرنے والوں کو داد اور کوتاہی کرنے پر ان کو شدید تکلیف ہوتی تھی۔ مجھے عموما بوڑھے میر کے ساتھ اُن کے باغ کی سیر پر پھولوں کے بارے میں بڑے تبصرے سننے کا بڑا مزہ آتا تھا۔

موجودہ میر محمد نظیم خان گلگت ایجنسی میں بہت عظیم شخصیت کے مالک ہیں جیسے ان سے پہلے اُن کا وزیر ہمایون بیگ تھا۔1933ء میں وہ پچھتر (75) سال کے ہونے کے باوجود بہت قوی اور طاقت ور ہیں۔ اُن کے بائیں آنکھ کا عدسہ دھندلا ہونے کے باوجود وقت نے کچھ اور مہربانی کی۔ وہ جانتے ہیں کہ دوسرے حکمران بھی ان کی بہت تقلید کرتے ہیں۔ ایک دفعہ مجھ سے کہا 'کیوں؟'، میں اگر دریا میں چھلانگ لگاؤں تو میر آف نگر بھی ایسا ہی کرینگے۔ میر بہت مہمان نواز اور اُن کی انتظامیہ بھی شاندار تھی۔وہ اپنی مادری زبان وخی اور بروشسکی کے ساتھ فارسی اور ہندوستانی زبان بھی بولتے تھے۔ وہ بڑے فطرت پسند اور ہمعصر سیاست کو ہوشیاری اورزیرکی سے سمجھتے تھے۔ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے، جوکوئی یہ سمجھتا ہے کہ زندگی میں کامیابی کا دارومدار ان دو پڑھنے اور لکھنے پر ہے ہنزہ کے میر کے پاس کچھ دن رہ کر ان کی رائے بدل سکتی ہے۔ میں کبھی بھی ان کے وسائل اور کاروباری مہمات کو دیکھ کر حیرت کا شکار نہ ہوا۔ ایک دن مجھے اپنا 'پتھر والا بنگلہ' دکھایا جس کو انھوں نے کتابوں سے تصویریں دیکھ کر لندن کے گرجاگر کی طرز پر تعمیر کروایا ہے۔ نئے تعمیر شدہ مہمانوں کے کمرے میں روس سے سستے بیل بوٹوں والے کپڑے سے چھت بنوائی ہے۔ سونے اور چاندی کی کشیدکاری' دستکاری کے کام' فرنیچر اور دیگر دستکاری کے اصلی نمونے دکھائے جو ان کے ہنرمندوں کی بہترین

محنت کی عکاس ہیں۔ میرے پچھلے دورے کے موقع پر انہوں نے روس کے ایک آدمی کو قیدی بنایا تھا جو یہاں بیٹھ کر ان کے بندوں کوروس کے نرم ملائم لمبے چمڑے کے جوتے بنانے کی مہارت سکھارہے تھے۔

بوڑھے میر اپنے چھوٹے بیٹے امین خان کی اچانک ایک بندوق سے موت پر بہت افسردہ اور نڈھال تھے۔ میں اس بچے کو جانتا تھا یقیناً میر صاحب کا دکھ حق بجانب ہے۔ ان کے دوسرے بچوں نے ان کے غم کو کم کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ امین خان کی طرح باپ کی شفقت نہ پا سکے۔

میر بڑے آزاد خیال تنقیدی آدمی ہیں وہ اپنے ہمسایہ حکمرانوں خاص طور پر اپنے بھائی اورقریبی حاکموں سے ڈرتے ہیں۔ میر کے منتظمین اور نمائندے بڑی احتیاط اور زیرکی سے انہیں آس پاس کے ہر معاملے کے بارے میں باخبر رکھتے ہیں اور وہ خود بھی تحمل کے ساتھ ان خبروں کی صحیح جانچ پڑتال کرتے تھے کیونکہ بیشتر خبریں ان کے مہم جو فسانہ بنا کر پیش کرتے جن کے خلاصوں کی چھان پھٹک ضروری ہوتی ہے۔ میں بعض اوقات اس سوچ میں رہتا تھا کہ میر اپنے اُن اطراف کے بارے میں سخت ہوشیار رہتے ہیں جہاں ان کا کوئی مدمقابل نہیں۔ اُن کی معلومات تک رسائی انتہائی وسیع ہونے کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی معاملات کے علاوہ گلگت ایجنسی کے بارے میں ان کا مستقل مستعد ٹیلیفون بہت باخبر رہتا تھا۔

میر آف ہنزہ بہت بڑے راوی اور داستان گوہیں اس لئے وہ بہت زیادہ معیاری چیزیں بولتے بولتے چپ نہیں رہ سکتے ہیں ان کے اسلوب و بیان اور آواز میں کبھی کمی بیشی نہیں رہتی ہے۔ کہانیاں وسیع مواد کے ساتھ بلا تکرار اس طرح سناتے ہیں کہ سننے والے کوئی تھکن محسوس نہیں کرتے حیرانگی یہ کہ ان کی

باتوں میں مٹھاس ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔

ہنزہ میں دکانیں نہیں میر نے پہلے ہی ان کو مضر قرار دیکر بندکروایا ہے مگر ایک دکان خود کھول رکھی ہے جہاں سے ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں۔ ماضی میں دکانین بہت تھیں۔ کسی زمانے میں یہاں ڈاکخانہ بھی تھا لیکن میر نے چھ مہینے تک بائیکاٹ اور احتجاج کرکے نہ اس میں کوئی خط اور نہ ہی پیسے وغیرہ بھیجے جس کی وجہ سے اُس کو بھی بندکرنا پڑا۔ ابھی میر نے یہ کام بھی شروع کیا ہے اس معاملے میں وہ شفیق باپ کی طرح ہرمعاملہ خود کرتے ہیں!

میر عام فہم آدمی ہیں شاید یہ خاصیت اُن کی کسان ماں کی طرف سے میراث میں ملی ہے۔ میرے خیال میں وہ وقت کے ہاتھوں تھکے ہوئے ہیں، عموماً پہاڑی لوگ اور ان کے حکمران ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن اُن میں یہ بڑے غیرمعمولی آدمی ہیں۔ پہلے ہمایون بیگ کی موجودگی میں نوجوان میرکچھ بھی کرنے کی اتنی ہمت نہیں کرسکتے تھے وہ ان کے وزیر ہونے کے باوجود بہت غلبہ رکھتے تھے۔ اُن کی وفات کے بعدمیر آف ہنزہ ہی بادشاہ ہے کوئی ایک لفظ کہنے کی جرات بھی نہیں رکھتا ہے۔ اُن کے دل میں رعایا اور ان کی فلاح کے لئے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ مگر وہ اپنی رعایاکے ان نوجوانوں کو یہ بتانے میں ناکام ہوئے کہ دورافتادہ پہاڑی ریاست میں زندگی کا انتظام اور نوجوانوں کومطمئن کرنا کتنا مشکل ہے جن کا خیال ہے کہ سرکار میں کام کرنے کے بعدبھاری پنشن لو اور مزے کرو۔۔۔ ان کہانیوں نے پہاڑی جفاکش بھوکے لوگوں کو یہ باور کرایا ہے کہ سرکار برف کی ندی کی طرح ہے۔ تاہم میر ان لوگوں سے نفرت کرتے ہیں جو وادی چھوڑدیتے ہیں۔ وہ ان کو بالکل بھی کھونا نہیں چاہتے جو کاریگارکے طورپر کام کرتے ہیں بیشک کچھ نرمی ضرور کرتے تھے۔ ان وادیوں کے لئے کچھ نرم گوشہ

رکھتے ہیں جو ضروری اور کچھ نقدی رقم دیتے ہیں۔ یہاں پر کوئی اور آمدن نہیں آتی ہے۔لوگوں کے پاس کھانے کو کافی کچھ ہوتا ہے لیکن ترقی اور وقت کے ساتھ ان کی ضروریات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ہنزہ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خاص دنوں کے موقع پر چائے تک نہیں پی سکتے، ملازمت اور پنشن کی مد میں آنے والا انڈین روپیہ تھوڑا تھوڑا کر کے گاؤں کے ملازمین کو دیا جاتا ہے جس پر ان کا انحصار ہے اور اسی طرح سب ہمسایہ ریاستوں کی حالت خراب ہے ۔ جب سے ہنزہ والوں کو یہ احساس ہوگیا کہ وہ باقی ہمسایوں سے ذہین اور عقل مند ہیں وہ اپنی محرومی سے مایوس ہو چکے ہیں۔ کچھ نئی جگہیں آباد کرنے کے باوجود زمین کی قلت کی وجہ سے ریاست کو کافی مسائل درپیش ہیں۔ وہ بہت محنت بھی کرتے ہیں۔۔۔ لیکن اُن کی آبادی اپنے وسائل سے زیادہ آگے نکل چکی ہے۔ ہنزہ والوں کو ہجرت کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر جہاں بنجر زمینیں خالی پڑی ہے وہ ہنزہ کی ملکیت میں نہیں اور نہ ہی میر اپنی رعایا کو کسی اور کے ماتحت کام کروانا پسند کرتے ہیں۔ اس معاملے کا ایک ہی حل ہے کہ سرکاری وسائل اور نوکریاں بڑھا دی جائیں۔

میر کے ساتھ ایک شام کا کھانا بہت تجربے کا سبب بنا۔ ان کے باورچی بہت اچھے اور ان کے ہاتھ کی بنی ہو گھریلو شراب پانچ سال سے بوتل میں پڑی رہنے کے باوجود بہت اچھی اور لذیذ تھی۔ موسیقار لڑکے دوزانو بیٹھ کر مخصوص نغمے ترکی، فارسی اور دوسری زبانوں میں گایا کرتے تھے۔ میر صاحب لگاتار مختلف موضوعات پر بولتے جا رہے تھے۔ ان کو تاریخ میں وسیع معلومات تھیں جیسے کوئی کتاب پڑھ رہے ہو۔ اب بڑھاپے میں میر صاحب کا سب سے توجہ طلب مسئلہ معیشت کا ہے جس کے بارے میں وہ بڑے فکرمند رہتے ہیں۔ معیشت بڑھانے

کے لئے انہوں نے کافی اقدامات کئے ہیں یہ اقدامات ان کی رعایا کو پسند نہیں اس لئے وہ میر کے لئے بے گانہ ہوتے جارہے ہیں ۔

دوسرے مقتدر حاکموں کی طرح میر بھی خاندانی اور موروثی طور پر منتخب ہوتے ہیں اس لئے رعایا یہ سوچتے تھے کہ اچھے انتخاب سے ان کی خوشحالی اور برے انتخاب سے ان کو مشکلات آسکتی ہیں۔ میرے خیال میں کئی سال سے میر ان کے لئے اچھا رہا ہے؛ان کے طریقے ہمارے نہیں لیکن ان کی اہلیت اور دانشمندی پر کوئی سوال نہیں۔میری خواہش تھی کہ کاش وہ پہلے اپنے سیاسی آفسروں سے ہر معاملہ پر مشورے لیتے تاکہ ان کی صلاحیتیں اپنی ریاست کے لئے زیادہ فائدہ مند اور قدر افزا ہوتیں۔

میری میر آف ہنزہ سے آخری ملاقات مئی 1934ء میں ہوئی جب میر خاندان خاندانی شادی کی تقریب میں مصروف تھے۔ میر کے پوتے کی شادی میر آف نگر کی بیٹی سے اور میر کی بیٹی کی شادی میر آف نگر کے بیٹے سے ہورہی تھی۔ یہ شادی اور نکاح کا معاملہ اتنا آسان کام نہ تھا جتنا کہ نظر آتا ہے کیونکہ نگر کے میر شیعہ (اثناعشری) مسلک کے اور ہنزہ کے میر (شیعہ اسماعیلی نزاری) مولائی فرقے سے منسلک ہیں۔ شادی نگر والوں کی جانب سے بے تحاشہ مسائل کی وجہ سے ملتوی ہوتی رہی لیکن بلآخر جولائی کو طے پاگئی۔ ہنزہ کے میر نے قبل از وقت ضیافت کے پُرتکلف کھانے کے لئے ساٹھ(60) خوش گاؤ، تین (300) سو بھیڑیں اور ایک سو من گھی کا مہمانوں کیلئے بندوبست کیا تھا۔ بارات کے مہمانوں کے لئے انہوں نے ایک ترک درزی کو 180 لمبے سلک کوٹ کی سلائی کیلئے بٹھایا تھا۔ بوڑھے میر اس وقت بہت دلچسپی اور خوشی سے شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے حالانکہ وہ دونوں آنکھ کے عدسوں کی تکلیف میں مبتلا ہونے کی وجہ سے بڑی شدت

کے ساتھ Major Ledger کی آمد کے انتظار میں تھے، وہ ایجنسی کے سرجن ہیں جس نے ان کا اپریشن کرنا تھا۔ میں نے ان سے الوداعی تقریب میں شرکت سے معذرت کی۔ میرے مشرقی ملاقاتیوں میں یہ نایاب شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ مکمل متشرق اور باکمال ہیں۔ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ فی الحال ان کی توجہ معیشت پر مرکوز ہے۔ ان کی بڑی آرزو ''ہزہائی نس'' کا خطاب لینا ہے وہ یقیناً اس کا حقدار ہیں۔ انڈیا کے ان علاقوں میں تھوڑے بیہودہ اصول (ridiculous principles) ہیں جنہیں وہ جاری رکھے ہوئے ہیں ان وجوہات کی بناء پر خطاب نہ دینا کوئی جواز نہیں اس لئے ہنزہ اور نگر کے میروں کو یہ ملنا چاہئے۔

اُس وقت جب میر آف ہنزہ مرجائیں گے ماضی کی ان روایات کا سلسلہ بھی عنقریب ختم ہوگا۔ اگرچہ ہنزہ نامعلوم ریاست تھی لیکن میں یہ یقین سے کہہ سکتاہوں جب کوئی دھیان سے ہنزہ کی تاریخ کا جائزہ لے گا تو محقق کبھی بھی ہنزہ کے حکمرانوں اور لوگوں پر یہ بہتان نہیں لگاسکے گا کہ وہ وحشی اور غارت گرتھے۔ ایک وقت آئے گا ہنزہ کے لوگ میر آف ہنزہ اور انکی اہمیت کو بہت یاد کرینگے۔ اگرچہ ان کے پاس ان کے بارے میں بہت خدشات ہیں لیکن ان کے گزرنے کے بعد وہ ان کی کمی کو محسوس کرینگے۔

میر کے بڑے بیٹے غزن خان اب وسطی عمر میں داخل ہوچکے ہیں لمبی اور سرخ مونچھیں‘ صاف وشفاف چہرے کی رنگت کے ساتھ وہ اپنے باپ کی نسبت کالا نہیں جو اپنی داڑھی پر سیاہ ارغوانی رنگ لگاتے تھے۔

ہنزہ کا دارالحکومت بلتت بہت اونچی عمودی ڈھلوان پر تعمیر ہے سفیدی سے مزیں ان کا قلعہ کئی میل دور سے بھی نمایاں نظرآتاہے۔ یہ متجسس پرانا قلعہ بالکونی اور جھکی کھڑکیوں کی وجہ سے بہت شاندار منظر کا حامل ہے۔اسی میں میر کی

پوری جائیداد محفوظ ہے۔ قلعہ کے نیچے اناج کے گودام‘چکیاں اور دیگر سٹور بنے ہوئے ہیں۔ قلعے کی چھت پر ایک youdeni یا نمایاں ڈھول ہے جو دس انچ لمبے چھوٹے نقارہ کی طرح بنا ہے۔ مختلف تکالیف اور جنگ کی صورت میں اس ڈھول کو زور زور سے پوری رات بجایاجاتا ہے تاکہ پوری ریاست خطرے کی گھنٹی سن سکے۔ یہ اہم ڈھول آج کل نظروں سے غائب ہوچکا ہے۔میر نے ڈھول کو بہت تلاش کروایا مگر وہ نہیں مل سکا۔ میر کو یقین ہے کہ ڈھول چوری ہوچکاہے ہوسکتا ہے کہ وہ پونیال میں ہو۔ قلعے کے اہم آخری شفاف ڈھول کی گمشدگی پر وہ بہت رنجیدہ ہیں۔

بلتت قصبہ نہایت دلکش مکانات کے ساتھ قلعہ کی وجہ سے مشہور ہے۔ خاص طور پر وہ پرانی مساجد جو اس ریاست میں قدیم ترین تعمیرات کی زندہ ورثہ ہیں۔ ہنزہ اور نگر کی مساجد نقش ونگار کے حساب سے ملتے جلتے ہیں ان میں پھول کے ساتھ اصلی جیومیٹری کی اشکال واضح نظرآتی ہیں ابھی تک ان میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ ہنزہ کے لوگ اس ہنر میں پکے ماہرہیں اس لئے نقش ونگار بہت مہارت سے بناتے ہیں۔

یہاں مولائی (شیعہ اسماعیلی نزاری) اکثریت میں ہیں اور وہ مسجد کے بجائے جماعت خانہ میں عبادت کرتے ہیں ان کی جدید عمارتیں اتنی خوبصورت نہیں لگتی۔ مثال کے طور پر علی آباد میں ایک مہنگااسمبلی ہال (جماعت خانہ) بہت بڑا تعمیر کیا گیا ہے جو ان جیسا خوبصورت نہیں عام ہال کی طرح ہے۔گنش کے مقام پر اسماعیلیوں کی نسبت شیعہ (اثناعشری) زیادہ آباد ہیں وہاں ایک نئی مسجد اچھے طرز اور رنگ کے ساتھ روایتی مینار اور کھڑی سے مزین تعمیر ہوئی ہے لیکن اس کی تعمیر بھی نئی ہے۔ نقش نگاروں نے کندہ کاری کے کام کی جگہ رکھ دی ہے وقت کے

ساتھ تزین و آرائش ہوسکی تو یہ فنون لطیفہ کا شہ کار ہوگی۔

میں نے دو پرانی مساجد کو ایک دوسرے سے متصل دیکھا۔ایک کا کل احاطہ بیس مربع فٹ اور دوسری کا دس مربع فٹ کے قریب تھا۔ جنوب مشرق کی جانب سنی مسجد ہے جس کے دو برآمدے ہیں ، شمال اور مغرب کی طرف دوسری مسجد ہے جس کو صحیح مسجد کہا جاسکتا ہے۔ جس کے اوپر کی طرف برآمدہ دوسری طرف کندہ کاری کے جنگلے لگا دیئے گئے ہیں کھڑکیوں پر کھدی جالیاں فریموں اور سلوں پر لگی لکڑ کو کندہ کاری سے سجا کر ان کے ساتھ چوکڑ کو بھی مختلف نقوش کی خطاطی و کندہ کاری سے مزین کیا گیا ہے۔ ان مساجد میں بڑی محنت، عمدگی اور مہارت سے شہتوت اور صنوبر کی لکڑی کا کام ہوا ہے۔ مسجد کے کونے میں ٹنکی اور درختوں کے ساتھ پانی کا کنواں بھی تعمیر کیا گیا ہے۔ ان کی نسبت عبادت و بندگی کے مقصد کے لئے علی آباد کا نیا مصلی بالکل مختلف تعمیر ہو چکا ہے اس نئے عمارت میں سہولیات بھی زیادہ ہیں۔ میرے دورے کے موقع پر ڈیوٹی پر مامور اسکاؤٹ نے بہت اچھے انتظامات کی تھی جن کی میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا خاص کر لمبے مونچھوں والے سکاؤٹ کا جو اپنی خدمت پر فخریہ انداز میں کھڑے تھے۔ اسی دوران میں پرانی مسجد کی طرف متوجہ ہوا تو پتہ چلا کہ ان کو بند کر دیا گیا ہے۔ اس وقت ان میں فرق یہ تھا کہ ایک مصلی اور دوسرا عیسائی راہبوں کی قیام گاہ لگ رہی تھی۔

علی آباد میں میر کے پرانے محل کے ساتھ پورا گاؤں بنجر پڑا ہے۔ مقامی لوگ کاشت وغیرہ کے علاوہ صرف سردیوں میں یہاں قیام کے لئے آتے رہتے ہیں۔ اس قلعہ نما محل کو استعمال نہ کرنے کی وجہ سے بہت خراب ہو چکا ہے عموماََ عمارت ویران پڑنے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ ماضی میں ان کی حفاظت پر بہت توجہ دی جاتی تھی اب ان کی ضرورت اتنی نہیں رہی یہاں تک کہ عظیم الشان دروازہ اور

کنواں بھی خراب ہو چکے ہیں۔ لوگوں کے اس گاؤں میں نہ رہنے کی وجہ سے پورا قصبہ ہی ویران ہونا شروع ہوا ہے۔

علی آباد کے نزدیک 'بوتل جاگیر' کی کہانی بہت مشہور ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قدیم (گمنام) ہنزہ سے ایک شخص انڈیا گیا اور واپسی پر شراب کی خالی اچھی سی وسکی بوتل میر آف ہنزہ کو تحفہ پیش کیا۔ میر صاحب نے اس قیمتی اور نایاب تحفہ پر خوش ہوکر بدلے میں ایک بڑی قطعہ زمین سے نوازا۔ اس قطعہ زمین کو پہلے پھوروحر کہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ان کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا ۔

بلتت سے تھوڑے فاصلے پر شمالی سرحد کی طرف ٹیلہ دار چٹان کے اوپر التت کا پرانا قلعہ ہے۔ قلعہ کے ساتھ گھر اور چنار کے باغات بہت دلنشین لگتے ہیں لیکن ساتھ والی سب سے بڑی پانی کی ٹنکی مٹی سے بھرتی جارہی ہے۔ یہ ناقابل تسخیر قلعہ خوبانی کے باغ کے ساتھ واقع ہے۔ مجھے ان کھیتوں کے باریک راستوں پر چلتے ہوئے مزہ آرہا ہے اور اکثر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گاؤں والوں نے ایک مربع فٹ زمین پر بھی کچھ نہ کچھ اُگا کر اس سے بھرپور فائدہ لینے کی کوشش کی ہے۔ ایک دفعہ دریا کے ساتھ چٹان کے اوپر گرد و غبار اُٹھتے دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ معلوم نہیں کیا ماجرا ہوا؟ لوگوں سے پوچھا تو پتہ چلا کہ ایک آدمی اس چٹان کے اوپر کچھ نہ کچھ اُگانے کی کوشش میں مٹی پر زور سے پانی ڈال رہا تھا۔ ان کو یقین تھا کہ چٹان پر مٹی ڈال کر کچھ سبزیاں ضرور اُگائی جاسکتی ہیں۔

اپنے قیام کے دوران میں نے لوہار 'غلام' سے بھی ملاقات کی جو یہاں کا سب سے مشہور دستکار' فنکار اور ہنرمند ہے۔ قیام کے دوران مجھے میر صاحب کے گھر میں بہت زبردست چیزیں نظر آئی تھیں جو سونے' چاندی' پیتل اور ٹین کی بنی

تھیں ان کے علاوہ بھی کافی اوردھاتیں دیکھاجن سے پتہ چل سکتا تھاکہ یہ چیزیں لوہار غلام نے ہی بنائی تھیں۔ پرانی کلہاڑیوں کو ایک دم تیزدھار بناکے رکھ دیتا ہے۔ وہ بڑا خوش مزاج آدمی تھا جو پورے دن لوگوں کی ضرورت کی چیزیں بنانے کے لئے یہاں موجود رہتا ہے۔ لوگوں کی عام دھاتوں سے وہ اپنے ہنر اور وقت سے ان کی خواہش کے مطابق چیزیں بناتا ہے اس کام کے بدلے میں عوام ان کو سالانہ چارکلو اناج یا آٹا معاوضہ دیتے ہیں۔ انہوں نے میرے لئے ایک چاقو ‘ قنچی اور ریزر بنایا تھا جو مفید ثابت نہیں ہوئے۔

باب نمبر 10
ہنزہ نگر کے لوگ اور ان کی رسومات

جدیدہنزہ بنیادی طور پر تین نسلوں پر مشتمل ضلعوں میں منقسم ہے۔ ہنزہ کا زریں علاقہ نگر کی سرحدی حدود میں چھلت سے اوپر دریائے ہنزہ کے دائیں جانب آگے مرتضٰی آباد تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ گاؤں ہنزہ میں شامل نہیں کیونکہ ان کے سب رہائشی دریائے سندھ کی وادی سے یہاں آکر بسے ہیں۔ مرتضٰی آباد سے التت تک اصلی ہنزہ کے باشندے آباد ہیں۔ التت سے آگے گلمت سے اوپر تک ریاست چھوٹا گوجال کے نام سے مشہور تھی یہ کبھی ایک الگ راجا کے ماتحت ریاست تھی جس میں سب وخی نسل کے لوگ آباد تھے۔ ان کے علاوہ بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ہنزہ کے لوگ رہائش پذیر ہیں جن کی ایک مثال مِسگر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کثرت آبادی کی وجہ سے ہنزہ کے لوگ نئے علاقوں میں آباد ہونا شروع ہوچکے ہیں۔ جدید ہنزہ میں ہنزہ خاص طور پر شہرت رکھتا ہے یہ دریا کے ساتھ پانچ سے چھ میل لمبا علاقہ ہے جس کا مرکز بلتت ہے جہاں وہ بہت صدیوں سے گمنام رہ رہے ہیں۔ یہ در اصل مشترک قسم کی نسل سے ہیں لیکن گلگت ایجنسی کے لوگوں سے بالکل الگ ہیں، بہت سارے لکھاری اور محققین خاص میجر جون بدلف اپنی کتاب ’قراقرم کے قبائل‘ میں ان کو اور نگر والوں کو ایک ہی نسل میں شمار کرتاہے۔ بغیر شک کے نگر میں سب سے پہلے رہائشی ہنزہ کے لوگ تھے لیکن وقت کے ساتھ ان کے نقوش مٹ گئے صدیوں پہلے ایسا ہونے کے بعد مختلف لوگوں نے آکر یہ امتیاز ختم کر دیا۔ زبان کے علاوہ نگر کے لوگ ہنزہ سے

کوئی خونی مماثلت نہیں رکھتے یہاں تک کہ زبان میں بھی بہت اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دریائے سندھ میں صرف اسی جگہ آباد ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کسی بھی لحاظ سے گلگت ایجنسی یا سندھ کے دوسرے باشندوں سے نہ ہی نگر کے لوگوں سے کوئی مماثلت پائی جاتی ہے یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے جیسے پونیال میں بعض نسلی گروہ خود کو مراسیوں سے الگ سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہنزہ کے لوگ شمالی علاقوں کے مہاجرین ہیں جنہوں نے گلگت کے 'را' (راجا) کے ساتھ مبہم وفاداری کا عہد کیا تھا تا کہ وہ محفوظ رہنے کے ساتھ بیرونی حملوں اور ملک بدر ہونے سے بچ سکیں۔

بدقسمتی سے دو جعلی سائنسی طریقوں سے مبہم طور پر قراقرم کی نسلیں تشخیص کی گئی ہے۔ ان کے باشندوں کیلئے پہلی اصطلاح 'درد' سے دردستان اور دوسری یشکُن استعمال کی گئی ہے۔ میں نے اس معاملے کو متعارف کرایا کہ ہنزہ کے لوگوں کو درد اور یشکن کہا جاتا ہے۔ان کے بنیادی نسلی حقائق دیکھ کر ایسا ممکن نہیں نہ ہی کوئی گنجائش ہے۔ پھر ہنزہ والے کون ہیں؟ ان کی اپنی زبان میں 'ھُن' تیر کو کہا جاتا ہے یقیناً ہنزہ کے لوگ تیر کمان چلانے میں ماہر ہیں اس لئے ہوسکتا ہے یہ نام رائج ہوا ہو لیکن مجھے خدشہ ہے کہ اس تشریح کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔لوگ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بدخشان اور واخان سے آئے ہیں یا دوسرے الفاظ میں وہ ایرانی' تورانی النسل' ترک یا تاجک ہیں۔ ہنزہ خاص میں چند ایک چینی بھی آباد ہیں لیکن ایک چیز بالکل واضح ہے کہ ان میں کشمیر' بلتستان یا دریائے سندھ کے نسلی آثار بالکل بھی نہیں۔

جون بڈلف کا خیال ہے کہ ہنزہ اور نگر یشکن اور بروش یوچی (Yuechi) کی باقیات یا نسل سے ہیں جنہوں نے بکٹیریا (Bactria) کو 120 ق م میں فتح

کیا تھا(بیکٹیریا وسطی ایشیاء میں قدیم ایرانی تہذیب تھی دریائے امو کے جنوب ہندوکش کے پہاڑوں کے شمال میں موجودہ افغانستان میں واقع ہے) ۔ انہوں نے یقیناً شگر تک قبضہ کرکے بلتستان اور امیر کبیر دریائے سند کی وادی کو بھی محاصرہ میں لے لیا تھا۔ وہ یشکن اور یوچی کے درمیان ایک تعلق ڈھونڈتا ہے لیکن اس خیال پر بڑااعتراض یہ ہوسکتاہے کہ ہنزہ کی روایات کے مطابق یقیناً شمال کی جانب سے حملے ہوتے رہے ہیں جن کے نتیجے میں وہی سے مہاجرین ہنزہ آکر آباد ہوئے ہیں۔نگر کے بارے میں بڈلف کے' حوالہ' کونظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

ریاستی حالات اور ان کے ہمسائیوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے اور شادی بیاہ کے تنازعات دیکھ کر نگر یا گلگت کے ساتھ ان کے مراسم کا کوئی اندازہ نہیں جبکہ سری قول پامیر' واخان اور ترکستان خاص کے ساتھ قدیم روابط قائم رہے ہیں۔ ہنزہ کی زبان برشسکی مختلف اور مشکل ہے۔ یہ زبان ہنزہ نگر کے علاوہ کچھ مقدار میں یاسین اور پونیال میں جہاں ہنزہ کے لوگ شادی بیاہ یا ہجرت کرکے آباد ہیں، بولی جاتی ہے۔۔۔ زبان بھی نسل کی عکاس ہوتی ہے ۔۔۔اس طرح یہ زبان بھی متعارف ہوگئی۔

پھر ہنزہ والے کون ہوسکتے ہیں؟ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ ہنزہ والے جسمانی طور پر خوبصورت'درمیانی قد' ہوشیار اور کافی کشادہ ہیں۔گھل ملنے کے ساتھ ملنسار اور دوسرے ہمسائیوں کی نسبت ذہین ہیں۔ شاید وہ اپنے استقلال اور محنت و برداشت کی وجہ سے دوسروں سے نمایاں ہیں۔ لازماً یہ دلیر قوم ہے ان پہاڑی ریاستوں میں ان کے برابر کوئی نہیں۔ اچھے شکاری' محنتی' جفاکش کاشتکار اور قدیم نسل میں ان کا ثانی نہیں۔ یہی چیزیں ۔۔۔ مجھے سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ اچھے دستکار بھی ہیں۔ہنزہ کے لوگ مستری' ترکھان' لوہار' سنار'بندوق بنانے والا'

سڑک، پُل اور نہر کے انجینئر سب پیشوں میں اچھے اور ہرفن مولا ہیں۔ ان کے گھریلو بنے کپڑے دوسروں سے نمایاں ہیں اور درجنوں طریقوں سے وہ اپنی مہارتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی جسمانی سرگرمیاں اور عقلی مہارتیں سب دوسرے ہمسائیوں سے ممتاز ہیں۔ اس لئے ملازم اور قلی رکھنے کی حیثیت میں ایجنسی میں دوسروں نسلوں سے زیادہ ان کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ان کی خامی جھگڑالو اور فسادی ہیں۔ وہ انفرادیت پسند ہونے کی وجہ سے بمشکل متفق ہوتے ہیں اوراپنے خاندان کے لئے بھی بہت خودغرض ہیں۔ جب ہنزہ کا کوئی فرد گھر سے محنت مزدوری کے لئے کہیں جائے گا تو کبھی بھی اپنے گھر والوں کو پیسہ اورنہ ہی خط لکھے گا۔لالچ اور حرص میں ان کی مثال نہیں۔ لالچ قراقرم کی بڑی خوبیوں میں سے ایک ہے لیکن ہنزہ میں سب سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ ہنزہ کے گمنامی کے زمانے 1886ء میں بھی سر ولیم لوکرڈ نے ان کی یہی شکایت اور بہت بُرائی کی ہے کہ باوجود ہزاروں چیزیں دینے کے یہ لوگ مزید مانگتے ہی رہے۔کوئی بھی چیز متجاوز دے کر وہ ان کو مطمئن نہ کرسکیں۔یہاں دیدہ دلیری، بے حسی نافہمی، استحصال جیسے مکروہ عادتیں بہت زیادہ ہیں۔

یہ اچھی اوربُری عادتیں ہنزہ والوں کے پاس ان کی زمین کی وجہ سے آئی ہیں کیونکہ یہ تنگ قلیل اور ناکافی ہے جس کی وجہ سے وہ محنتی بھی ہیں اور جفاکش بھی، پانی اور زمین کی کمی ان سب کا سبب ہے۔لکھاریوں نے ہنزہ کو لٹیروں، غارت گروں اور چوروں کی ریاست اور میر کو ان کا سرپرست لکھاہے؛ ای ایف نائٹ اپنی کتاب (Where Three Empires Meet) میں خاص طور پر اس تمام معاملے میں سہل نگاری سے اور نامناسب لکھنے کا مرتکب ہواہے۔ ان میں پٹھانوں کی طرح لوگوں کو غارت کرنے اور دھاوابولنے کی عادت ڈلوائی

گئی تھی جو شمال مغربی سرحد میں کم آمدنی اور غربت کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ ان محنتی اور جفاکش کسان نسل کو غارت گر اور چور کہنا بچگانہ اور نامناسب ہے۔یہ کبھی ایسے تھے نہ ہونگے!

ہنزہ کے بزرگوں کے بارے میں بہت سی روایات ہیں جن کا ذکر ضروری ہے اگرچہ یہ قرین از قیاس بھی ہیں۔کہا جاتاہے کہ اسکندراعظم کے پانچ سپاہی ہنزہ میں رہ گئے جن میں سے خواجہ آرل ہنزہ میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد گلگت میں مقیم ہوگیا۔ تیٹم اور کھوروبلتت، گیار گنش اور شین ہندی گیا۔ (حاشیہ:روایت ہے کہ ہنزہ میں کسی بھی قسم کا پہلا رہائشی گھر ایک چینی نے گنش میں بنا کر کاشتکاری شروع کی، آج کل گنش کے چند گھرانے اپنے آپ کو انہی کی نسل قرار دیتے ہیں)۔ بحرحال نسل جو بھی ہو یہ پہاڑی لوگ دوردراز گھاٹیوں میں الگ تھلک رہتے تھے جہاں تک پہنچنا کسی کی بس کی بات نہ تھی۔ وہ دنیا کے دوسرے حصوں سے کٹ کر رہ گئے تھے یہاں تک کہ کچھ دور گلگت سے بھی انتہائی قلیل مراسم تھے۔ 1891ء سے قبل یہاں کے لوگ(ان پہاڑوں)میں مقید اور خود حدتک محدود تھے اس کے بعد روزگار اور دیگر معاملات کے سلسلے میں باہر کی دنیا سے رابطے میں آنے لگے۔ ایساماحول ہونے کے باوجود ہنزہ کی کچھ عادتیں اور رواج دیگر قوموں کی نسبت آج بھی محفوظ ہیں۔

لوگ چار قبائل میں منقسم ہیں؛ ان میں دیرامیتگ، براتلنگ، کوروکوژ اور بورونگ شامل ہیں، یہ کوئی نسلی اور ریاستی تقسیم نہیں بلکہ سماجی تقسیم ہے جو قبائل کے بانیوں کے ناموں کی نسبت سے وجود میں آئی مثلاً دیرم، خرور، برت اور برونگ۔ 1930ء کی دہائی تک یہ لوگ بیرونِ ازدواج کی روایت پر عمل کرکے کبھی اپنے قبیلے میں شادی نہیں کرتے تھے لیکن اب کچھ اندرونِ ازدواج کی روایت رونما ہوئی

ہے مثلاً میرے ایک آدمی حاصل شاہ نے اپنی کزن سے شادی کی تھی لیکن اُن سے بچے نہیں ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل اپنے قبیلے کے قریبی رشتہ داروں کے مابین شادی کے رواج کو رشتے کی حرمت کے خلاف سمجھتے تھے۔ قبیلے کو اپنے لوگوں کی زمین پر پورا پورا حق سمجھا جاتا ہے اگر کوئی زمین بیچنا چاہے تو وہ سب سے پہلے اپنے ہی خاندانوں کے کسی کو بیچ سکتا ہے لیکن اگر کوئی گاہک نہ ملے تو وہ ساتھ والے قبیلے کو دے سکتا ہے لیکن وہی قبیلہ ہمیشہ اُس زمین پر انتقال کی صورت میں معاوضہ کا انتظام کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

تمام قبائل کو مماثل حیثیت حاصل ہے لیکن دیرمیتنگ کو کچھ معاملات میں دوسرے قبائل پر فوقیت حاصل ہے۔ مثال کے طور پر نئے مکان' نہر کی کھدائی یا عوامی نوعیت کے کام ہونے کی صورت میں دیرمیتنگ کے کسی فرد سے افتتاح کروایا جاتا ہے۔ گھر کی بنیاد کا پہلا پتھر' نہر میں پانی چھوڑنے کی رسم یا موت کی صورت میں پہلے دن دیرمیتنگ کیلئے مخصوص ہوتا ہے یہاں تک کہ شادی میں گھر سے پہلے باہر نکلنے کا شرف بھی انہی کو حاصل ہے۔ قدیم زمانے میں میر کے کہیں سفر پر جانے یا کوئی کام شروع کرنے کی صورت میں آغاز انہی سے ہوتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ہنزہ میں آگ کے تہوار (Tum-i-shilling) کے موقع پر کیسے بہت زیادہ خون خرابہ ہوتا تھا۔ اس وقت دیرمیتنگ کہتے ہیں کہ وہ دیرم کژ (Diram Kuyuntz) کے نام سے مشہور تھے۔ جب برچھتلینگ (گنش میں اب بھی وہ موجود ہیں) نے ایک دفعہ براتلینگ قبیلہ کے تمام لوگوں کو قتل کر دیا۔ اُسی سال گندم کی تمام فصل روگ میں پڑ گئی۔ اگلے سال بھی فصل میں بیماری لگ گئی تو لوگوں نے اس مصیبت کو اُس قبیلے کے قتل وغارت سے منسلک کر کے اس روایت کو اتنی تقویت دی کہ وہ خوشحالی کی علامت بن گئی۔ اسی وقت نگر کے

گاؤں پھکر میں براتیلنگ سے تعلق رکھنے والی حاملہ ایک خاتون کا انکشاف ہوا جس سے لڑکا پیدا ہوگا۔ جب وہ لڑکا پیدا ہوا تو اس کے ہاتھ پر اناج کے تخم کا نشان تھا۔ اُسی سال نصف فصل بہتر اور نصف ابتر ہوئی۔ دوسرے سال بچہ کافی بڑا ہوا اوران کے ہاتھ سے کچھ تخم کھیت میں ڈالوائی گئی جس سے فصل کی بہت پیداوار ہوئی۔ آج دیرمیتنگ قبیلہ اُسی بچے کی اولاد ہیں اور اسی دن سے ہرکام کا آغاز اُنہی سے کرایا جاتا ہے۔ سالانہ اناج (نئی فصل) کی فروخت کی رسم کے موقع پر سب سے پہلے دیرمتنگ قبیلہ کے کسی فرد سے افتتاح کرایا جاتا ہے۔

اسد اللہ بیگ جو وزیر کے عہدے پر فائز ہے' کے زمانے تک زمین کی وراثت براہ راست باپ سے بیٹے میں منتقل ہوتی تھی۔ اگر کوئی فرد اپنے باپ سے پہلے مر جائے تو اس کی بیوہ کو وہ زمین دی جاتی ہے قطع نظر اس کے کہ اس کی اولاد میں لڑکا ہو۔ اس رواج میں اصلاح کی گئی کہ جب کوئی خاتون اپنے شوہر کو اس کے باپ کی موجودگی میں کھودئے تو اس کو بیٹوں کے حساب سے زمین عطا کی جائے گی۔ اسی طریقے کے تحت ایک شخص اپنے باپ کی زندگی میں ہی اپنے بیٹے کا باپ بن جاتا ہے، اگر وہ اس سے پیش مرگ مرجائے تو یہ ناانصافی ہوگی کہ اس کی بیوہ اتنی ہی زمین لے لے جو زندہ بیٹا اپنے کئی بچوں کے ساتھ لے سکتا ہے۔ اگرکوئی بیٹا مر جائے لیکن اُس کا کوئی بیٹا نہ ہو بیٹیاں ہوں تو ان کو اُن کے باپ کے حق کا غلہ مل جاتا ہے مگر کوئی زمین نہیں مل سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہنزہ میں زمین نرینہ اولاد کو ہی کو مل جاتی ہے بھلے وہ زندہ رہے یا ان کی اولاد میں نرینہ ہو۔ دوسری طرف ایسا کچھ بھی نہیں ہے جب ایک باپ اپنی زندگی میں بہت جائداد کا مالک ہوتو مرنے کے بعد کسی بھی طریقے سے ان کو ٹھکانے نہیں لگایا جاتا ہے۔

جب کوئی موت ہوجاتی ہے تو متوفی کے گھر میں نہ آگ جلائی جاتی ہے نہ کھانابنایا جاتاہے اور نہ ہی کچھ دھویا جاتاہے سب چیزیں اور کھانا باہر سے لایا جاتاہے۔ تین دن تک ایک عام ملاّ (گاؤں کا عالم دین جس کو ہنزہ میں خلیفہ کہا جاتاہے) قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ ان تین دِنوں کے لئے خلیفہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خود تمام رسومات کی ادائیگی کرے۔ ایک بڑے قندیل میں تیل ڈال کر چراغ جلایاجاتاہے خلیفہ اور اس کا معاون ایک فیتہ بناکر اس پر چراغ جلاتے جاتے ہیں۔ اس موقع کے لئے (تیسرے دن) ایک بھیڑ خلیفہ سے ذبح کرواتے ہے اگر کوئی امیر کبیر ہو تو کئی ایک بھیڑیں ذبح کروائی جاتی ہیں اور تمام گوشت کو موصل یا کسی سخت مادے سے کوٹ کر ایک بڑی سے دیگ میں پکایا جاتا ہے۔ جب تک گندم کے دانوں کا کھانا (حاریسا) نہیں بنتا وہ خلیفہ قرأت جاری رکھتاہے۔ اسی طرح کئی گھنٹوں میں وہ کھانا تیار ہوتاہے پھرصبح کے وقت وہ تلاوت ختم کرکے نرم پکوان کھا لیتے ہیں۔ ہنزہ میں خلیفہ تین بڑے نوالے لے کر کھانا شروع کرتاہے باقی سارے کھانے کو ان کے رشتہ دار کھاتے ہیں۔ ہنزہ میں اسی دوران تمام قبیلوں کے لوگوں کو بھی دعوت پر بلایاجاتاہے۔ پہلے دن دیرمیتنگ 'دوسرے دن برتیلنگ' تیسرے دن کی صبح کھوروکژ اور اسی شام کو بھورونگ آتے ہیں۔ ایک شرٹ اوردو بڑے چادروں کے کفن میں لپیٹ کر جسد خاکی کو پہلے دن ہی دفناتے ہیں۔

ہنزہ میں ہمیشہ خوراک کی قلت رہی ہے۔ صبح سویرے لوگ کچھ بھی کھائے بغیر کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔تقریبا نو بجے وہ واپس آکر سبزی' دودھ یا گھی کے ساتھ چپاتی کھاتے ہیں۔ دن کو ملنے کی صورت میں وہ پھل کھاتے ہیں نہ ملنے کی صورت میں خوبانی کے خشک پھٹور پانی میں بھگو کر پیتے ہیں۔ شام کو صبح

والے کھانے کی طرح کچھ کھاتے ہیں۔

سردیوں میں تمام قبیلے گوشت کے لئے جانور ذبح کرتے ہیں اور گوشت کو صرف شام کے وقت کھاتے ہیں۔ مرغیاں بہت کم ہیں کیونکہ وہ کھیتوں کو نقصان پہنچاتی ہیں اس لئے ان کے انڈے بھی نہیں کھاتے ہیں۔ گرمیوں میں شاید دس دن میں ایک دفعہ کوئی گوشت کاٹکڑا کھاتے ہیں لیکن پھل فروٹ کثرت سے ملتے ہیں۔ اس لئے اکثر روٹی یا سبزی کے ساتھ بھی کھاتے ہیں کثرت سے ہونے کی وجہ سے ان پر کچھ توجہ کی ضرورت ہے۔ اناج عموما نگر سے لاتے ہیں اور اسی کی چپاتی بناکر کھاتے ہیں نگر کے لوگ گندم کی روٹی کو پسند نہیں کرتے ۔ گندم کی پیسائی سال میں ایک مرتبہ ہوتی ہے لیکن کبھی کچھ اناج سٹور کرتے ہیں تاکہ کمی کو صورت میں استعمال کیا جاسکے۔ پیسائی کا کام ایک دو دن میں کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد نہروں میں ککر جمتاہے۔گندم کی دو اقسام ہیں ایک طنبورہ اور دوسری کالی گندم اس لئے گندم کو الگ زمین میں سٹورکیا جاتاہے ۔کبھی کبھی دال کو بھی گندم کے ساتھ پیساجاتا ہے۔لوبیا'جو' مٹر کو بھی ایک ساتھ پیسا جاتاہے۔

جس دن گندم کو پیسائی کے لئے چکی لیجایا جاتاہے اس دن کو دیشا کی کہتے ہیں۔ آٹے کو بڑے بڑے صندوق میں جمع کیا جاتاہے آٹے کو جمع کرنے کا یہ طریقہ گلگت ایجنسی میں سب سے مختلف ہے۔ صرف ہنزہ کے لوگوں کا اعتقاد تھا کہ میر کے پاس بارش برسانے کی بھی طاقت ہے اس لئے جب پانی کی ضرورت پڑے تو وہ سب مِنت مانگنے جاتے تھے۔ایک مولوی کو پانی میں حلق تک ڈوب کر ایک سے دو گھنٹے تک کھڑے رہنے کا حکم ہوتاہے کبھی اس کٹھن امتحان سے چھپنے کی صورت میں وہ ایک تعویز درخت سے باندھ کر دعائیں مانگتے تھے۔ گوجال کے لوگ زیادہ بارشوں سے بچنے کے لئے ہر گاؤں سے میر کو سالانہ دس کلو گھی دیا

کرتے تھے۔ہنزہ خاص میں زیادہ بارشیں ہونے کی صورت میں دس سے بارہ مولوی مسجد میں،وہاں جگہ نہ ہو یا گرمی کا مسئلہ ہو تو قبروں میں بیٹھ کر دعائیں مانگتے تھے۔ زمیندار لکڑیوں کا ٹال لگاتے اور مولوی قرآن پڑھ کر آگ جلاتے تھے۔سنگ چقماق کو دریا سے جمع کیا جاتا تھا پھر قل ھو اللہ کو ایک سو مرتبہ پڑھ کران پتھروں کومولوی آپس میں ٹکراتے ہوئے دوبارہ دریا میں پھینک دیتے تھے۔

1933ء میں ہندی کے لوگوں کوپانی کی شدید قلت کا سامنا ہوا تو انہوں نے بارش کی منت کے طور پر میر کو تین بھیڑیں ارسال کیں۔ان کے بیٹے غزن خان کو دو اور دوسرے بیٹے جمال خان کو ایک بھیڑ دی گئی۔نتیجہ بہت اچھا رہا ان کی تمنائیں پوری ہوئیں۔بارش غیر متوقع طور پر بہت زور دار ہوئی۔ میر کی اس شفاعت پر مجھے بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوئی!

ہندی کے لوگ عموماً شینا بولتے ہیںان کو پانی کی بہت قلت کی وجہ سے کافی تکلیف ہے کیونکہ ان کے پانی کا منبع ناکافی گلیشیر پر ہے۔کبھی ایک دفعہ وہ ایک بڑے لَکَر(برف) کی لمپ بناکراس کوگلیشیر کے سونڈ کے قریب دفن کرتے ہیں اور اُس یخ کے ٹکڑے کو زیر زمین دفناتے ہوئے سرنگ بناکر اس تک پہنچاتے ہیں لیکن وہ ہر طرح سے مایوس ہوتے ہیں ایک طرف وہاں سے پانی نہیں آتا نہ ہی ندی اورگلیشیر پانی نیچے چھوڑتاہے۔

جیسا کہ بتایا گیاتھم شلنگ آگ جلانے کی رسم صرف ہنزہ خاص میں منائی جاتی ہے اسی طرح عموماً پوری ریاست میں اس جیسی رسومات منائی جاتی ہیں ۔ یہ رسم وسط دسمبر میں ہوتی ہے۔نومبر کے شروع میں ہر گھر میں ایک بھیڑ بکری یا بیل ذبح کرتے ہیں اور ان کے سر اورمعدہ بغیر پکائے اُس رسم کے انجام پانے تک رکھا جاتاہے۔تھم شیلنگ کی رات اس جانور کے معدے کو کالی گندم (ہنزہ

میں اس کو جُوکَش کہتے ہیں)کے آٹے سے بھر دیا جاتاہے اور چھوٹے معدے کو گوشت اورچربی(شُوپن) سے بھراجاتاہے۔ دونوں معدوں اور سری کو شلجم کے ساتھ ایک بڑی دیگ میں رات بھر پکایا جاتا ہے۔صبح کے وقت جب زور زور سے ڈھول بجایا جاتا ہے تو ہرگھر سے ایک مرد چند انچ لمبا لکڑی کا ٹکڑا لیکر باہر نکلتا ہے۔ یہ ٹکڑا دو مہینے سے تیار رکھا جاتا ہے۔ ایک ڈھول کو اونچی آواز سے بجایا تو وہ سب جلے چراغ ہاتھ میں لیکر باہر نکلتے ہیں۔ اگر کوئی جلدی سے باہر نکلے تو وہ سب لوگ یہ لکڑی اسی پر گراتے ہیں۔جب وہ سب باہر آجاتے ہیں تو زور سے اُس آگ لگی لکڑی کو زمین پر دے مارتے ہیں۔جب تک وہ جل رہی ہوتی ہے ان کی عورتیں خوبصورت لباس پہنے سب مل کر ڈانس کرتی ہیں۔ اس کے بعد وہ کسی رشتہ دار کے گھر جاکر کھانا کھاتے ہیں۔ وہ سب ہر رشتہ دارکے گھر چکر لگاتے ہیں اور خاص طور پر کوئی ناراضگی ہو یا کچھ اور معاملات تو وہ سب اس دن دفع کئے جاتے ہیں۔نگر اور اردگرد کے ہمسایہ ریاستوں کے مولوی اس طرح ہندوانہ قدیم مافوق الفطرت رسومات کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔(مصنف کی حاشیہ : تالینی کے نام سے ایک لکڑ جلایا جاتا ہے اس رسم کو رسم تالینی کہا جاتاہے۔ شینا میں اس رسم کونوس کہا جاتاہے' بڈلف صفحہ نمبر۱۰۰) ۔

مجھے دوبارہ ہنزہ کے لوگوں کے بارے میں کچھ اور کہنے دیجئے یہ دور دراز بنجر علاقے میں باحیا (trousered)خواتین کی دلیرخوشحال پیداوار ہیں۔ ہنزہ سے گلگت ایک طرفہ ساٹھ میل کا سفر ان لوگوں کی معمول کی بات تھی وہ اپنا کام نبھانے کے بعد سیدھے واپس ہنزہ آتے تھے۔ ایک دفعہ دولت شاہ کا گھوڑا چوری ہوگیا اس نے ان چوروں کا پیچھا کیا یہاں تک کہ دو دن مسلسل موسلادھار بارش میں بھی وہ ننگے پاؤں چلتارہا۔ میرے ایک ساتھی اکبر شاہ نے لکر جمے دریا

سے ڈوب کر بطخ پکڑ کر لایا میں سردی کی شدت کو دریا کے کنارے دیکھتا رہ گیا۔ ایک ایسے آدمی کے لئے جو سردیوں میں تالاب میں کُکر توڑ کر نہاتا ہے سردی میں تالاب کے نیچے تیرتے ہوئے دوسرے کنارے نکلتا رہتا ہے۔ یعنی سردی ان لوگوں کے لئے معمولی بات ہے۔ مشقت کی ایک مثال اور کیا ہوگی؟ اسی طرح گلگت میں ایک آدمی روزانہ قریبی پہاڑ سے دو سو پچاس کلو وزن کا لکڑ کاٹ کر اپنے پیٹھ پر گھر لاتا ہے۔

ہنزہ میں بہت زیادہ شکاری ہیں اس لئے شکار کے لئے کچھ نہیں بچا ہے۔ شکاری کہتے ہیں کہ اب مارخور بھی ہوشیار بن چکے ہیں پہلے زمانے میں زخمیوں کو شکاری پکڑ کر ذبح کر دیتا تھا اب عموما زخم کے باوجود فرار ہوجاتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق زخمی مارخور کو ایک چکور نے سرزنش کی اور کہا' مجھے دیکھو' 'میں شکاری سے چھپ کر اپنی جان بچاتا ہوں لیکن آپ کیسے بے حس جانور ہو معمولی سی زخم پر بھی اپنے شکاری کے سامنے ڈھیر ہوجاتے ہیں'۔ اس دن سے مارخور بھاگنا سیکھ چکے ہیں۔

اس کے بعد ہنزہ کے لوگوں نے ان پر دھاوا بولنے میں حیران کن طاقت و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ شکاری میلوں اونچی ڈھلوان زمینوں پر چل کر بغیر پُلوں کے دریا پار کرتے ہیں جہاں آج کل کوئی قلی اپنے بار کے ساتھ نہیں جاسکتا ہے ایسے میں وہ روٹی کا ٹکڑا بھی کئی چٹانوں میں چھپاتے ہیں۔ وہ تو خوش قسمت ہونگے اگر ان کو ایسا کارواں مل جائے ورنہ وہ کچھ نہ ہونے کی وجہ سے بہت مصیبت میں ہونگے اور ان کو راستے میں واپسی پر کھانے کو ہلکا کچھ تو ملے گا۔

ہنزہ کے لوگ سفاک اور کینہ پرور نہیں اور نہ ہی وہ پٹھانوں کی طرح لڑاکو ہیں یا گورکھا کی طرح میدان جنگ میں مزے سے لڑتے ہیں۔ وہ مضبوط

اور مہم جو ہیں یہ سب وہ اپنی ناہموار زمین کی وجہ سے سیکھ چکے ہیں۔ بلاشک وشبہ وہ ڈاکو اور مجھول نگریوں پر حملے کرنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ وہ ترکوں کو مکہ جاتے وقت اور پامیر کے کرغز لوگوں کا مال واسباب زبردستی لوٹتے تھے۔ اب وہ ان تمام رائج بدکاریوں کو چھوڑ چکے ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ اچھی نسل کے لوگ ہیں دیگر قبائل اور مخلوط النسل آبادیوں سے ہر صورت نمایاں ہیں۔ یہ لوگ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وقت کے ساتھ لوگ بہت بدل چکے ہیں۔۔۔ تبدیلی کے باوجود اپنی صلاحیتوں کی نسبت کم مواقع پاتے ہیں۔ ماضی کی لاقانونیت والی زندگی سے معذرت خواں ہیں جن میں جلدبازی' سخت مشکلات اور آئے روز کے سیاسی و سماجی تغیرات شامل ہیں۔

حکومت برطانیہ کے مقامی افیسران نے ہنزہ کے آزاد زندگی گزارنے والے شاندار قبائل کے کچھ لوگوں کو گلگت میں مقامی افسروں کے گھروں میں نوکریاں دیکر بہت احسان جیتایا ہے یہ سب کچھ اُس آزاد زندگی کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ ان کے پاس پولو کھیلنے کے وسائل گھوڑے اور وسیع زمین نہیں۔ سال بہ سال ان کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے ان کے لئے پانی کا انتظام نہیں نہ دریا پر کوئی پمپ لگا ہے اور نہ ہی نگر سے کوئی پائپ لائین لگنے کے امکانات ہیں۔ پانی کی قلت کی وجہ سے مزید زمین پر کاشت ممکن نہیں ۔ میر صاحب کے پاس بہت زمینیں ہیں مگر ان کے پاس اتنی مہارت ہے نہ سرمایہ کہ ان زمینوں کو بڑے پیمانے پر استعمال کرسکیں۔ ریاست کی ایک ہی چراگاہ میر صاحب کی ملکیت ہے۔ ان کی نسبت دوسری وادیوں اور ریاستوں میں وسیع وعریض چراگاہیں ہیں۔ شمالی چترال کے بالائی وسیع زمینوں اور چراگاہوں پر افغان خانہ بدوش قابض ہیں۔ ہنزہ کے قریب ترین دریا کی دوسری جانب نگر کے ڈھلوان اور ہرے بھرے وادیاں ہنزہ

والوں کے خیال میں کھٹکتی رہتی ہیں۔

انڈین فوج ہنزہ کے لوگوں کو بھرتی نہیں کرسکتی ہے۔اس سے پہلے بری فوج میں کچھ لوگوں کو بھرتی کرنے پر میرصاحب کی اعتراض کی وجہ سے افیسران ان کو بھرتی کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ درحقیقت میرصاحب اپنی رعایا کو ہنزہ سے باہر نکلنے کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا رویہ فطری اور جذباتی ہے عملی نہیں کیونکہ میرصاحب رعایا کی خوشحالی کی نسبت اپنے مقاصد کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

جنگ عظیم کے موقع پر آسام، وسطی انڈیا،فیجز، چینی اور کئی ایک قدیم اجنبی باشندوں کومختلف مقاصد کے لئے اندین فوج میں بھرتی کرلیا گیا۔ ہنزہ اور گلگت ایجنسی سے کسی بھی بھرتی نہ کرنے کی وجہ سے اس جنگ میں شامل نہ ہوسکے۔ درحقیقت پامیر میں چند لوگ فضول بھرتی ہیں جہاں کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ پچھلے مشکل اوقات کو دیکھ کر سمجھ نہیں آتی کہ کیوں پولیٹکل ایجنٹ اور میرصاحب دشمن کا جواب دینے میں ناکام ہوئے ہیں؟ عموماً پوچھتاہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ اس صورتحال کے جو وجوہات بتائے گئے وہ قابل تعریف تو ہیں لیکن جب بھی ان سے وضاحت مانگی گئی کوئی خاطر خواں جواب یا تفصیلی مواد نہ دے سکے۔

گلگت سکاوٗٹ میں ہنزہ کے اچھے لوگوں کیلئے کافی روزگار کے مواقع موجود تھے۔ ہنزہ سے نوجوانوں کی ایک کمپنی بنائی گئی لیکن اس میں سکاوٗٹ کومکمل شامل نہیں کیا جاسکا کیونکہ نوکری کی لسٹ میرصاحب کے ہاتھ میں تھی۔ یہ فوجی دستہ سنجیدہ چھاپہ مار فوج کی طرح نہیں بلکہ تمسخرہ بن چکا ہے۔ مجھے حقیقت کا علم ہے کہ ایسا ہونے میں درجہ بالا اسباب ہیں۔ میرے خیال میں کسی حد تک یہ معاملات یاسین اور پونیال والوں کے ساتھ بھی ہوسکتی ہے لیکن وہاں اتنی معاشی

ضروریات نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ گلگت اور ہنزہ میں ہمارا کنٹرول ہونے کے باوجود ہم ہنزہ کے میرصاحب کو بہت کچھ دے سکیں لیکن ہنزہ والوں کو کوئی معاشی فائدہ نہ دے سکے۔

اکثر میں سوچتا ہوں کہ ایسا کہنامشکل ہے کہ نگر کے لوگ ہمسایہ ہنزہ کے لوگوں کے ہی قبیلے یانسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نگر کے لوگ اپنی نسل کو نگر یا اسی کے زرین ایک دو گاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ اصل میں دریائے ہنزہ کے ساتھ کچھ گاؤں میں بروشسکی بولی جاتی ہے باقی گلگتی شینا زبان غالب ہے۔

نگر کے لوگوں کے ساتھ ہنزہ کے لوگوں کی شازونادر شادی بیاہ کے واقعات نے یہ بات واضح کی ہے کہ ان کی نسل کے کچھ اجنبی مراسم کبھی نہ کبھی رہے ہیں۔نگر کے لوگ زیادہ تر مخلوط بلتی النسل یاگلگتی ہیں ان کا خون بالکل ہنزہ سے مختلف ہے۔ ہنزہ کے لوگ نگری تعلق سے بالکل نفرت اور اپنی تضحیک سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نگری قد میں چھوٹے، سیاہ اورالگ عادت کے مالک ہیں ان کا بلتستان کے لئے زمینی سفر بہت قریب تھا لیکن بعدمیں ایک گلیشیر نے ٹوٹ کر سڑک کو خراب کردیا وہ زیادہ تر انہیں کی نسل سے ہیں جو وہاں سے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ 1838ء میں کچھ کشمیری ڈوگرہ کے ساتھ گلگت آگئے اور کسی طرح وہ نگر تک پہنچے ان میں سے کافی لوگ ہنرمند تھے جن کو نگر کے حکمران نے خوش آمدید کہہ کر نگر میں بسنے کی اجازت دی وہاں زمین کی کثرت تھی اس لئے وہ ہنزہ سے باہر ہوگئے۔

اس طرح ان کے بارے میں کہنے کی بہت باتیں ہیں کہ ماضی میں یہاں سے بلتستان کا راستہ بہت آسان اورقریب تھا لیکن اب ایسا نہیں۔ ہنزہ کے لوگ

کہتے ہیں کہ ان کے پھلوں کے درخت خاص طور پر خوبانی اپنے ساتھ شمال کی طرف بدخشان سے لائے ہیں لیکن زیادہ تر اچھی خوبانی نگر سے بھی لائی گئی ہے۔ بیشک ہنزہ کی خوبانی اچھی ہیں لیکن لذیذ اور میٹھے بلتستان سے نگر کے راستے ہنزہ تک پہنچی ہیں۔ یقیناً خوبانی' آڑو اور دیگر پھل کشمیر سے بلتستان لائی گئی تھیں۔ مغلوں نے ان کو کاشغر سے بلتستان پہنچایا کیونکہ ترکستان سے بلتستان کا راستہ عموما آسان تھا۔

جدید نگریوں کی خصوصیات بھی ہنزہ کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں مثال کے طور پر وہ رہن سہن میں ہنزہ سے بہت کمتر ہیں' گندم کے اناج کو اُون' آلو' نمدہ(Numdahs) اور دیگراشیاء کے عوض ہنزہ والوں کو بیچ کر خود کمتر جو کی فصل کھاتے ہیں۔ ان کی بارگیری کی حالت بتاتی ہے کہ وہ بھی دریائے سندھ کے باشندوں کی طرح حقیر اور نااہل ہیں۔ نہ وہ بار لے جاسکتے ہیں اور نہ ہی جانور پر لاد سکتے ہیں اگر کوئی نگر میں ہنزہ کے لوگوں کے بغیر سفر کریں کو ان کی چیزوں کی حالت دیکھ کر یقیناً بڑی کوفت ہوتی ہے۔

نگر والوں کی دستکاری بھی ٹھیک نہیں یہاں تک کہ ایک عام کام میں بھی ان کی طبیعت صحیح نہیں رہتی ہے۔نگر کے لئے راستہ اور پل بھی ہنزہ کے لوگوں نے بنایاہیں۔ کہاجاتاہے کہ یہ سب کچھ اس لئے بھی ہے کہ نگر کے لوگ دھوپ کی کمی کا شکار ہیں عموما نگر کے کافی گاؤں پردھوپ کم پڑتی ہے۔ یہ کوئی خاص وجہ نہیں جس کی وجہ سے ہم ان کی رویوں اورخاصیتوں کا بنیادی اندازہ کرسکیں۔

نگر کے لوگ شیعہ(اثناعشری) ہیں وہ اپنے مذہب کے خاص پہلو رکھتے ہیں اور ہنزہ کے ساتھ کوئی جوڑنہیں رکھتے۔ ان کی اس خاصیت نے ان کو مزید الگ ظاہر کردیا ہے۔ وہ ہمیشہ جنگ میں ہارتے رہے ہیں' وہ کمزور اور کاہل ہیں'وہ

کسی کام میں پہل نہیں کرتے نہ ہی مہم جو ہیں۔ دراصل نگر کے لوگ جسمانی طور پر اور نہ ہی عقلی طور پر ہنزہ کے ساتھ کوئی ربط رکھتے ہیں۔نگری مشرق اور جنوب سے جبکہ ہنزہ کے لوگ شمال اور مغرب سے آئے ہیں۔

باب نمبر: 11
ہنزہ اور نگر کی تاریخ

ہنزہ نگر کی تاریخ کا نقطہ آغاز ہی مشکوک ومبہم ہونے کے ساتھ اس کہانی میں جن بنیادوں کی منظرکشی کی گئی ہے وہ بھی نا قابل یقین ہے۔ان دو ریاستوں کے حوالے سے ایک روایت بار بار پیش کی جاتی ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے جس میں اُس نسخے کی نشاندہی مختلف شکل میں کی گئی ہے۔ مجھے جو کچھ ہنزہ (ہنزہ کو چینی عموماً کنجوت کہتے ہیں لیکن یہ نامعلوم لفظ ہے جسے مقامی لوگ کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے) میں بتایا گیا وہ اس مطابق ہے؛ تمام روایات ایک دوسرے سے بہت حد تک متشابہ ہے، مثال کے طور پر جون بڈلف کی پیش کردہ روایات بہت اہم ہیں ان میں صرف مقررہ سنہ و تاریخ کی چھان بین بہت اذیت ناک ہے ان تمام حالات وواقعات کو میں اپنے ذرائع سے متعین نہ کرسکا۔

ایران کے دو شہزادے عبدالفیاض اور عبدالغنی اپنے ملک سے جلاوطن ہو کر بلتستان آگئے (ایران سے تعلق کی وجہ سے یہ لوگ بلا وجہ اس کہانی کو اہمیت دینے لگے ہیں)۔ اُس وقت یہاں ایک ملکہ کا راج تھا جس کا اصول تھا کہ جو مرد اس کو پسند آتا اُسی کو اپناتی۔ان سے نرینہ اولاد ہونے کی صورت میں مرد اور بچوں کو قتل کروا دیتی صرف ایک بیٹی کو زندہ رہنے دیا تھا۔ اس طرح وہ عبدالفیاض نامی ایرانی نوجوان کے ساتھ پیار میں مبتلا ہوگئی لیکن موصوف باقاعدہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ کافی بحث وتکرار کے بعد ملکہ مان گئی۔ چونکہ ملکہ کے رعایا انُ کو اپنا دیوی مانتے تھے اس لئے شہزادے نے ملکہ کو قائل کیا کہ شادی کے دوران کوئی مافوق الفطرت

مظاہرہ ہو۔ اچانک ایک دن شہزادہ عبدالفیاض تاج پہن کر ایک چٹان پر نمودار ہوا ان کی عجب شان و شوکت دیکھ کر لوگوں نے سوچا کہ ان کی ملکہ کے لئے یہ رشتہ مناسب ہوگا۔ ان کی شادی سے یاقوت شاہ پیدا ہوا اورآگے چل کر یاقوت شاہ کے دو بیٹے پیدا ہوئے جن میں سے ایک کا نام آذر یعنی جمشید اور دوسرے کا نام مرادشاہ رکھ دیا گیا۔ انہوں نے اپنے والدین کی وفات کے بعد اپنی سلطنت کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اول الذکر کے حصے میں ہنزہ آئی اور بعد نگر کو بھی شامل کیا گیا یوں آزر ان علاقوں کا بادشاہ بنا۔ آدم خور شری بدت کی بیٹی نوربخت آزر جمشید کے عشق میں مبتلا ہوئی اور دونوں نے خفیہ شادی رچائی۔ ان سے بیٹا پیدا ہوا جس کو ایک ڈبے میں ڈال کر دریا میں پھینک دیا۔ وہ ایک سنار کے ہاتھ لگ گیا جس کا نام گڈوس تھا۔ شری بدت کے بعد آذر کو مسلسل سات سال تک حکومت جاری رکھنے کی وجہ سے اُس کی بیوی حسد میں پڑ گئی اور اُسی صدمے کو برداشت کئے بغیر خودکشی کرلی۔

گلگت کچھ عرصہ بغیر بادشاہ کے رہا حتیٰ کہ ایک بوڑھے نے مشورہ دیا کہ گڈوس کے بہت بیٹے ہیں ان میں سے ایک کو اپنا بادشاہ چنتے ہیں۔ اُسی اثنا میں اُس کا ایک بیٹا فوراً ملکہ کے سامنے حاضر ہوا ملکہ اُس نوجوان کو دیکھ کر مادری شفقت اور پیار سے سامنے کھڑے نوجوان کو جان گئی کہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہے۔ یہ بیٹا اپنے پردادا لالی تھم اور گرگس کی نسل سے ہے جس کا نام سوملک تھا۔ اِن کی وفات کے بعد نگر مغلوٹ اور ہنزہ کرگس کے حصے میں آیا۔ دونوں بھائی بڑی محبت اور پیار سے رہتے تھے۔ الگ الگ ریاستوں کے بادشاہ بننے کے بعد دریائے ہنزہ نے ان کے خلوص اور سلطنت کو بھی تقسیم کردیا۔ گرکس کے بیٹے مایور نے اپنے باپ سے شکایت کی کہ درمتنگ اور تھپ کوئن قبیلہ حسن آباد کے نالے بہت

آزاد ہیں وہ کسی بھی وقت میر کے لئے تکلیف کا باعث بن سکتے ہیں۔ جب ہنزہ کے عظیم تہوار تُھموشُلنگ کے موقع پر ہنزہ کے سب لوگ جمع ہوئے اور وہ قبیلے والے بھی آگئے اُسن گُس (Usengus) اور برونگ ہاریو کے دلیرلوگ جو التت اور بلتت کے قبیلے سے تھے، نے ان تمام پچاس گھرانوں کوقتل کرکے صاف کر دیا تب وہ سب نشے میں تھے۔ گرکس اس بدنصیب واقعے پر بہت رنجیدہ ہوگئے اور اپنے بیٹے کو بدخشان جلاوطن کردیا وہ وہاں سے شغنان گیا جہاں اس کی شادی شاہ دوروز سے ہوئی، جو براہ راست اسکندراعظم کی اولاد میں سے تھا جسے ہنزہ اور نگر میں سب جانتے تھے۔ (حاشیہ:دوسری کہانی میں مایور کو گرکس کا باپ کہاجاتاہے مغلوٹ اور لالی تھم کو ان کا بیٹا جن کو درست کرنا ناممکن ہے) ۔

مغلوٹ کونگر کے علاقے پسندنہیں تھے اگرچہ زرخیز زمین تھی لیکن ہمیشہ چھاؤں رہتی تھی اس لئے اپنے وزیرمغل بیگ کے ساتھ مل کرمنصوبہ تیار کیا کہ مرغابوں کے شکار کے لئے گرکس دریا کے کنارے آئے تو اس کوقتل کر دیا جائے۔ منصوبے کے تحت ایک دن اس کے وزیر نے تیر سیدھا اس کے سینہ پر مارکرقتل کر دیا مگر یہ قتل بے سود ثابت ہوا کیونکہ ہنزہ کے لوگوں نے مغلوٹ کو اپنا میر ماننے سے انکار کیا اور اپنے مقتول میر کی بیٹی میر بیگم کو حکومت سونپ دی ۔ اس واقعے کے بعدمختلف جرائم کی بنیاد پڑ گئی۔

آہستہ آہستہ ہنزہ کے لوگ ملکہ سے اکتانے لگے اور ماریو کو واپس لانے کے لئے بدخشان سے رابطہ کیا جہاں وہ پندہ سالوں سے جلاوطن تھا۔ تاہم پتا چلا کہ ماریو ایک سات سالہ بیٹا عیاشو کی پیدائش کے بعد فوت ہوچکاتھا۔ بحرحال عیاشو کو ہنزہ لایا گیا۔ عیاشو کی پھوپی ملکہ میر بیگم بادل نخواستہ اس کو جانشین بنانے پر راضی ہوئی لیکن میر بیگم کی بیٹی کی شادی مغلوٹ کے بیٹے سے ہوئی اور عیاشو

نے واخان کے میر کی بیٹی سے شادی کر لی۔

اس روایت میں دو باتوں کو نوٹ کرنے کی ضرورت ہے پہلی بات یہ ہے کہ عیاشو ماریو کا بیٹا ہے نہ کہ بیٹی دوسری بات یہ ہے کہ اُس نے کبھی بھی میر آف نگر کے خاندان سے شادی نہیں کی۔

ایک اور اہم روایت ہے کہ عیاشوگرکس کی بیٹی تھی جس نے مغلوٹ کے بیٹے کمال خان سے شادی کی۔ ان کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے کہ عیاشو نے نگر کے ایک شہزادے سے ناجائز تعلقات قائم کی تھی جن کو چھپانے کے لئے ہنزہ کے راویوں نے اس کی جنسیت ہی کو تبدیل کرکے پیش کر دیا۔اس طرح حقائق کو مسخ کرنے کی روایت قراقرم میں عام سی بات ہے۔ عیاشو ہو یا کوئی آسمانی مخلوق سچ کو سچ ہونا چاہئے وہ کچھ بھی ہو بحرحال یہ ہنزہ کے حکمرانوں کی جَدّہ بزرگ یا جدامجد ہیں جن کو وہ عیاشو کے نام سے پکارتے ہیں۔

ان تفصیلات کے مطابق پورے خاندان کا شجرنسب بہت مشکوک ہے۔

مشرقی شہزادے اپنے دیگر دوستوں کی طرح اپنی نسب کو بڑھا چڑھاکراپنے عزت و تکریم میں اضافہ کرکے پیش کرتے ہیں اس کی واضح مثال میر آف نگر اور ہنزہ کی ہے جو اپنے آپ کو اسکندرمقدونیہ کی اولاد سمجھتے ہیں۔ ان دو حکمرانوں کاتعلق ایک ہی خاندان سے ہوسکتا ہے لیکن یہ کہنا کہ یہ لوگ اسکندر اعظم کی نسل سے ہے محض شائستگی ومروت ہوسکتی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

مغلوٹ کے پڑ پوتے علی داد خان کونگر سے نکال کر ان کی سلطنت پر قبضہ کیا گیا وہ بلتستان فرار ہوئے جہاں سے تین سو لوگوں کے ساتھ دوبارہ حملہ کرکے اپنی سلطنت کو ایک بار پھرچھین لیا۔

ممکنہ طور پرمغلوٹ اور گرکس کے ادوار کو سترہ ویں صدی کے پہلے نصف

یاسولھویں صدی کے اختتام کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے کیونکہ قلیل اور غلط ملط اعدادوشمار سے شجر نسب کو تشکیل نہیں دیا جاسکتا۔ مزید براں بلتستان سے شہزادہ عبدالفیاض کی آمد بھی ہنزہ کے شاہی خاندان اور سکردو بلتستان کے راجوں کے درمیان ایک تعلق کی عکاس ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عیش خان دوّم ۔۔۔ پہلا مرد عیاشو ہے نہ کہ خاتون، حالانکہ مستند ذرائع حسب ونسب اس کو صحیح طور پر خاتون ہی بتاتے ہیں‘ نے جب راجہ کی بیٹی کے ساتھ شادی کی تب وہ ہنزہ آ گئی۔ بلتت اور التت قلعہ اس کیلئے اس کے اپنے ملک کے ہنرمندوں نے تعمیر کیا۔ اس شادی کے بعد مسلمانوں کا شیعہ فرقہ اس ریاست میں متعارف ہوا۔ اسی طرح محمد سلیم خان سوّم کے دور میں میر کی شادی پونیال کی ایک شہزادی سے ہوکر مولائی (شیعہ اسماعیلی نزاری) فرقہ رائج ہوا اور میر غضنفر کے زمانے میں عملی طور پر پوری ریاست میں مولائی آباد ہو چکے ہیں۔ گنش اور گرد ونواح میں پھر بھی تین سو گھرانے شیعہ (اثناعشری) مقیم ہیں۔ وہ کوئی شہرت کے حامل لوگ نہیں پھر بھی مولائی ان کو اپنی طرف لانے کا رجحان رکھتے ہیں۔

جدید ہنزہ کی تاریخ کی ابتدا غضنفر کی وفات 1864ء سے ہوئی۔ یہ پہلا فرماں رواہے جس نے اپنی ریاست کو وسعت دی۔ 1847ء میں اس نے چینیوں کی مدد کی جب سات خوجوں (مذہبی رہنما یارقند خوجے کہلاتے تھے) نے وہاں بغاوت شروع کردی اور ان کو بے دخل کیا گیا۔ غضنفر کو چینی اطراف میں کافی زمین انعام کے طور پر دی گئی اور ایک یادگار تختی بھی وہاں نصب ہے جس پر اس کے اچھے خدمات کا تذکرہ ہے۔ وہ عظیم رہزن تھے اور ان کے زیرِ شفقت ان کے رہزن اور لُٹیروں کی ایک کھیپ تھی جس کا براہ راست فائدہ میر کو ہوتا تھا۔ اسی

طرح چین کی طرف سریقول تک کئی علاقے جو آج کل تاشکرغن پامیر (Taghdumbash Pamir) اور ساتھ میں غوجت بائی (Ghujad Bai) بوزئی غنبت کے نام سے مشہور ہیں کو بھی انہوں نے قلمرو میں شامل کیا۔ ان کے پہلے والے قلعے میں ایک مینار ہوتا تھا جس میں ہنزہ کے گورنر کی یادداشت تھی جس کے ساتھ ایک گنبد ہے جو کرغزوں کی شکست کی یادگار ہے ان کے مالک کا نام بوزئی تھا۔(حاشیہ: کہا جاتا ہے کہ ہنزہ کے لوگوں نے 1765ء میں کرغز کے لوگوں کو شکست دی ان کا کوئی تاریخی ثبوت وشواہد موجود نہیں)۔

اس مہم جوئی میں ہنزہ والوں کا سپہ سالار میر کا بھائی عبداللہ خان تھا لیکن ان کے بھتیجے غزن خان نے اس کو قتل کرکے غضنفر کو جانشین بنایا جو بہت خطرناک رشتہ دار ثابت ہوا۔

سکھوں کی گلگت آمد (1842-47) سے ہنزہ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ ہنزہ کے لوگوں نے گلگت کے پانچ گاؤں پر دھاوا بول دیا تو کمانڈر نتھوشاہ کی قیادت میں سکھوں نے ہنزہ پر حملہ کیا۔ نتھوشاہ کے انتقامی حملے کا کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ ان کا حامی کریم خان مارا گیا اور ہنزہ کے لوگ فتح یاب ہوئے۔ یہ واقعہ 1848یا 1847ء کا ہوسکتا ہے۔(حاشیہ: بڈلف نے صفحہ نمبر79میں 1848ء کا ذکر کیا ہے)۔ 1848ء میں ہنزہ کی قیادت عبداللہ خان نے کی، جو وزیر ہمایون بیگ اور تھرہ بیگ المعرف دادو کا والد تھا، بعد میں ہنزہ نگر کی جنگ میں حکومت کے خلاف بڑا کارنامہ سرانجام دیا۔ یہ عبداللہ خان ہی تھا جس نے نگر پر حملہ کرکے اس کو فتح کیا۔ جس پر نگر کا میر مدد کیلئے اپنے سسر گوہر امان کے پاس گئے تھے ان کی بیوی کو قیدی بنا کر میر آف ہنزہ غضنفر کے پاس لایا گیا جس کو انہوں نے اپنی لونڈی بنایا ۔

جب 1891ء میں برطانوی فوج نے گلگت کی ریاست کو فتح کیا تو ہنزہ کے لوگ سکھوں اور نگر کی جنگ میں فتح مندی کی وجہ سے بڑے مغرور تھے کیونکہ اب تک کوئی ان کو شکست نہیں دے سکے۔ ان کو یقین تھا کہ ان کے ڈھلوان پہاڑوں سے گزر کر کوئی بھی نہ آسکتا ہے نہ ہی ان کو شکست ہوسکتی ہے۔

1866ء میں دوبارہ کشمیری فوج نے ہنزہ پر حملہ کردیا جس کی وجہ سے ہنزہ کے سرکش مہم جو ایک دم اشتعال میں آگئے۔ ہنزہ والوں نے اس مشکل وقت میں نگر جیسے خطرناک اور کاہل ہمسائیوں سے مدد کی توقع کی مگر نگر والے مدد کرنے میں ناکام رہے جس کی وجہ سے ان کے اتحایوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ اس صورت حال کے بعد ڈگرہ برخلاف اپنی نسلی دلیری کے ایک دن نگر والوں کے حملے کی خوف سے بھاگ نکلے۔

کوئی بھی ہنزہ والوں کو نہ روک سکا۔ 1869ء میں ہنزائیوں نے نومل پر حملہ کرکے 200 باشندوں کو یرغمال بناکر کچھ عرصہ بعدان کو فروخت کردیا۔ ہنزہ والوں کو نہ تو اس کی سزا اور نہ ہی ان کو شکست دی گئی۔ مسلمان شہزادہ یعقوب بدولت کے زمانے میں ہنزہ کی طرف سے چین کے اطراف میں لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔ اتالیق غازی ان پہاڑیوں کو ڈرا دھمکا چکے تھے۔ اس وقت ان کے دلیر رہنما مرچکے جس کی وجہ سے چین والے 1878ء میں اپنے علاقے واپس لے سکے ہیں اور رہزنی دوبادہ شروع ہوگئی ہے۔ چینی فی الحال اپنی رعایا کی شکایات پرخاموش اور بےفکر یا اندھے اور بہرے بنے بیٹھے ہیں۔ برٹش حکومت کی مہربانی سے چین کے ان علاقوں میں رہزنی ختم ہوچکی ہے۔ کشمیر کے کچھ ضلعوں میں ہنزہ کی طرف سے لوٹ کھسوٹ ان کے ساتھ ایک معاہدے کے بعد رک گیا تھا جو میر اور ان کے عہدہ داروں کے درمیان طے پا گیا تھا پھر بھی ان کو

بزورطاقت یا فوج کی مدد سے نہ روکا جا سکا۔ بہرحال حیرت ناک طور پر کشمیریوں نے ہی ہنزہ کی بالادستی کو کم کردیا۔ کیونکہ ہنزہ کی فوج نے1862ء میں چھوپ سنگھ پڑی کے وقت ڈوگرہ کی فوج کو نیست و نابود کرنے میں بھی حصہ لیا تھا۔

1868ء میں غزن خان نے اپنی بہن کے ساتھ ملکراپنے والد غضنفر کو قتل کر دیا۔ ان کی بہن کا نام طاہرہ تھا وہ بھائی سے بہت محبت کرتی تھی اس لئے باپ کے کھانے میں چیچک کا وائرس ملایا۔ دوسری روایت میں کہاجاتا ہے کہ انہوں نے باپ کو چیچک کے مریض کا چوغہ بھیجا تھا جس کو پہننے سے میر آخرکار وفات پا گئے۔

اب چھپروٹ کی طرف آتے ہیں جس پرنگرکا تصرف ہے۔ 1853ء میں گوہر امان نے گلگت پر حملہ کردیا توہنزہ کے لوگ چھپروٹ کو خالی کرکے بھاگ گئے جو زمانہ قدیم سے یہاں رہ کرگلگت پر حملے بھی کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ہنزائی دوبارہ چھپروٹ آگئے۔ غزن خان کے دور میں نگر والوں نے حملہ کرکے ہنزائیوں کو فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ یہ ان کی شکست تھی یا خود نکلے واضح نہیں ہوسکا؟ جب 1866ء کو چترال کے مہتر امان الملک نے گلگت میں کشمیری فوج پر حملہ کردیااسی موقع پر ہنزہ کے اسداللہ بیگ نے چھپروٹ میں کشمیری چوکی پر حملہ کیا۔ 1877ء میں نگر والوں نے حکومت کشمیر کی مدد سے ایک معاہدے کے تحت اس علاقے کو واپس لیا۔

1886ء میں Sir William Lockhart نے نگر میں فوجی تعینات کرنے کے لئے چھپروٹ پر حملے کی تیاری کرلی۔ موصوف میر آف ہنزہ کو یہ تأثر دے رہے تھے کہ وہ چھپروٹ کو چھین کر ہنزہ کو دیں گے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ہنزہ سے اس بارے میں کوئی مدد لینے سے معذرت کی۔ چھپروٹ میں تاحال

کوئی کشمیری فوج نہیں۔ ہنزہ کے لوگ چھپروٹ کو اپنا ہی علاقہ سمجھ رہے ہیں۔

ابھی غضنفر کی قتل اور ان کے بیٹے غزن خان کی جانشینی کی بات کرتے ہیں جو موجودہ میر کے والد ماجد تھے۔ یہ سنگین پدر کشی مختصر واقع ہوئی۔ ان کی تصویر سے لگتا ہے کہ وہ بڑے پیار کرنے والے' شرابی' کھانے پینے کے شوقین، وسیع جسامت، کالی رنگت اور بدصورت ہونے کے باوجود بہت مقبول حکمران تھے۔ وہ دل اور ٹانگوں کے مریض تھے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے عزم واستقلال سے Sir William Lockhart اور ان کے مشن کو اپنے علاقے سے 1886ء میں پامیر جانے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چین کی شہنشاہیت میں رعایا کے طور پر دیکھتے اور تھے بھی۔ 1886ء میں بے سروپا کشمیر کے باج گزار ہونے کے باوجود برطانوی حکومت کو خوش آمدید کہنے کے حق میں نہ تھے۔ برطانوی مشن کی مہمان نوازی صرف اپنے وزیر اسداللہ بیگ کی وجہ سے کرتے جو ان کے سخت مخالف تھے۔ میر اس موقع سے فائدہ اٹھاکر چھپروٹ اور چھلت پر کوئی سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے۔ تاہم ان کے وزیر اسد اللہ مارچ 1886ء کو وفات پاگئے ان کے بعد میر نے برطانوی مشن کے Sir William Lockhart اوران کے دستے کو اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دیکر محفوظ گزرنے دیا۔ دستے نے میر سے اپنے یرغمالیوں کو بھی آزد کرا لیا اگر ایسا ہی خسارہ اٹھانا تھا تو وہ ان کی مدد نہ کرتا کیونکہ ان کے بیٹے اور کئی رشتہ دار گلگت میں ان کے پاس رہتے تھے۔ اس سلسلے میں مہتر چترال امان الملک کا کردار بھی اہم ہے جس نے میر کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ اس مشن کو رسائی دی جائے۔ سب سے بڑا کردار محمد خان میر آف نگر کی بیوی کا ہے جو غزن خان میر آف ہنزہ کی بہن تھی جن کی کشمیر میں لوچڑ کے خاندان کے ساتھ قریبی تعلقات استوار تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی سے بہت

پُرزور درخواست کی کہ برطانوی مشن کو ہنزہ کے راستے پامیر تک رسائی فراہم کرے۔

غزن خان مشہور قاتل تھا انہوں نے اپنے باپ کو قتل کرنے کی راہ ہموار کی، اپنے چچا عبداللہ خان ان کے بھائی توکل شاہ ،نوشاہ اور دیگر رشتہ داروں کو قتل کروایا۔ ان سب کے بعد وہ بے گناہوں کی طرح معصوم نہیں بلکہ بری طرح متشدد مرا جو حیرت کی بات نہیں۔

میر غزن خان اس وقت اپنے پرانے قلعے میں مقیم تھا ایک دن اپنے بیٹے محمد ناظم خان موجودہ میر کو دیکھنے سواری پر باہر نکلا جو ایک گھر میں ملیریا کی وجہ سے بخار میں مبتلا تھا۔ سواری کے دوران ان پر چار لوگوں نے وزیر دادو (ترابیگ) کے سامنے اچانک فائر کھول دی۔ میر غزن خان 78 سال کی عمر میں 1886ء کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ان کا بیٹا اور جانشین صفدرعلی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ ان کی خام خیالی تھی کہ وزیر نئے میر کا دوست ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ صفدرعلی بہت بے وقوف نہیں تھا انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ دادو کو قتل کرواکر اس کا سوتیلا بھائی ہمایون بیگ جو جلا وطن تھا لاکر وزیر بنایا جائے۔ تھرہ بیگ (دادو) کی بیوی بہت چالاک ایک آنکھ سے معذور تھی تمام معاملہ سن کر فوراً اپنے شوہر کو قائل کیا کہ ہمایون کی بیوی کے ساتھ میر کا نکاح کیا جائے۔ میر نے ایسا ہی کیا۔ اس مختصر مگر سیاسی فسق سے دادو اپنے سوتیلے بھائی کو واپس آنے سے روک سکے اور میر کو اس کی سوچ سے منحرف کردیا یہ سب اُس نے اپنی زندگی بچانے کے لئے کیا تھا۔ یہ دادو ہی تھا جس نے نئے میر کو اپنے بھائی سلیم کو قتل کروانے پر آمادہ کیا۔ دادو نے میر کو یقین دلایا کہ اگر سلیم زندہ رہا تو تخت پر قابض بھی ہوسکتا ہے۔ سلیم کی شادی سریقول کے حکمران کریم خان کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ صفدرعلی نے

کریم خان سے خواہش ظاہر کی کہ سلیم کو واپس ہنزہ بھیجا جائے یا پھر چین کی طرف جلاوطن کیا جائے۔ کریم خان نے سلیم کو شمشال بھیج دیا جہاں کے نمبردار زَارو نے کچھ عرصے میں میر صفدر علی خان کو قتل کر کے سلیم خان کو تخت پر بیٹھا دیا۔ نئے میر کی حفاظت کی خاطر نمبردار نے ہمایوں کی بہن کے دو بیٹے سلیم کے ساتھ روانہ کیے نیز حفظ ماتقدم کے طور پر تیفور اور دو اور آدمیوں کو بھی قتل کر دیا۔

مجھے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی کہ کیوں ڈیورنڈ نے اپنی کتاب میں میر صفدر علی کے خلاف لکھا ہے۔ جس میں سابق میر کو بدنام زمانہ' نہایت دغاباز 'محسن کش' بدخو' کمزور ہونے کے ساتھ لوگوں کو ان سے بہت ناخوش ظاہر کیا ہے اور ان کی ستم گیری نا قابل برداشت حد تک بتلائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈیورنڈ کو کسی نے بہت غلط معلومات دی ہوگی۔ یہ واقعات ایسے لگ نہیں رہے جس طرح ہوئے ہونگے۔ اس عرصے میں ان کا حاکم جلاوطن تھا اور ان کے ملک میں برطانوی فوج تھی کوئی بھی ان کی اس بات کی تائید نہیں کرے گا۔ سادہ لوح ڈیورنڈ کو اس طرح کے واقعات کے بجائے اچھی باتیں لکھنی چاہئے تھی۔ اگر آپ ایک آفسر ہیں یا کوئی اجنبی آج کل ہنزہ میں آپ میر کے بارے میں، ان کے بھائی موجودہ میر جو صفدر علی کے جانشین ہیں اور نہ ہی ان کے رشتہ داروں کے حوالے سے کوئی اچھی بات سنیں گے۔ اس کے باوجود وہ ایک مقبول عادل اور شفیق' بہت مہربان' خوش اخلاق اور نرم خو انسان تھے۔ اس نے بہت مناسب اور اچھے ٹیکس کا نظام متعارف کرایا۔ اپنے بھتیجے خسرو خان اور ان کے تین بھائیوں عباس' بادشاہ اور سلیمان کو ان کی اپنی امی کے ساتھ گلمت بھیج کر میر آف نگر آزر خان کی گرفت سے ان کی زندگی بچائی۔ وہ نگر کے تخت کے حریف اور مدعی کے طور پر ان سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔

میر صفدر علی خان نے بھاگنے کے بجائے اپنے بھائی موجودہ میر محمد نظیم خان کو برطانوی حکومت سے کوئی معاہدہ طے کرنے کی خواہش کر کے بھیجا مگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا۔ میر کو وزیر دادو نے ان افواؤں سے بھڑکایا کہ (برطانوی) ایک بڑے لشکر کے ساتھ چترال سے حملہ کرنے والے ہیں جس سے آپ کا تخت بھی چھن سکتا ہے۔ ایک دفعہ چین کے علاقے اُرُچی کے دورے کے موقع پر دادو کے ساتھ بڑی تلخ کلامی ہوئی۔ میر نے ان پر بہت الزامات لگائے جس پر بڑا تصادم ہوا۔ اس صورت حال کے بعد وزیر نے بہت افیون پیا اور میر کے آنے سے پہلے ہی وفات پائی۔ میر 1930ء تک زندہ تھے جبکہ دادو یارقند میں وفات پا گیا۔ میں اس بوڑھے (دادو تھرہ بیگ) آدمی کو خوب جانتاہوں اور ہمیشہ مجھے یاد بھی رہے گا وہ اپنے ناہموار کوٹ' گرآلود' لمبے پھٹے جوتے' ترکی ٹوپی کے ساتھ گدھے پر کچھ لکڑی کے ساتھ کوچہ ترکستان کے بازار میں چل رہا تھا۔ وہ بہت خوش اخلاق' پرخلوص مگر بہت غربت میں مبتلا ہو چکے تھے۔ وہ اپنی مادری زبان بھول چکا تھا مگر فارسی روانی سے بولتا تھا۔ موصوف حافظ اور سعدی کے اقوال سناتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو ہر ایک تقریب میں بلایا جاتا تھا لوگ ان سے بات کر کے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ ان سے بولتے تھے،'آہ! عبداللہ بیگ، 'میں نے آپ کے والد صاحب کے ساتھ کئی بار شراب پیا ہے لیکن آپ ایک قطرہ بھی نہیں پیتے ہیں'۔ انہوں نے کبھی ہنزہ کے ریاستی معاملات پر بات نہیں کی نہ ہی اپنے بھائی کی تحقیر اور شکایت کی۔ ان کی خواہش کی بناء پر ان کو یارقند میں واپس آنے کا اہتمام کیا گیا کچھ عرصے بعد یارقند میں وفات پا گئے۔ ان کا بھائی سرحدی معاملات کے سخت اصولوں کا نشانہ بنے جن کی سختی سے مذمت کی گئی۔ میر صفدر علی خان کو کوئی انصاف نہیں ملا ان کی حکومت چھین لی گئی ان کو ایک لفظ

بھی اپنے حکومت کے بارے میں یا ان کے حق میں کچھ کہنے نہیں دیا گیا اور نہ ہی ان کو کوئی مناسب وظیفہ دیا گیا جس سے وہ زندگی گزار سکے۔ یاد رہے یہ کوئی برطانوی حکومت کا معاملہ نہیں تھا بلکہ وہ منچو(منچوریا چین میں رہنے والے منگولی نسل کے لوگ جنھوں 1644ء میں چین فتح کرکے وہاں شاہی حکومت کی بنیاد رکھی تھی) کی سلطنت کی نگرانی میں تھے۔ دوسری طرف چین کی طرف سے سالانہ میر کو اسلحہ کے ساتھ ان کو برطانیہ کے ساتھ لڑنے کی ترغیب بھی دی جاتی تھی۔ جلا وطنی میں بے یارومددگار اور فاقوں کے باوجود اگر بوڑھا میر چین کے عہدہ داروں کو ترکستان کے مرحوم Lu Ju Shwe گورنر جنرل کا خط دیکھاتے جس میں لکھا گیا تھا کہ ''بحیثیت میر جاکر انڈیا کے ساتھ لڑیں''، اس صورت میں چینی وعدہ خلافی کی وجہ سے قصور وار ثابت ہوتے کیونکہ میر چین کے جاگیردار ہونے کے ساتھ دور افتادہ اور وحشی علاقوں کا محافظ تھا لیکن اپنی غربت اور جلاوطنی کی وجہ سے وہ سب کی نظروں میں قابلِ رسوا ٹھہر چکا تھا۔

چین اور ہنزہ کے درمیان مخصوص تعلقات کے موجودہ حالات پر لکھنا بہت ضروری ہے۔ میرصاحب کا دعویٰ ہے کہ تغدمبش (Taghdumbash) پامیر سے نیچے اروگ جلگہ(Uruk Jilga) تغدمبش کے دائیں جانب تاشکرغن کے دریا تک اور دفدر (Dafdar) سے بھی نیچے ان کی ریاست کا حصہ ہے۔ میر صاحب ان خانہ بدوشوں سے سالانہ کی بنیاد پر خراج رسن اورنمدہ ایک سو پچاس روپے کے برابر لیتے ہیں۔ وہ اپنی رعایا کے لئے ان چراگاہوں کے خراج کا بھی دعویٰ کرتے ہیں یہاں تک کہ اپنے اور تاشکرغن کے لوگوں کو آنے جانے کے اجازت نامے بھی دے رہے ہیں۔ چینی اور ہندوستان کی سرحد پر واقع رسکم پر میر کا دعویٰ کے ساتھ ان کا اصرار ہے کہ وہ وہاں مویشی چرانے کے ساتھ تعمیرات اور

رہائش بھی اختیار کرسکتے ہیں۔ چین کے اطراف بالائی پامیر میں میر کو حکمرانی کے علاوہ کافی مراعات دی گئی ہیں۔ وہ ان زمینوں میں زمینداری کے ساتھ اپنے مویشی پال سکتے ہیں کسی اور کو یہ حق نہیں۔ اگر میر وہاں رہتے ہیں اور خانہ بدوشوں سے خراج لیتے ہیں تو یہ ان کے آپس کا معاملہ ہے۔اگر وہ لوگوں کو پاسپورٹ دیتا ہے تو یہ بھی صرف ملکیتی شناخت کے لئے ہے۔ جہاں تک رسکم کا معاملہ ہے میر کبھی وہاں نہیں رہا ہے نہ اس حوالے سے کچھ ہوا۔

ہر سال میر اپنے ایلچی کو سونے کے تحائف کے ساتھ وہاں بھیجتا تھا۔ یہ تحائف چین کے صوبہ کاشغر کا گورنر وصول کرتا اور بدلے میں میر کو تحائف ارسال کرتا تھا۔ ان تحائف میں ایلچیوں اور دوسرے لوگوں کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ اس طرح طرفین میں تجارت ہوجاتی۔ یہ اخراجات چینی حکومت کی بجائے وہاں رہائش پذیر دیہاتیوں اور خانہ بدوشوں سے پورے کیے جاتے۔ سونے کی قیمت باہر دس پونڈ کے برابر ہوتی تھی اوراس کے لئے ہلکی پھلکی محصول بھی دینی پڑتی تھی جو سونے یا اناج کی صورت میں ٹیکس ہوتی تھی جس کو ہنزہ خاص کے ہر گھر سے وصول کیا جاتا تھا۔ چین کی طرف سے دیئے جانے والے تحائف کی قیمت مارکیٹ میں چالیس پونڈ کے برابر یا اس کے اس پاس ہوتی تھی۔ ان تحائف میں دو جوڑے جوتے' چاندی' ریشم' چائے کے کپ' پسی ہوئی چائے' معمولی کپڑے اور دوسری مقامی مصنوعات شامل ہوتی تھیں۔ پہلے پہل تمام سفری اخراجات بھی چینی دیتے تھے لیکن اب صرف دس دن کی مراعات ملتی ہیں وہ بھی سرحدی علاقے کے سفر کے دوران تک۔ اس موقع پر دیئے جانے والے تحفوں کی ایک تصویر بھی بنائی جاتی ہے جس کا مقصد یہ باور کروانا ہے کہ چین کی فرمانبراری کے عوض خراج ادا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ سامان اروچی بھیجا جاتا تھا۔

پامیر کمیشن کے سرحدی حدود کے تعین کے بعد میر اور چین کے درمیان موجود حقوق منسوخ کر کے تحائف یا دیگر معاملات کے تعین کو محدود کر دیا گیا ہے۔ کاشغر میں برطانوی کونسل کے عہدہ دار تمام معاملات کو بلائے طاق رکھ کر میر اور ان کے معاملات میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتے۔ میر مہینے میں ایک دفعہ بمشکل ان کو یہاں سے گزرنے دیتا تھااس مجبوری کی وجہ سے ان کے استحقاق کو برداشت کرتے تھے۔معمولی غلطی سے تمام معاملات خراب ہوسکتے ہیں اس لئے وہ میر کے ساتھ احتیاط اور محتاط روّیے سے پیش آرہے ہیں۔ ان کی ناراضگی اور شک کو دور کرنے کی غرض سے برٹش اہلکار جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ چھوٹے موٹے انحراف کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ایسا دیکھائی دیتا تھا کہ وہ اپنے اور قومی سطح کے مفادات پر بعض اوقات میر کو خرید لیتے تھے۔ اس وقت 250 پونڈ ایک بڑی رقم ہوسکتی ہے میر کے لئے صرف ایک کیک یا کھانے کی رجحانات کے بجائے اپنی تمام تر توجہ ہوشیاری سے سیاسی اور سرحدی معاملات پر مرکوز کر دینی چاہیئے۔

نگر اپنی ریاستی حدود اور تاریخی لحاظ سے بہت شہرت کے حامل رہا ہے جس کی شہادت پونیال اور یاسین کی ریاستیں بھی دیتی ہیں اس لئے اس کے بارے میں تفصیل سے لکھنا بہت ضروری ہے۔نگروالے پہاڑی علاقہ قلیل آمدورفت اور بے حسی کا شکار رہنے کے باوجود ہنزہ جیسے غضبناک ہمسائیوں کے ساتھ ہمیشہ ناقابل شکست جنگیں لڑ چکے ہیں۔ اگرچہ کبھی ہنزہ کو شکست نہ دے سکے مگر آزاد رہ کر کشمیر کی فرمانبرداری میں اپنی بقا کو یقینی بنا سکے ہیں۔نگر پر عموماً کشمیر بلکہ ہمسائیوں کی بالادستی ہمیشہ رہی ہے۔ درحقیقت نگر کی کمزور حیثیت اور فرمانبرداری کو کبھی بھی سختی سے آزمایا نہیں گیا زیادہ تر ان کو نظرانداز کیا جاتارہا۔ پہلے نگر گلگت کے شین راجوں کے قبضے میں تھی یہاں کے میروں نے گلگت کے راجوں کی بیٹیوں سے

شادیاں کر کے غلمت، نلت، تھول اور پسن وغیرہ کو جہیز میں حاصل کیا۔

گلگت میں سکھوں کے قبضے (1842-47) کے دوران نگر اور سکھوں میں دوستانہ اور قریبی تعلقات تھے۔ اس لئے نگر کے میر کے چھوٹے بیٹے علی دادخان کو گلگت کا راجہ مقرر کیا گیا۔سکھوں کے ساتھ بہتر تعلقات کے باوجود 1848ء میں نگر نے ان کی بالادستی قبول کی۔ 1863-67ء کے دوران جب ڈوگروں نے گلگت پر حملہ کیا تو مہاراجہ کشمیر نے نگر کو اتحادی بنانے کی کوشش کی مگر اہل نگر بے اعتبار ثابت ہوئے۔نگر والوں کو کئی نادر مواقع ملیں مگر وہ نہ تو ان سے فائدہ اٹھا سکے اور نہ ہی کوئی تاریخ رقم نہ کر سکے بلکہ ہمیشہ حقیر ثابت ہوئے۔

ہنزہ نگر کی جنگ کے بعد بوڑھے میرظفرخان نے 1904ء میں اپنی وفات تک برائے نام حکمرانی کی۔ موجودہ میر سکندر ان کی زندگی میں ہی ان کے نائب بن کر والد کی طرح ناکام ثابت ہوئے۔ ہنزہ اور نگر کے میروں کو لوگ احتراماً نَذور (Nasr) اور بعض اوقات سُری (Suri) کہتے تھے۔ مثال کے طور ان سے کوئی تحفہ وصول کریں تو فخر سے کہتے تھے کہ مجھے سُری نے تحفہ دیا ہے۔ یہ لفظ (شری) سنسکرت زبان کا ہے جو ہندواحترام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ میر کے گرمائی محل کی جگہ کا پرانا نام بھی یہی تھا جس کو میر نے بدل کر کریم آباد رکھ دیا۔ ہنزہ اور نگر میں میروں کو تھم کہا جاتا ہے؛ میر کا خطاب صرف اجنبیوں سے بولنے کے لئے گلدستے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تھم (یہ لفظ تھم یا رُم کے قریب ہے) کا لفظ چینی زبان کے خطابی لفظ (Tung) تُن سے ماخوذ ہوسکتا ہے۔

تمام میر صاحبان کھلے دربار میں اپنے وزیروں کے ساتھ عدل و انصاف کے معاملات طے کرتے اور اسی دن سے طے شدہ اصول نافذ ہوجاتے تھے۔

اکثر فیصلے اچھے رہتے تھے بعض اوقات ان کے مشیر الفاظ کی تشریحات بدل کر رائے دینے کی کوشش کرتے کہ 'اس کے بجائے یوں ہوتا تو اچھا رہتا'۔ مشیروں کی رائے ایک حد تک مانی جاتی تھی لیکن جرمانہ زیادہ ہوتا تو مشیروں کی رائے رد کی جاتی تھی کیونکہ جرمانے کی رقم خزانے سے ہوکر میر کے جیب میں پہنچ جاتی تھی جس کی وجہ سے علاقے کے معتبران میں ناراضگیاں پیدا ہوتی تھیں!

عموما ہنزہ اور گلگت ایجنسی کے دیگر علاقوں میں انتظامیہ کو گاؤں سطح پر متعارف کرایا گیا ہے۔ نمبردار یا ترنگفہ گاؤں سطح کی ذمہ دارایاں پوری کرتا ہے اس کے ماتحت بھی چھوٹے چھوٹے عہدہ دار نامزد ہوکر لوگوں کے بنیادی مسائل کا حل نکالنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن ان کا معاوضہ نمبردار کھا جاتا ہے۔ ان عہدہ داروں میں سب سے بنیادی اہم کام چھربو کیا کرتا ہے جو تمام مسافروں اور سیاحوں کے لئے معلوماتی مواد فراہم کرتے ہیں۔ ہنزہ میں چھربو اور نمبردار کے درمیان ایک اور عہدہ اویم (Uyum) کے نام سے موجود ہے۔ گاؤں کے عہدہ داروں کی مخصوص ذمہ داریاں ہوتی ہیں جو مقامی جھگڑوں اور معاملات کے حل کے ساتھ محصولات کے حصول اور دیگر واجبات کی وصولی کرتے ہیں جن میں سے ان کو بھی کچھ مل جاتا تھا۔ میر کا ذاتی نمائندہ یرپا کے نام سے جانا جاتا ہے جو میر کی ذاتی جائیداد اور زمینوں کے تحفظ کے ساتھ اس کے ذاتی پیچیدہ معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔ میر بھی اس کے بارے میں ہمیشہ باخبر رہتا ہے۔

دیدہ و دانستہ تفصیل لکھنے کا مطلب ہنزہ اور نگر والوں کی سیدھی سادی زندگی کو بیان کرنا ہے جو اپنے آباؤاجداد کی طرز زندگی کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ نظام لوگوں کے لئے مناسب ہے اور مشرقی نظام ریاست کے ساتھ بھی مماثلت رکھتا ہے لیکن اس نظام کی کامیابی کا دارومدار ان کے حکمرانوں کی شخصیت

پر ہے جو منصف، مختارکل اور آمر ہوتے ہیں جن سے بڑھ کر کوئی بڑا نہیں ہوسکتا!۔

باب نمبر 12

گلگت ایجنسی کے لوگ

گلگت ایجنسی کے لوگوں کے بارے میں لکھنا ان کی تعریف و توضیف سے بہت آسان ہے۔ کسی بھی صورتحال میں دور دراز کے قبیلوں کی تاریخ کے بارے میں جاننا کوئی آسان کام نہیں خاص طور پر اُس وقت جب ریکارڈ کی ضرورت پڑتی ہے؛ ابتدائی طور پر مسئلہ تب پیچیدہ ہوجاتا ہے کہ جب ہم اس علاقے کے لوگوں کے لئے 'درد' اور 'دردستان' جیسی اصطلاحات کا استعمال کرتے ہیں، یہ اصطلاح نہ صرف گلگت بلکہ دریائے سندھ کے علاقوں کے ساتھ لدّاخ سے پنجاب تک کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ یہاں یہ بات کہنا کافی ہے کہ اس ریاست میں لوگ ان اصطلاحات سے متعارف ہی نہیں اور 'دردستان' اصطلاحی طور پر بہت مبہم ہے۔ ان اصطلاحات کو خواہ مخواہ کریدنے کی ضرورت نہیں صرف یہی اندازہ کافی ہے کہ ان علاقوں کی درجہ بندی کے لئے یہ غیر مناسب یا غیر مطابق الفاظ ہیں۔ یہ اصطلاحات اس مسئلے کو اور مبہم کردیتے ہیں خاص طور پر اُس وقت جب ڈریو جیسے زیرک محقق بھی اس جیسی کمزور اصطلاح کا سہارا لیتا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب وہ اس علاقے کے بارے میں لکھ رہا تھا تب یہ علاقے بہت غیر متعارف اور گمنام تھے۔

بڈلف نے ڈریو کے بعد ان علاقوں کے بارے میں لکھا ہے اور وہ دریائے سندھ کے بائیں جانب کوہستان کے صرف ایک ہی قبیلے کو درد لکھتا ہے باقی کسی بھی طبقے کو وہ ان کے ساتھ مکمل طور پر منسلک نہیں کرتا ہے۔ اس نے

مضحکہ خیز انداز میں لیکن بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ تجویز پیش کی ہے کہ یہ لفظ کشمیریوں نے ان تمام وحشی قبائل کی عرفیت کے طور پر استعمال کیا ہے کیونکہ وہ بہت زیادہ جنگلی، وحشی اور راہزن تھے (درد کے معنی شکاری جانور/ڈہیو کے معنی لوٹنے والا یا درندہ فارسی میں خونخوار کو بھی کہتے ہیں)۔ اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ ماضی اور ان کے نسلی جغرافیائی حوالے اور نظریات پیش کرنے کے بجائے موجودہ گلگت ایجنسی کے لوگوں کے بارے میں بحث و مباحثہ کروں۔ اس معاملے میں بدقسمتی سے لفظ 'یشکن' بھی 'درد' کی طرح بے معنی اور فضول ہے جو اس بحث کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن کر ابھرا ہے۔ یہ بات قابل غور اور یاد رکھنے کی ہے کہ جب ہندو مذہب پورے ملک میں رائج تھا تب ان کی ذاتوں کے نام دیئے گئے جو یہاں اب مختلف ناموں سے ظاہر ہوکر لوگوں کو نسلی اور ذاتی تقسیم کا سبب بن رہے ہیں۔ اس لئے 'یشکن' کی اصطلاح بھی اپنی تمام تر شکل میں اسی بحث سے منسوب ہے جس کی وجہ سے معاملہ مبہم ہے اس کے معنی زمیندار یا کسان سے آگے کچھ نہیں۔ یشکن زراعت پیشہ ہیں اور جس نسل سے ان کا تعلق ہے اس نے کاشتکاری کو اپنی مصروفیت بنائی ہے۔ اس اصطلاح کے کوئی معنی نہیں مگر جب یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو کافی مشکلات درپیش آتی ہیں کیونکہ پہلے والا لفظ کسی شناخت یا قدر کا عکاس نہیں۔ یہ اصطلاح ڈریو اور بڈلف نے اس لئے استعمال کی ہے کہ ان کا خیال ہے کہ تمام گلگت ایجنسی کے لوگ ایک ہی نسل سے تعلق رکھ سکتے ہیں۔ یہ کہنا بعید از قیاس ہے کہ یہ ساری آبادی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو۔ سب کا کاشتکاری سے منسلک ہونا ایک ہی نسل سے ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ اس صورت میں وہ خاندان جو خود کو اعلیٰ نسلی قرار دیتے ہیں وہ بھی تو کاشتکار ہی ہیں۔

شین:جو قدیم زمانے میں اعلیٰ نسل کے بنیاد پرست ہندو تھے، مسلمان ہونے کے باوجود اپنے اولین عقیدے کے کئی حوالوں اور رسوم سے ابھی تک وابستہ ہیں۔

رونو :کسی ذات پات کا نہیں ایک خاندان یا نسل کا نام ہے میرے خیال میں ان کے مغربی علاقوں سے آنے کے کئی آثار نظر آتے ہیں۔مگر وہ عرب کے اطراف سے آنے کا دعویٰ کرتے ہیں، جن افراد سے میں ملا ہوں وہ اپنے لمبے قدٗ مضبوط ہڈیوں اور عقابی خصوصیات کی بناء پر اپنے ہمسائیوں سے کافی مختلف نظر آتے ہیں۔

ان علاقوں کے لوگ برطانوی قبضے اور خاص طور پر اسلام کی آمد و تبلیغ کے بعد زیادہ ابھرکر سامنے آئے ہیں۔ آپس کی شادیوں اورنقل وحمل کی وجہ سے خاندانوں اور ذاتوں کی شناخت کے رجحانات میں کمی آرہی ہیں۔ چندعشرے بعد یہاں صرف اور صرف مسلمانوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا یہاں تک کہ ایک نصف صدی پہلے کی ذاتوں اور خاندانوں کا رواج غائب یا ختم ہوجائے گا۔

شین قبیلے کے لوگ اب بھی دوسروں سے منفرد نظر آنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال دینے کا مقصد ذاتی تعصب یا امتیاز نہیں پہلے پہل ایسا بھی ممکن تھا۔ موجودہ زمانے میں ان کی زندگی کے طور طریقے زیادہ تر ہندو مذہب کے عکاس ہیں جو وہ چھوڑ چکے ہیں۔ کہاجاتاہے کہ شین پاکلی(شنکیاری مانسرہ سے اوپر بارہ مولا کشمیر سے سوات کی سرحد تک کے علاقوں کو ماضی میں پاکلی کہتے تھے: مترجم) سندھ (Indus)سے آکر شمال کی طرف ریاستیں تشکیل دیتے ہوئے گلگت اور بلتستان تک پہنچے۔ اعلیٰ ہندونسل سے تعلق کی وجہ سے ان کے چند بڑے ان ریاستوں میں نمایاں حکمران بھی رہے ہیں۔ آج کل کے شین بہت منتشر اور

بکھرے ہوئے ہیں خاص طور پر گلگت ایجنسی اور چلاس کی نصف آبادی شینوں پر مشتمل ہے ان کے علاوہ بگروٹ میں تقریباً سب شین ہے۔(حاشیہ: یاسین ‘ اشکومن‘ کھو اور غذر میں کوئی شین موجودنہیں ہے۔ بہت سارے چھپروٹ میں آباد ہیں تین چار گھر گلاپور میں کچھ اور پونیال یا یاسین میں ہوسکتے ہیں۔ مناور گلگت میں نصف شین ہیں۔ موجودہ وقت میں ان کا اصل مسکن سندھ کوہستان یا غستان ہے یہاں تک کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ داریل اور جگلوٹ میں بھی نصف شین آباد ہیں)۔

شین اپنے آپ کو اب بھی اس ملک کی اشرفیہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے اس دعوے کی کوئی عمومی شناخت نہیں۔ یہ بڑے گھمنڈی لالچی اور الگ تھلک رہنے والے لوگ ہیں۔ گائے کشی کے بارے میں ان کا تعصب تقریبا ختم ہوچکا۔شین زیادہ تر مسلمانوں کا شیعہ فرقہ اپناچکے ہیں ابھی تک دیوی کو مہذب سمجھنے کو عار نہیں سمجھتے جو ان کی قدامت پسندی ظاہرکرتی ہے۔ گائے کے گوشت اور دودھ سے مکمل پرہیزکرتے ہیں کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ وہ اکثر پہاڑوں میں گزارتے ہیں جہاں پریاں اور دیویاں ان کی حفاظت کرتی ہیں اگر وہ کوئی نجس کام کریں تو یہ دیویاں نقصان پہنچاسکتی ہیں۔ وہ ایسا کرنے سے کاہل اور سست بھی پڑ سکتے ہیں۔ شکاری اور چرواہے بھی کبھی گائے، بچھڑے کا گوشت یادودھ نہیں استعمال کرتے ہیں۔ عورتیں گائے کے بچھڑوں کو گائے کا دودھ پلواتی ہیں ماضی میں وہ گائے پر ہاتھ لگانے سے گریز کرتی تھی بلکہ قریب جانے کے بجائے لکڑی کی مدد سے بچھڑے کو گائے تک پہنچاتی تھیں۔

شین اصولی طور پر اپنے ہی قبیلے میں شادیاں کرواتے ہیں۔ شادی سے پہلے کوئی لین دین نہیں کرتے۔ جہیز میں ایک چاقو اور دس یارڈ کپڑے کے ساتھ

پانچ روپے مہر مقرر کرتے ہیں۔ شادی کے موقع پر دولہے کے گھر والے کھانے کی دعوت دیتے ہیں اور کوئی ضیافت و تفریح نہیں ہوتی جبکہ لڑکی کا باپ کچھ زیورات اور کپڑے دیتا ہے۔

مخصوص ایام حیض میں خواتین کو گھر سے دور الگ مقام میں رکھ کر مخصوص برتن کے ساتھ کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے۔ مخصوص ایام کے بعد غسل کرکے کپڑے بدل کر مسکن کو صنوبر کے دھویں سے پاک کرکے دوبارہ اپنے گھر چلی آتی تھیں۔

کنجوسی اور تنگ دلی شینوں کا شیوہ ہے یہی خاصیت ان کی نامقبولیت کا سبب بھی بن رہی ہے اس کے بارے میں دوسری نسل کے لوگ بھی کہا کرتے ہیں کہ تمام شین کھجونی شنواری کی طرح بیکار ہیں۔ دیگر قبیلوں کے لوگ شین کو ڈھنگارِک کہتے ہیں یعنی گائے والے لوگ۔ بہرحال شین بہت محنتی کاشتکار ہیں ان کی زمینیں ہمیشہ زیادہ ہوتی ہیں یہاں تک کہ کہیں زیادہ زمین ملنے کا امکان ہوتووہ موروثی زمین چھوڑکرزیادہ والے میں چلے جاتے ہیں۔

شین اپنی مشکوک عادت کی وجہ سے اپنی رقم اور جائداد چھپا کر رکھ لیتے ہیں۔ ان کی یہ عادت اب بھی موجود ہے۔ ماضی کے مخدوش اور غیر محفوظ حالات میں ایسا کرنا عام تھا۔ شین عموماً عاقبت اندیشی کے طور پر اکیلے پہاڑوں میں جاکر اپنی رقم و جائیداد دفنا کر احتیاط سے پتھروں کے اوپر سے گزرتے ہیں تاکہ پاؤں کے نشان بھی نہ رہے۔ عموماً اس طرح کے خزانوں کے بارے میں وہ اپنے وارثوں کو بتاتے تھے بعض اوقات اچانک موت کی وجہ سے یہ راز پوشیدہ رہ جاتی تھی۔ بسا اوقات خاندان والے ان خزانوں کی تلاش کرکے اپنا وقت ضائع کرتے کیونکہ وہ بہت ہوشیاری اور احتیاط سے دولت واسباب کو چھپاتے تھے۔ عموماً میں

شین سے کہا کرتا تھا کہ اگر میں سائنسی آلات کی مدد سے ان چھپے خزانوں تک پہنچا نہیں پہنچ سکا تو؟ اتنے فخریہ کام کے باوجود یہ بہت بیوقوف ہیں۔ دور دراز علاقوں میں کوئی بھی تاجر ان کے پاس نہیں جاتا کیونکہ وہ بازار کے رائج قیمت کی بجائے گلگت سے بھی بہت زیادہ قیمتیں مانگتے تھے۔ ان کی لالچ کو آفرین اپنی پیداوار کو گلگت لے جاکر سستا بیچتے مگر گھر کی دہلیز پر منافع کمانے کا موقع ضائع کر دیتے تھے۔

ہم نے آزمایا کہ یہ لوگ سیزن سے پہلے ہی عمارتی لکڑی جمع کرتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ ہل اور کڑی بنا کر دھوپ میں سکھانے کے لئے رکھ دیتے ہیں چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔ لوگ دیسی غلیظ قسم کا موٹا اونی کوٹ اور ایک کٹن شرٹ جو پتہ نہیں کہاں سے لاکر پہنتے ہیں۔ان کی ٹوپیاں بہت گندی دُھلی ہوئی نہیں ہوتی ہے۔

شین کا ماننا ہے کہ گائے پاکیزہ اور مافوق الفطرت ہوتی ہے ۔ مشہور زمانہ روایت ہے کہ اگر سمائر نگر یا نومل کے سامنے جگلوٹ میں کوئی گائے' اس کی کھال یا گائے کے جسم کا کوئی حصہ پانی میں گرجائے تو ایک دم آندھی اور طوفان آجاتی ہیں۔

رونو: رونو اچھی نسل کے لوگ ہیں۔ تعداد بہت کم ہونے کے باوجود اکثر وزیر اسی ذات کے ہوتے ہیں۔ شاید چترال میں کوئی تین سو یا اس کے آس پاس خاندان ہونگے۔ رونوں نسل کے لوگ راجوں کی ناجائز بیٹیوں سے شادی کرکے بدلے میں اپنی بیٹیوں کی شادیاں راجوں اورسید زادوں سے کرواتے ہیں۔

نگر اور یاسین میں یہ لوگ اپنے آپ کو حرا (Hara-or Harair) کہتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ محمد حنیفہ ابن علی جو رسول کے داماد تھے' کے

وارث ہیں، دوسرے کہتے ہیں کہ یہ نسل زون' رونو یا حرائی سوملک کے ایک بیٹے مستوج کے حکمران کی اولاد ہیں۔ یہ روایات یقین کے قابل نہیں۔ ان سب کے باوجود زونو دوسرے ہمسائیوں کی نسبت ہر لحاظ سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں پر دوسری ذاتوں اور پیشوں کا تفصیلی ذکر بھی ضروری ہے۔ کمین (چکی پسنے والے اور قلی) ہنزہ نگر میں نہیں ہیں۔ ڈوم(موسیقار' لوہار اور موچی) یاسین' چلاس اور نگر میں بہت زیادہ ہیں۔شُوٹو چمڑے کا کام کرتے ہیں صرف نگر میں ملتے ہیں۔ میرے خیال میں سوائے ڈوم نسل کے سالانہ دوسرے ذاتوں میں فرق کم ہوتا جارہاہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں امتیاز ختم ہوتا جائے گا۔

دور حاضر میں گلگت ایجنسی میں موجود بڑی بڑی ذاتوں کی تفصیل کے بعد ان کی نسلی شجروں کے بارے میں بہت کچھ کہنا ضروری ہے مگر پہلے ہی ایسا کرنے کی مشکلات کی نشاندہی کر چکا ہوں۔

جس طرح نگر والوں کو بلتی اور دریائے سندھ کے قبائل کی نسل سے منسوب کیاجاتاہے اسی طرح ہنزہ میں بھی متفرق نسل کے لوگ آباد ہیں۔ بالائی ہنزہ(گوجال) اور اشکومن میں وخی ایرانی النسل واخان کے خانہ بدوش قدیم فارسی قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کو فوراً پہچاناجاسکتا ہے۔ باقی گلگت ایجنسی کے لوگ حالات و واقات کے متفرق نسل کی پیداوار ہیں۔عموما ان کو تین حصوں میں دیکھا جاسکتاہے ان میں پہلے یاسین دوسرے پونیال اور کم وبیش تیسرے کھو و غذر کے لوگ ہیں جن کو دوسرے باشندوں کی نسبت کمترنسل سمجھا جاتاہے۔ پونیالی اور یاسینی کسی حد تک ہنزہ کے لوگوں کے برابر ہیں۔ بہت کاہل اور سست ہونے کے باوجود اچھے پہاڑی شکاری اور دیگر خاصیتوں کے مالک ہیں۔ بہرحال یہ اپنے دوسرے ہمسائے نگر' اشکومن اور گلگت والوں سے بہت بہتر ہیں۔

تحقیق و مشاہدے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ یہ نسلیں زیادہ تر کوہستان سے آئے ہیں۔ اس لئے دریائے سند ھ اورسوات کے درمیانی علاقوں کے ساتھ زیادہ شمال کی جانب داریل تانگیر کے علاقوں کی جنگلی و غیر تہذیب رویوں کے حامل ہیں۔ اس حوالے سے یہ دلیل کسی حد تک درست ہے کہ داریل اور تانگیر میں یاسین اور پونیال کی کافی خاصیتیں پہنچ چکی ہیں جو خوش وقت حکمرانوں کی مرہون منت ہے۔ ان کے علاوہ وہ علاقے جہاں علاقائی قوائدوضوابط اور اسلامی روایات رائج ہوچکے ہیں آپس میں اور باہر کی دنیا کے ساتھ روابط میں بہتری آئی ہے۔ ایک طرف طاقتور خوش وقت ہوشیار ہونے کے باوجود سخت غضب ناک غلطیوں اور کوتاہیوں کے مرتکب ہوکر تباہی و بربادی ہوئی اور دوسری طرف چترال کے ساتھ مراسم کی وجہ سے ان پر بہت گہرے اچھے سماجی اور موسیقی کے اثرات مرتب ہوئے۔ چترالی ہمیشہ زبردست شکاری اور کوہ پیا تھے ان ہجڑوں کی طرح سست مخلوق نہیں۔ وہ صرف زمینی جغرافیائی خدوخال کی وجہ سے شمال کی جانب دریائے سند ھ کے ساتھ بلتی اور گلگتیوں سے آزاد اورمحفوظ رہ سکے ہیں۔

اشکومن یاسین کا متصفیہ علاقہ ہے گلگت،بگروٹ اور قرب وجوار سے لوگوں کو لاکر اشکومن میں بسایاگیا۔ ان نو آباد کاریوں میں بلتستان کی طرف سے نگر اور بگروٹ کے ملحقہ علاقوں کی طرف لوگ بالکل نہ آنے کے برابر ہیں۔مگر گلگت کی متفرق آبادی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان سب کے تانے بانے کوہستان سے جا ملتے ہیں۔ جس طرح یاسین اورپونیال میں مختلف لوگوں کو لاکر آباد کیا گیا یہی کچھ گلگت میں ہوا۔ ان سے پہلے کی بستیاں بالکل خالص تھی بعد آزاں ذات پات کی ملاوٹیں ہوتی رہی۔ میرے خیال میں کوہستان کی طرح چترالی بھی اصلی مقامی باشندے ہیں۔ چترالیوں نے اپنی مادری زبان کسی حد تک اپنے مفتوحہ غذر

کے علاقوں تک پھیلا لیاہے۔ اسی طرح شین نے غالباً جنوب کی طرف سے دریائے سندھ (کوہستان) کے ساحل کے ساتھ مضبوطی سے پھیل کراپنی زبان اور ہندو تہذب کے بعض رسوم اورذات پات کو دوسرے نسلوں میں منتقل کرکے گلگت تک پھیلا دیا ہے ۔

ان نظریات کی موجودگی میں گلگت' یاسین اور پونیال کے مضافات کے وحشیانہ اور غیر معقول نسل کی نرینہ وار ترتیب کا قبلہ درست کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اختصار کے ساتھ نسلی اصلیت پرکھ کر مسئلے کا ایک حل پیش کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کوہستانی شین نسل کے ہیں باقیہ لوگ (سوائے ہنزہ والوں کے) آپس کے اختلاط سے وجود پذیر ہوئے ہیں۔

گلگت ایجنسی میں دراصل دو دلچسپ زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں ایک شینا ہے جوعموماپورے گلگت ایجنسی میں بولی جاتی ہے اور دوسری بروشسکی جو ہنزہ خاص اورنگر کے قصبوں کے ساتھ پونیال اور یاسین کے کچھ حصوں میں بولی جاتی ہے۔ قرمبر اشکومن کی وادی اور گوجال میں وخیوں کی اپنی زبان ہے۔ یاسین میں کچھ شینا' اچھی خاصی چترالی کھوار کے ساتھ بروشسکی جو ہنزہ کی زبان سے کافی مختلف ہے' صرف درکوت اور مضافات میں بولی جاتی ہے۔خوش وقت مہتران غذر اور یاسین کے درباری اور نجی محافل میں کھوار زبان بولی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یاسین اور اس کے گرد ونواح کے لوگوں میں کھوار بولنے کا رجحان بڑھ رہاہے یہاں تک کہ گلگت کے کئی علاقوں میں اس کومشترکہ زبان کے علاوہ مہذب دنیا کی زبانوں کی طرح سمجھا جانے لگاہے ۔بروشسکی کو اتنی پذیرائی نہیں ملی کیونکہ وہ بروش کی زبان ہے جن سے خوش وقت بہت نفرت کرتے ہیں۔ شینا کو بھی غذر سے نکال باہر کرنے کی لہر جاری ہے۔کھوار کی دو بڑی نشانیاں ظاہر ہوئی ہیں ایک

پورے پولیٹیکل علاقہ جات میں یہ بولی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہنزہ نگر میں کھوار کے بارے میں لوگ بالکل واقف نہیں صرف ہلکی پھلکی اگاہی پھیل رہی ہے۔

اردو جیسے پنجابی بھی کہا جاتاہے ہر کہیں سمجھی جاتی ہے اس زبان کی سمجھ آپ کو ان علاقوں کے سفر میں بہت معاون ثابت ہوگی۔

اس موضوع کا متفقہ خلاصہ یوں ہوسکتا ہے کہ'درد' کی اصطلاح جوکبھی پورے گلگت ایجنسی کیلئے صرف ایک ہی نسل کی عکاس تھی اب اس اصطلاح کو متروک قرار دینا چاہئے کیونکہ یہ بالکل مبہم اور بے ربط ہے۔ گلگت ایجنسی کے لوگوں کے درمیان جو فرق یا مختلف علاقوں میں جو ماحول اورسیاسی گہماگہمی وقوع پذیر ہورہی ہے وہ کوئی اتفاقیہ اوراچانک رونما ہونے والا امرنہیں۔ پونیال' یاسین' نگر اورشین لوگوں میں فرق کرنامشکل ہے اصولاً یہ لوگ کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی نسل اورمشابہت کے سمجھے جاتے تھے۔ ہنزہ کے لوگوں کا اپنے ہمسائیوں کے ساتھ کوئی میل نہیں۔ یورپ اور ایشیاء کے لکھاریوں کے نزدیک 'درد' کی اصطلاح اس قدر مرکزیت حاصل کرچکی ہے کہ انہوں نے دردستان کی کوئی نشاندہی کئے بغیر بلاسوچے سمجھے بہت زیادہ اس کو پھیلا دیا ہے۔ ہندوستان کے متواتر سفر کرنے والوں نے ان لوگوں کے حوالے سے پائے جانے والی نظریات کی دلکش قابل اعتبار تشریحات پیش کی ہیں کہ ہم آسانی کے ساتھ اس مسئلے کوسمجھ سکیں۔ ہنزہ کے لوگ شمال' نگر کے کم وبیش مشرق 'دوسرے مغرب اورگلگت مرکز کے لوگ جنوب سے آئے ہیں۔ دور افتادہ اور ناہموار ہونے کی وجہ سے گلگت کے لوگوں نے اپنی موجودہ باشندوں کی مختلف بنیادیں متعارف کرائی ہیں ورنہ ان کے طور طریقے یا عادات میں گوناگونی'متواتر ہجرت' نئے ماحول یااصلاح یا کسی طبقے کی وجہ سےنہیں

بلکہ پہلے سے موجود تھیں ان میں مشابہت اور عادتوں کی تشکیل یہاں آنے کے بعد وقوع پذیر ہوئی ہے' ان کے اصل مشترک معاخذ میں سراغ نہیں ملتا۔

باب نمبر13
ہنزہ نگر کی جنگ

گلگت ایجنسی کی مضبوط تشکیل کے لئے 1891ء کو ہنزہ نگر میں کاروائی کی گئی۔ انڈیا فطری طور پر انتہائی شمال مغربی سرحد کیلئے بہت دلچسپی لے رہی تھی لیکن اس مقصد کے لئے حالات کا جائزہ سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ اس لئے 1878ء کو میجر بڈلف کو اس مشن پر بھیج کر واپس بلایا گیا۔ بعدازاں گلگت چترال مشن کو 86-1885ء میں بڑے پیمانے پر تشکیل دیکر ان علاقوں کی طرف بھیجا گیا۔ جس کے نتیجے میں کرنل الجیرن ڈیورنڈ کی قیادت میں گلگت ایجنسی تشکیل پائی اور کھل کر سیاسی کام کرنا شروع کردیا۔ اس پروگرام کا مقصد چین' روس اور چترال کے ساتھ پیچیدہ سیاسی معاملات کو ٹھیک کرنا تھا۔اس مقصد اور حکومت ہند کی پالیسی کے مطابق ہنزہ نگر میں بھی فوجی کاروائی کرنی پڑی غالباً برطانوی انڈین حکومت کے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں روس نے اپنے آپ کو وسعت دینے کا سلسلہ جاری رکھ کر ان علاقوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ پیدا کیا جس کے لئے حکومت ہند کو چوکنا رہنا پڑا۔ ایک طرف اُس وقت قراقرم اور ہندوکُش کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی تھیں اس قلیل مواد کی بنیاد پر ان کو پرکھا جاتاہے۔ دوسری طرف بے چینی اور اندیشہ کے طور پر حکومت ہند ان واقعات کے بارے میں کچھ بھی پیش بینی نہیں کرسکتی تھی کیونکہ معلومات ہمیشہ مبہم اور قابل اعتبار ہوتے ہے ذرائع ابلاغ اور بدلتے حکمرانوں کے روّیے بھی اس معاملے کو اور پیچیدہ بنادیتے تھے۔ روس موجودہ سرحدی علاقوں کے

بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ حکومتی اہلکار اور انگریز روس کے ساتھ الجھ کر دوسری دفعہ پنجدہ (Penjdeh affair) نہیں چاہتے اور نہ ہی روس کی مداخلت کو برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ (1885ء کو پنجدہ کے مقام پر روس اور برطانیہ آمنے سامنے ہوئے تھے روس افغانستان اور ہند کے علاقوں تک پہنچنا چاہتا تھا)۔ اس صورتحال میں انہوں نے گلگت کے بارے میں انتہائی عقلمندی سے کام لیا۔ اس مہم جوئی میں ایک ہی چیز پر تنقید کی جاسکتی ہے وہ ہے ان کا منتشر روّیہ۔ جس کی وجہ سے خدشہ ہے کہ روس پہلے ہی کاروائی نہ کرے۔ اس خدشے کے پیش نظر کاروائی سے پہلے ہی معاملات کی درستگی ضروری تھی تاکہ ہنزہ نگر روس کے ساتھ وسط ایشیائی تعلق کی بناء پر کوئی سمجھوتہ نہ کر بیٹھے۔ حکومت ہند کے عہدہ دار اس لئے ہنزہ نگر میں کاروائی کرنا چاہتے تھے۔ اس بڑے ڈرامے کا اہم کردار آذرخان ہے جو نگر کے بوڑھے میر جعفرخان کا بیٹا ہونے کے باوجود اپنی ریاست میں خاص اہمیت سے محروم ہے۔ دوسرا کردار تھرا بیگ جو دادو کے نام سے جانا جاتا ہے' میر آف ہنزہ صفدرعلی خان کا وزیراور جنگ گلگت کے بعد ہنزہ کے لائق وزیر ہمایون بیگ کا سوتیلا بھائی ہے۔

اس تمام معاملے کو ورغلانے والا دادوخان ہے۔ یہ آدمی بہت قابل' دلیر اور دور اندیش ہے۔ مگر ناکامی کے بعد ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا مشرقی روایات میں ایسے لوگوں کے ساتھ بدقسمتی سے ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔

انگریزوں کی دوبارہ گلگت آمد کو ہنزہ اور نگر کے حکمرانوں نے دلچسپی اور گرمجوشی سے نہیں دیکھا۔ 1889ء کو گلگت میں ایجنسی قائم کرکے کرنل الجیرنڈ ڈیورنیڈ پولیٹیکل ایجنٹ بنا تھا اور پہلا دربار منعقد کرواکے مقتدر حکمرانوں کو اپنے حق میں کرلیا تھا۔ 1890ء تک اس نے اپنی پوزیشن کو بہت مضبوط بنایا تھا۔ کشمیری

فوج سے چارج لے کر ان کی فوجی طاقت میں بے پناہ اضافہ کردیا تھا جس کی وجہ سے بہت سے بیہودہ بدسلوکیاں ختم ہوگئی تھیں۔ سڑکیں' سپلائی کے دیگر معاملات اور دوسری ضروریات میں بہت بہتری آئی تھی اس لئے 1891ء میں ایجنسی ایجنٹ بہت محفوظ اور بہتر پوزیشن میں تھے۔ صرف ایک ہی خوف معلومات کے لئے دور افتادہ کشمیر تک رسائی ممکن نہ تھی جس کی وجہ سے پولیٹکل ایجنٹ کوکسی ناگزیر حالت میں کشمیر سے مدد ملنا مشکل نظر آتا تھا۔

1891ء کے بعد برطانیہ نے بہت ساری جنگیں لڑیں جس کی وجہ سے فطری طور پر ان کی اس عادت کو کاروائی کی بجائے تکبرانہ عمل سمجھا گیا۔ انگریزوں کا یہ روّیہ سراسر ناانصافی پر مبنی ہے۔ یہ درست ہے کہ سیاسی اہمیت کے حامل علاقوں میں جنگ کی ضرورت پڑتی ہے لیکن پہلے پہل چند بے محل واقعات چھیڑے گئے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں شکست سے غالباً روس جیسے ملک کو کاروائی کا موقع مل سکتا ہے جس سے وہ ہنزہ نگر پر اپنا تسلط جما سکتا ہے۔

فوجی لحاظ سے یہ جگہ بہت مشکل اور دشوار گزار ہے جس میں فوج کی تعداد اور سامان حرب بہت کم اور ناکافی ہونے کے ساتھ فوجی بھی دوسرے درجے کے تھے۔ پونیال کے لیوی اور کشمیر کے سپاہی تو تھے لیکن یہاں موجود انڈین کچھ فوجی تربیت یافتہ سپاہی ہیں۔ کرنل ڈیورنڈ کے مطابق ففتھ گورکھا کے 180 آدمی موجود تھے جن پر انحصار تھا۔

میرا نہیں خیال کہ ڈیورنڈ کو وہ اہمیت ملی ہو جو ملنی چاہئے؛ ان کو چار سے پانچ ہزار بلا امتیاز مصمم ارادہ کے ساتھ فوجی دستے کی اہمیت کا اندازہ تھا ان کو اپنی قلیل فوج کے ساتھ بھی جنگ سے دور بھاگنے کا تو سوال ہی نہیں تھا جس سے اس کو ناکامی کا طعنہ مل جائے۔

پولیٹیکل ایجنٹ ہونے کی وجہ سے ہرصورت اپنی فوج کے ساتھ اس کے پاس کاروائی کے علاوہ کوئی متبادل نہیں تھا۔ ایک بڑا خطرہ لے کر اس کی سیاسی بصیرت نے سب کچھ بھانپ لیا تھا کہ کاروائی کی فوراً ضرورت ہے مگر جس ریاست کے ساتھ اُس نے لڑنا تھا وہ شمال مغرب کی سرحدوں کی نسبت بہت سخت تھی ۔ ایسے حالات میں سڑک، پل اور رہنے کی جگہ کی فراہمی بھی بہت ضروری تھی۔ وہاں پہنچنے کے لئے گلگت ایجنسی کی سڑکیں، پل اور خاص کر ہنزہ کے دریا کے ساتھ بہت مشکل اور دشوار علاقے تھے جن سے گزر کر کاروائی کرنی تھی۔

سب سے پہلا خطرہ یہ تھا کہ آذر خان نے چھپروٹ اور چھلت کے قلعوں پر حملہ کرنے کی دھمکی دی تھی۔جس کی تفصیلات نائٹ کی کتاب ' Where Three Empires Meet (جہاں تین سلطنتیں ملتی ہیں)' میں ہیں اس سے بھی زیادہ تفصیلات ڈیورنڈ کی اپنی کتاب 'The Making of a Frontier (سرحدوں کی تشکیل) میں ہیں۔پولیٹیکل ایجنٹ نے ہر اس آدمی کو چھلت بھیجا جس کو وہ بھیج سکتا تھا لیکن اس دوران آذرخان نلت میں اپنی فوج جمع کر رہا تھا۔ بڑی عقلمندی سے دشمن کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا جس کی وجہ سے وہ اپنی جلد بازی سے باز آئے کیونکہ برٹش آرمی بھی بالکل ان کے دروازے پر تھی۔

میرا نہیں خیال کہ روس نے اس معاملے میں کسی پہاڑی حکمران کو انگریزوں کے خلاف بھڑکایا ہو یا ہنزہ نگر والوں کو ایسا کرنے کے لئے کہا ہو،ہاں یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اطراف میں اُن کی کسی بھی پیش رفت سے ان تمام پہاڑی لوگوں سے زیادہ باخبر رہتا ہے۔ میں نے حالیہ جنگ کے بارے میں بہت سے باخبر اور اعلیٰ کردار کے مالک لوگوں سے محاذآرائی کی وجوہات کے بارے میں

پوچھ گچھ سے پتہ چلا کہ مقامی تاریخ کے پچھلے پچاس سال میں یہ پہلا انوکھا واقعہ ہوگزرا ہے۔ یہ سب کچھ اُن کی اپنی آزادی چھن جانے کے خوف، اوروں پر حملہ کا رجحان بھی ہوسکتا ہے لیکن پس منظر میں یہ کام دادوخان (ترابیگ) ہی نے کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ خود میر بننے کا خواب دیکھ رہا ہوتا تومقامی لوگوں کا ردعمل اس کے برعکس ہوگا اس بات کا احساس دلانا مشکل تھا۔ دادو کی اس بدمعاشی کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا لیکن وہ تھا بڑی فراست والا۔ جنگی ضروریات کے پیش نظر حکمران خاندان کے بہت سارے جھگڑالو لوگوں کو قتل کرکے دونوں میروں کے اُن حریفوں کو ہٹا دیا گیا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جتنی دیر تک بھائیوں کو زندہ رہنے دیا گیا اتنے ہی میروں کے لئے ریاستی امن کے مسائل جنم لیں گے۔ لکھاریوں کی سوچ، سیاہی اوروقت صرف اِن وحشی حکمرانوں کو تنبیہ کر نے میں صرف ہوا لیکن وہ پھربھی وہ ایسا کام کرنے سے باز نہیں آئے۔یہ واقعات بالکل غیر ضروری ہیں کہ دادو خان اور آذرخان کو اُن کی اپنی بصیرت سے چلنے پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔

مجھے بتایا گیا کہ دادوخان صفدرعلی خان کو ہٹا کر ہنزہ نگر کو ایک ریاست بنانے کے آرزومند ہے تا کہ آذرخان کی قیادت میں وہ ہنزہ کا وزیر بن سکے۔ اگرایسا ہوا تو یہ بہت اچھی بات ہوتی جس کی تمنا کی جاسکتی ہے۔

دونوں ریاستوں کو ہمیشہ آپس میں لڑانے کی حوصلہ افزائی کی دیگر وجوہات بھی تھیں۔اِن کی صدیوں تک الگ تھلگ زندگی، جنگی نابلوغت، مشکل جغرافیہ اور برطانیہ کی موجودگی کی وجہ سے جنگی جنون چڑھ گیا۔ اس لئے موسم گرما ان کے ساتھ بیکار گفت شنید میں گزرگیا انگریزوں نے جتنا صبروتحمل سے کام لیا اتنے ہی یہ پہاڑی لوگ قابو سے نکلنے لگے۔ ابھی ہوشیاری سے کام لینے کی ضرورت تھی کیونکہ

چھلت پر مہم جوئی نہ ہوتی تو یہ اُن کے لئے اچھا تھا کہ اس مصیبت میں نہ گھر نہ جائے۔

حکومت ہند نے پولیٹیکل ایجنٹ سے بہت اصرار کیا اور پانچویں کورکھا کے دو سو آدمیوں کے ساتھ دو گن روانہ کئے جن کے ساتھ پندرہ برطانوی اضافی آفیسر بھی تھے۔ نومبر تک تمام تیاری مکمل کی گئی اور 29 نومبر 1891ء کو ڈیورنڈ نے دونوں ریاستوں کو دھمکی آمیز پیغام بھیجا کہ وہ آگے بڑھنے والے ہیں اس لئے آپ اپنے مخالفانہ اور جنگی روّیے سے باز آجائیں۔یکم دسمبر کو چھلت دریا پار کرکے دو دسمبر کو نلت بھی اُن سے چھین لیا گیا۔ پہلے ہی دن ڈیورنڈ خود زخمی ہوگیا اور تقریباً انگریز شکست تسلیم کرنے والے تھے کہ حیرت انگیز کامیابی ملنا شروع ہوگئی اورکسی دھمکی کے بغیر ہی جنگ ختم ہوگئی۔

جب مخالف فوج نلت کے قریب پہنچی تو صفدرعلی میرآف ہنزہ جو دادوخان اس منصوبے سے آگاہ ہوچکا تھا کہ وہ میرکو ہٹاناچاہتاہے۔ اس لئے میر نے گنش کے نمبردارخرم شاہ کو برطانوی لوگوں سے مذاکرات کرنے کے لئے روانہ کیا۔ حملے کو دادو اور آذرخان نے روک دیا تھا انہوں نے صفدرعلی خان سے کہا اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو جائیں لیکن وہ جنگ کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ میر اپنی مرضی سے آگے بڑھتا تو یہ ان دونوں منصوبہ سازوں کے لئے بہت اچھا ہوتا۔ صفدرعلی بھی دادو کو نکال باہر کرنے کا ارادہ کرچکا تھا مگر وہ اتنا مضبوط نہیں تھا کہ اُس کو نگر کے میر سے الگ کر سکے۔

میں نے بڑی تفصیل سے ہنزہ نگر کی جنگ کے بارے میں اس لئے لکھا ہے کیونکہ ان دونوں ریاستوں سے جنگ کا باقی علاقوں میں بھی اچھے نتائج سامنے آنے لگے۔ (صفدرعلی خان اور آذرخان کی تاریخ سے ہم نے ان کی ریاستوں کی

تاریخ میں بحث کی ہے)۔ اس مہم جوئی نے قراقرم کی ریاستوں میں موجودہ سیاسی انتظامی ڈھانچے کو تقویت اور بنیاد بخشی ۔سب کچھ ہونے کے بعد تمام چیزوں پر تنقید کی جاسکتی ہے وقت ہی اپنی غلطیوں کو سامنے لاتاہے کہ ان کے عہدہ دار پورے گلگت کے بارے میں کتنے پریشان اورمشکل کا شکار تھے۔اس آخری جنگ نے ان تمام معاملات کوسدھارا حالانکہ یہ بہت جلدبازی میں برپا ہوئی تھی۔ جنگ کے بعد ایک نیامعاملہ گلگت میں دو حکمرانوں کا تھاجو ایک ساتھ براجماں تھے۔ ایک طرف 'وزیر وزارت' یا کشمیرگورنر اور دوسری طرف 'برٹش پولیٹیکل ایجنٹ' موصوف جہاں رہتے ہیں وہاں ان کی حکومت نہیں تھی وہ ایک ملک کے سفیر اور ایک ایسی پوزیشن میں تھے جو دو آدمیوں میں جذباتی اختلاف کا باعث بن سکتی ہے۔ ان تمام غیرموافق حالات کومفصل بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جو بنیادی طور پر دونوں فریقین کے لئے بُرے اور ناسازگار ہوسکتے ہیں۔ جنگ وجدل کے بعد پھر دوبارہ ان دونوں میروں کو اُن کے تحت پر بیٹھا دیاگیاجس کے وہ مدعی بھی نہ تھے۔ دونوں کا انتخاب ان کے جانشینوں میں سے کیاگیاسکندرخان کونگر اور میر محمدنظیم خان کو اہلیت کی بنیاد پرہنزہ کے لئے چنا گیا۔ ماضی کی روایات جنگلی قانون بڑائی اور برتری یاپہلی اولاد کے حق کی بنیاد پرنامزد ہونے کے اب خلق خدا کی رائے سب کچھ تھی۔ اس لئے اب ان دو میروں پر سرکار کی رٹ چلے گی نہ کہ ان کی اپنی مرضی۔ میر بننے کا دعویٰ اب پیدائشی اور بہادری کی بنیاد کے بجائے مکمل طورپر ان کی اچھی قسمت پر ہوگا۔ ان کی نامزدگی میں اتنی جلد بازی کی ضرورت نہ تھی جس کا مظاہرہ ان دو میروں کے انتخاب میں کیا گیا؛ ان معاملات کوتھوڑی سی تاخیر سے کرنا چاہئے تھا جس سے تھوڑی چاہت اور سفارت کاری بھی ہوسکتی تھی۔ صفدرعلی درحقیقت ازروئے قانون ہنزہ کے اقتدار اعلیٰ پر ابھی تک اس ملک میں

موجود تھا۔ اُس کے نہ ہونے کی صورت میں اس کا سوتیلا بھائی محمد نفس دوسرے نمبر پر تھا اسی طرح قانونی طور پر خسرونگر کے میر یا اس کے بعد اسکندر ہوسکتا تھا۔ اس کی پہلی اولاد کو نامزد کرنے کے طریقہ کو نظر انداز کرنے سے ایک اچھی بات یہ سامنے آئی کہ آئندہ اپنے بعد کسی کو وہ نامزد نہیں کرینگے بلکہ حکومت ایسا کرنے کی پوری ذمہ دار اورحق بہ جانب ہوگی۔ موجودہ میروں کے انتخاب کے لئے پہلی اولاد کی شرط کو رد کیا گیا اب ایسا کیا گیاتو اس کے لئے حکومت جلد وراثت کی شفاف منظوری متعین کرے گی۔

بڈلف کا کہنا ہے کہ کشمیری قیادت کی وجہ سے ان باشندوں کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ انہوں نے ہر کام خوش وقتوں کے برعکس کیا جو انہوں نے متعارف کرایا ہوگا یا انہوں نے ایسا کیا ہوگا۔ وہ درست کہتے ہیں عموماً یہ اُس کی عمومی رائے ہے۔ کشمیری قیادت کے طورطریقے تاہم ان کے ہمسایہ حکمرانوں میں بہت غیر معقول تھے اس لئے انہوں نے گہرائی سے ان کی حوصلہ افزائی کی کہ ان کا فوری نگران اعلیٰ ان کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ ہوگا نہ کہ مہاراجہ کا وزیر۔ ان کی احسان مندی کا روّیہ خالصتاً خودپسندی کا تھا اس لئے آسانی سے بے نقاب ہوئے۔ جہاں جہاں ڈگروں نے مقامی راجوں کے شہزادوں کو ہی نامزد کیا تھا وہ ختم ہوتے گئے یا برائے نام رہ گئے ہیں۔ لداخ کے بادشاہ، استور اور گلگت کے راجے، بلتستان کے بیشمار مقامی حکمران اب صرف ماضی کے سائے تلے اشک شوئی سے جی رہے ہیں؛ ان کا رتبہ و دبدبہ اور دولت بھی وقت کی دھار پر بیتے سالوں کی طرح ختم ہوتی جارہی ہے۔ برخلاف اس کے یہ ہماری بھی پالیسی رہی ہے کہ چند ایک شہزادوں کو ان کے تخت پر رہنے دیاجائے یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ اس وقت پورے کشمیر میں صرف ایک حکمران ہے۔ گلگت ایجنسی میں کم ازکم چھے راجے ہیں مگر حکومت کی

کارکردگی کا فلاحی نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ انتظامی لحاظ سے سب سے بڑی ناکامی ہے۔

کشمیر میں حالیہ ہونے والے کچھ واقعات نے مہاراجہ کی حکومت پر عدم اعتماد ظاہر کیا ہے اس کے باوجود ان کی رعایا ہنزہ اورنگر کی نسبت یا کچھ حد تک یاسین اوردیگر گورنروں سے کئی گنا بہتر ہے۔ہماری مداخلت نہ کرنے کی پالیسی کی وجہ سے وہ لوگوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں عموماً ہم نے اس روّیے کے غضب کو برقرار رکھا ہے جو وہ اپنے رعایا کے ساتھ کرتے ہیں اگر ان کو چھوڑ دیا جائے تو معاملہ کچھ بھی ہوسکتاہے۔ مزید براں کشمیر میں ہندو راج ہونے کی وجہ سے اس کو ناپسند کیا جاتاہے یہاں تک کہ قراقرم کے گئے گزرے لوگ جو اب مسلمان ہوگئے ہیں، بھی ایسا کرتے ہیں۔دور دراز علاقوں میں انتظامیہ کے لوگ بہت زیادہ ہیں شاید ان میں ناانصافی بھی ہوں؛لیکن پہاڑی علاقوں میں اپنی رعایا کے ساتھ ایسا روّیہ نہیں جہاں راجے اپنے لوگوں پر ایک ایک کرکے نظر رکھے ہوئے ہیں اس کے باوجود لوگوں میں بلحاظ ابتر ضدی یا اصل کدورت ہوتوایسے حالات کا کوئی کفارہ نہیں۔

کشمیری انتظامیہ عموماً ضمیر فروش ہوتی ہے لیکن ہند میں اس معاملے کا کیا مطلب ہوسکتاہے؟ مجھے شک ہے اگر ایسا ہوتاہے تو ان کے دیگر ساتھیوں کے بارے میں کیا کہاجاسکتاہے؟اگر وہ پیسے لیتے ہیں تو یہ ان کے کام کا معاوضہ ہے لیکن جہاں راجے پیسے لیتے ہیں یاکہیں وہ بیشک اپنا حق جتاتے بھی ہونگے مگر اس کے بدلے میں وہ کیا دیتے ہیں۔

بڈلف لکھتے ہیں کہ کشمیریوں نے ان کو بہت تحفظ اورخوشحال ریاست دی ہے یہی ٹھیک اور مناسب خراج عقیدت ہے جس کا وہ حق دار ہیں؛ لیکن گلگت کے

علاقوں کے بارے میں کچھ تصور کرنا مشکل ہے کیونکہ ڈوگروں نے اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں لیا ہے۔ بڈلف خصوصیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ کشمیر کی ریاست میں کوئی غلام نہیں یہ ان کے لئے اعزاز کی بات ہے لیکن اب گلگت ایجنسی میں بھی ایسا ہی ہے مگروہ یہ لکھ کر صرف مہاراجہ کشمیر کی حکومت کے لئے بہت بڑی عقیدت کا اظہار کررہے ہیں۔

ہنزہ نگر کی جنگ کے بارے میں بہت بڑے دلائل دیئے جاسکتے ہیں لیکن ہمیں تمام نظام حکومت کو سمجھانے کے لئے یہ بتانا پڑتا ہے کہ ہنزہ اور نگر ہمارے بندوبست میں ہیں(نگر کے بوڑھے میر کی صرف شخصیت رہ گئی ہے) پونیال کا راجا ہمارا اتحادی ہے اور وزارت پر ہمارا کنٹرول ہے اس لئے ہم نے وہی کیا جیسے ہم چاہ رہے تھے۔ یاسین، غذر اور اشکومن جو مہتر چترال کے سالانہ باج گزار تھے ان کے ساتھ بھی ہم رابطے میں تھے اس طرح ایک حد تک ان ریاستوں میں ایک نظام متعارف ہوچکا ہے۔ یہ کہنا بہت غلط ہوگا کہ اب نظام میں بہت نقائص ہیں یا مشکل حالات ہیں مگر ہاں یہ بات ہے کہ ہم نے تمام ریاستوں کو بے ہنگم کرنے کے بجائے سب کو ایک اچھے انتظامی نظام میں اکٹھا کرنے کا ایک اہم موقع کھو دیا ہے۔

باب نمبر: 14
وادی گلگت کے لوگوں کی رسوم و عادات

وادی گلگت کے باشندے خوش نما اوراچھے گھروں میں رہتے ہیں اس لئے ان کا استور، بلتی اوردوسرے ہمسایہ نسلوں کے ساتھ موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے گھروں کی شکل عموماً مماثل ہے چھوٹے اور پست کئی کمرے ایک دوسرے کے ساتھ کڑی سے جڑے مٹی سے ڈھانپے ہوئے ہیں۔ان میں الگ سے آتشدان کہیں نہیں ہے۔ آتشدان کے سیدھے اوپر چھت پر مربع شکل میں کھڑکی نما روشندان بنایا جاتا ہے جو دھواں کے اخراج کے ساتھ ہوا اور روشنی پہنچانے کا کام بھی دیتی ہے۔ مرکزی گھر کی کافی اہمیت ہے آٹھ زاویوں والی روشن دان کڑیاں چوہٹی کی طرح لگا کر بنایا جاتا ہے جو بہت روشن ہونے کے باوجود اندرونی گھر کے کونے اندھیرے رہ جاتے ہیں۔ پورے سردیوں میں مٹی کا تیل استعمال ہوتا ہے جس سے لمبی سردیاں جسم کو سمیٹ کر گزاری جاتی ہے۔اس طرح دھواں دار اور افسردہ کمروں میں لوگ سردیاں گزار لیتے ہیں۔

مرکزی گھر کے فرش کو دو بیم کی مدد سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ آتشدان کے بائیں جانب عورتوں کے لئے اور دائیں جانب مردوں کے لئے جگہ متعین ہوتی ہے اور مرکزی جگہ میں بچے اور ملازمین بیٹھ جاتے ہیں۔ کمرے کے ایک طرف کو کافی اونچا بنایا جاتا ہے جہاں مہمان اور معزز لوگ براجماں ہوتے ہیں۔ اُسی اونچی جگہ کے ساتھ دیوار کے ساتھ نقش ونگار والی الماریاں بنائی جاتی ہیں جہاں گھریلو سامان رکھے جاتے ہیں۔طشتریاں، ظروف اور دیگر گھریلو ناکارہ

چیزیں ان الماریوں میں رکھی جاتی ہیں۔ چائے کی کیتلی اور چائے کے کپ روسی ساخت کے بنے ہوئے ہیں۔ قیمتی چیزیں اور کپڑے الگ سے صندوقوں میں مقفل رکھے جاتے ہیں۔ روشن دان کے بالکل نیچے چکنی مٹی سے چولھا بنا کر آگ جلاتے ہیں جہاں دیگچیاں یا مرتبان رکھ کر کھانا پکایا جاتا ہے۔ رہائشی کمرے اور دیگر اہم کمروں کی دیواروں پر آٹا ملا کر گارے سے روایتی نقش و نگار بنائے جاتے ہیں۔

جب موسم بہار میں فصل کی بوائی کا وقت آتا ہے تو تمام دیواروں کو صاف کر کے سجایا جاتا ہے اور بیج کو ایک بڑے چمڑے کے بیگ میں ڈال کر دروازہ کے قریب رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر ایک بھیڑ ذبح کی جاتی ہے اور ایک مخصوص ڈش پکائی جاتی ہے اس ضیافت میں سب لوگ شامل ہوجاتے ہیں اور گھر گھر جا کردعوت اڑائی جاتی ہے۔ پھر آٹے کے چندپیٹرن بنائے جاتے ہیں جو عموماً گول گول شکل کے ہوتے ہیں جس کو گھر کے دیوار کے ساتھ لگایا جاتا ہے۔ جو آدمی یہ پیٹرن بناتا ہے وہی ان کو لیکر باہر جاتا ہے اور کچھ آٹا اُس آدمی کے سر اور کندھے پر پھینکا جاتا ہے (یہ رسم شادی کے موقع پر بھی انجام دی جاتی ہے) یہی شخص بیج بوتا ہے اور نئی فصل کاشت کرتا ہے۔ یہ رسم قراقرم کے تمام ریاستوں میں منائی جاتی ہے لیکن گلگت میں ختم ہوتی جارہی ہے ہنزہ میں صرف آٹے کا استعمال ہوتا ہے باقی رسومات نہیں۔ (غالبا ہیماز کی رسم کی طرف اشارہ ہے)۔

ایک دفعہ ایک معزز آدمی نے مجھے اپنا گھر دکھایا جس میں مہمان کیلئے ایک الگ مخصوص کمرہ بنا تھا لیکن وہ اتنا چھوٹا تھا کہ مہمان اور میزبان دونوں کو بیٹھنے میں کافی زحمت ہو رہی تھی۔ کمرہ بہت ہی چھوٹا 'سیاہ' افسردہ جھونپڑی جیسا تھا جس کے اندر جانے کیلئے مہمان کو سر بہت حد تک جھکانا پڑتا ہے۔ مالک اِس کمرے پر بہت متکبر تھے لیکن میرے نزدیک یہ غیرہوا دار سورخانہ (مرغی خانہ) کی

طرح تھا۔ ہنزہ میں زمین کی قلت کی وجہ سے مکان تین منزل تک ہوتے ہیں ان کے مکانات پوری ایجنسی میں اچھے ہوتے ہیں دیگر کی نسبت ہوادار اور روشن ہے لیکن زیادہ فرق نہیں۔

غذااور کھانا تقریبا ان سب علاقوں میں ایک جیسا ہے لیکن ہنزہ کی نسبت گلگت کے لوگ چائے زیادہ پیتے ہیں جو آسانی سے دستیاب ہے۔ دیسی گھی کو اپنی روایت کے مطابق زمین میں دفنایا جاتا ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا کرنے سے اُس کے میعار میں بہتری آتی ہے یہ پانچ سے بیس سال تک زمین میں دفن رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے سرخ سیاہ ہونے کے ساتھ زائقہ بہت کڑوا ہوکر حلق تک جلاتا ہے اس طرح کے گھی کا بڑا چرچا رہتا ہے جو وہ شادی بیاہ موت اور خاص مواقع پر زمین سے نکالتے ہیں اس کے علاوہ دوائی کے طور پر بھی اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔ عموماً اس کو ایک نہر کے نیچے یا آس پاس دفنایا جاتا ہے۔ گنش ہنزہ کے مقام پر میں نے آبپاشی کی ایک نہر کو کھودا تو اس کے نیچے گاؤں کے لوگوں کا دیسی گھی پڑا تھا۔ بہتے پانی میں گھی کو اس طرح گرمیوں میں بحفاظت اور محفوظ ٹھنڈا رکھا جاتا ہے۔ سردیوں میں جب نہر کا پانی سوکھ جاتا ہے تو گاؤں کے لوگ اپنا اپنا گھی لے جاتے ہیں۔

ہنزہ نگراور پونیال کے لوگ زیادہ ترخوبانی کو خوراک کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ یاسین اور غذر میں زیادہ سردی کی وجہ سے درخت عام نہیں یا لوگوں میں درخت لگانے کا رجحان بہت کم ہے۔ ہنزہ میں خوبانی کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے کوئی دن ایسا نہیں کہ خوبانی خشک یا تازہ نہ کھائی جاتی ہو۔ غور طلب بات یہ ہے کہ ہمالیہ پر لکھی جانے والی کتابوں میں اس درخت پر خاص توجہ نہیں دی گئی ہے جو ہر جگہ پایا جاتا ہے کم و بیش اِن علاقوں میں لوگ گندم یا اناج کی

طرح اس کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔خوبانی کے درخت دس ہزار فٹ بلندی یا اس سے بھی زیادہ کے علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں جہاں موسم مناسب ہو۔ پھلوں کی مختلف قسمیں ہیں اور لوگ ان سب میں فرق جانتے ہیں۔ کچھ سفید' سرخ' پیلے' بڑے اور چھوٹے سائز کے کچھ بہت میٹھے بھی ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک قسم کی سفید خوبانی ایسی زود ہضم ہے جس کے تین ہزار دانے کھانے سے بھی کچھ نہیں ہوتا نہ طبعت خراب نہ ہی پیٹ پھولتا ہے۔ پھل کھانے کے بعد ان کی گٹھلیاں بھی کھائی جاتی ہے۔ ان سے بہت زیادہ تیل بھی نکالا جا سکتا ہے۔ گاؤں کے ایک بوڑھے آدمی نے مجھ سے کہا کہ' میں گٹھلیوں کے علاوہ اتنی خوبانیاں کھا سکتا ہوں جتنی مجھے مل سکتی ہیں!

گرمیوں میں تمام بڑی بڑی چٹانوں' کھلی جگہوں' چھتوں اور جہاں ممکن ہو خوبانی کو وسیع پیمانے پر سکھایا جاتا ہے جس سے علاقے کا پورا منظر سرخ نظر آتا ہے۔ بلتستان کے لوگ بھی اس کو بڑی مقدار میں بیچتے ہیں یہاں تک کہ لحاصا (تبت کا دارالخلافہ:Lhasa) اور کشمیر یا انڈیا کے دور میدانی علاقوں تک پہنچاتے ہیں۔ خوبانی کو عموماً نرسریوں میں بیج سے اُگایا جاتا ہے جس سے اصلی قسم کے پودے فراہم ہو جاتے ہیں۔ اگر بیج خراب یا ضائع ہو جائے تو اس سے جنگلی طرز کی خوبانی اُگ آتی ہے۔ پیوندکاری کے بارے میں لوگ عموماً بہت کم جانتے ہیں لیکن پھلدار درختوں کی پیوندکاری کے ساتھ کچھ شاخ تراشی بھی کی جاتی ہے۔ ایشیاء کے لوگ شاخ تراشی نہیں جانتے ہیں اس لئے ضعیف العمر خشک شاخوں کو کاٹنے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے دراصل یہی نئی شاخیں پھل دیتی ہیں۔خوبانی کی گٹھلیوں کو تحائف کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔کبھی کبھی بچے خشک گٹھلیوں کے ہار بنا کر زیور کی طرح گلے میں ڈال کر پھرتے رہتے ہیں۔ ایندھن کے لئے خوبانی

کی لکڑی کو دوسری لکڑیوں پر بہت ترجیح دی جاتی ہے بحرحال ہر لحاظ سے خوبانی کا اس ریاست کی معیشت میں بہت بڑا کردار ہے۔ عموماً کوئی بھی درخت لگاتے وقت بھیڑ بکریوں کا خون مٹی پر چھڑکاتے ہیں ان لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے زمین زرخیز ہوتی ہے۔

راجہ اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ مچھلی کا گوشت نہیں کھاتے ان کا خیال ہے اس گوشت کی بو نقصان دہ ہوسکتی ہے جبکہ عام لوگ جب بھی ملے کھاتے ہیں۔میرا خیال ہے کہ یہ کوئی قدیم روایت یا تصور ہوگا جس کی پیروی اعلیٰ طبقے کے افراد کر رہے ہیں۔

ہنزہ میں اناج کو صندوق(Bins) میں ڈال کر گھر میں جمع کیا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی عقلمندی اور محفوظ طریقہ ہے کیونکہ اس سے نہ کوئی چور نہ کیڑے مکوڑے کھا سکتے ہیں۔ چھلت اور نگر خاص میں جہاں شین رہتے ہیں کھلی اور خشک جگہ پر دیگر تحفظات کو مدنظر رکھ کر ایک گہرا عموماً چار فٹ گڑھا کھود کر اسی میں اناج ذخیرہ کرتے ہیں۔

اُس صندوق نما گڑھے کو سُندَرڈونگی سے لکیریں لگا کر صنوبر کے مقدس شاخوں سے چھپایا جاتا ہے۔ غلے کو گاہنے کے بعد اناج کو ان گڑھوں میں ڈال کر احتیاط کے ساتھ ان کو ڈھانپا جاتا ہے۔ یہ کام ان کی سستی کی علامت ہے شینوں کو کم از کم اس کے بارے میں سوچنا چاہئے۔ ایجنسی کے دوسری جگہوں پر بھی یہ رواج عام اور مشترک ہے کچھ جگہوں پر اناج کو چھتوں پر یا زمیں پر چمنی نما برتن جیسے مٹی کے گڑھے بنا کر ذخیرہ کرتے ہیں۔

کپڑے عموماً دیسی پٹو کے بنائے جاتے ہیں کاٹن کی قمیض اور پاجامے وقت کے آنے کے ساتھ ساتھ مشہور ہوتے جارہے ہیں۔ لمبا چوغہ دیسی پٹو کی بنائی

جاتی ہے اس کے ساتھ گول ٹوپی پہننے کا رواج ہے جس کو کھوئی اور ہنزہ میں پھر چن کہتے ہیں، یہ تمام لباس کی بنیادی چیزیں ہیں۔ کچھ جگہوں پر بطخ کے بالوں سے گرم کپڑے بنائے جاتے ہیں جن کو خاص طور پر عورتیں پہنتی ہیں۔

کئی سالوں سے مرد شلوار پہنا جانتے ہی نہیں تھے۔ ہنزہ میں بہت ہلکے شلوار پہنے جاتے تھے جن کا کوئی فائدہ نہیں عموماً کوئی کام کرنا ہو تو وہ ان کو بھی نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار ایسا ہوتے دیکھا ہے۔

نگر کی خواتین آج تک شلوار پہنا جانتی نہیں نہ ہی کوئی پاجامے یہی صورت حال جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنزہ میں شلوار اور پاجامے عظیم وزیر ہمایون بیگ نے 1890ء میں متعارف کرائے۔ اس سے پہلے عورتیں لمبی بیل بوٹوں سے یا سوتی کپڑے سے کوٹ جیسے کپڑے پہنتی تھیں۔ وہ سر پر گول ٹوپی پہنتی ہیں۔ ہنزہ کی عورتیں ہوشیار ہیں اس لئے چوغہ اور کوٹ پر دستکاری اور کشیدہ کاری بھی کرتی ہیں ان کا یہ کام بہت شاندار ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔

چمڑے کے لمبے اور کھلے جوتے جن کو پابو کہتے ہیں پہاڑ پر چڑھنے اور عام استعمال میں پہنے جاتے ہیں خاص کر غریب لوگ کثرت سے اس طرح کے بوٹ پہنتے ہیں۔ پابو عموماً مقامی صنعت ہے بہت ہی شائشتہ اور خوش اسلوب۔۔۔ تھوٹی پہنی جاتی ہے۔ تھوٹی چمڑے کے ٹکرے ہوتے ہیں جن کو اہتمام کے ساتھ پاؤں اور ٹانگوں کے ساتھ گول گول باندھا جاتا ہے۔ یہ پہننے کے لئے شاندار ہیں خاص کر چڑھائی کے حوالے سے بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ بدقسمتی سے تھوٹی کبھی بھی نئے نہیں ہوتے ہیں جب قلیوں کو ملازم یا کام پر لیا جاتا ہے وہ نیچے بیٹھ کر ہمیشہ روایتی فرسودہ چمڑے کے ٹکڑوں کو باندھتے رہتے ہیں جو پورے پاؤں میں صحیح نہیں بیٹھے ہیں۔ یہ تھوٹی کبھی پاؤں کے ساتھ لگتے نہیں ہے اس لئے یہ لوگ

ہمیشہ ان کو درست کرنے کے بہانے خوب آرام کرتے ہیں۔ تھوٹی وسیع پیمانے پر خاص کر قراقرم میں غیر پٹھان لوگوں کے پاس پورے شمال مغربی انڈیا میں ہمیشہ پھٹے ہوئے ہی پائے جاتے ہیں۔

ایک دلچسپ رسم 'چوپ' ہے۔ جب کوئی عورت بچہ جنم دیتی ہے تو ماخور کا سینگ جلا کر ایک پتھر کے ساتھ رگڑا جاتا ہے اور پھر اس مادے کو پانی کے ساتھ ملا کر عورت کے چہرے پر مَل دیا جاتا ہے۔ بچے کے جنم کے بعد عورت جب یہ مادہ مَل کر گھر سے نکلتی ہے تو اس کے دو فائدے ہیں: ایک وہ سردی سے بچ جاتی اور دوسرا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے ہاں بچے کی ولادت ہوئی ہے۔ میں نے ایسی عورتوں کو دیکھا ہے جو چوپ لپکا کر بالکل اجنبی دکھتی ہیں۔ عورت کو بچے کے جنم سے لے کر سات دن تک ناپاک سمجھا جاتا ہے اس لئے ان کو الگ تھک رکھا جاتا ہے۔

دوستی کے رشتے عام سی بات ہے خاص طور پر امیر لوگ امیروں میں اور غریب اپنے درمیان رشتے بناتے ہیں۔ میر کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی دایہ کے سپرد کیا جاتا ہے اور ان کی نشونما میں وہ اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ بچے کی پرورش کرنے والا آدمی میر کا اُشم (دودھ باپ) کہلاتا ہے اور یہ رشتہ بڑے شوق سے نبھایا جاتا ہے۔ دراصل اس طرح پرورش کرنے میں بچوں کا تحفظ بھی ہے۔ قلعے میں رکھنے سے نومولود بچے کو قتل کرنے کے امکانات بہت ہوسکتے ہیں۔ جب کوئی اور خاندان ان بچوں کو پالتا ہے تو نہ صرف وہ احتیاط سے ان بچوں کا خیال رکھتا ہے بلکہ بڑے ہونے پر ان کی حمایتی بھی بن جاتا ہے۔ میر کی اپنی اولاد ہونے کی صورت میں دایہ کے گھر والے بڑی امیدوں کے ساتھ بچے کو پالتے ہیں کہ وہ بڑے ہوکر میر کے پاس اُن کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا لیکن بعض اوقات برے

نتائج بھی نکلتے ہیں جن سے ریاست کو افسردگی ہوتی ہے۔ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ دایوں نے بچے کی واپسی پر بڑی رقم' کپڑے' سرمایہ اور دیگر تحائف کا تقاضا کیا۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ بدلے میں وسیع زمینیں دی جاتی تھیں لیکن آج کل لوگ شکایت کرتے ہیں کہ میر ان کو کچھ بھی نہیں دیتے ہیں۔ اس میں کتنی سچائی ہے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ بچوں کی اس طرح نشوونما کی رسم بہت بُری ہے کیونکہ بعض اوقات اس رسم کے پوری ایجنسی میں تلخ نتائج آئے ہیں یہ طریقہ سازشوں اور ٹکراؤ کا سبب بھی بنتا ہے۔ اس لئے اس روایت پر پابندی بھی ہے لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہورہا' اگر ایسا ہے تو یہ قانون یا پابندی فضول ہے۔ اس رسم کو جاری رکھ کر کچھ بھی حاصل نہیں گیا بلکہ جو لوگ ایسا کرتے تھے وہ بھی بڑے مسائل کا شکار ہوجاتے ہیں۔ بحرحال یہ ایک مضبوط رشتہ ہے کچھ جگہوں پر اس کی جڑیں بہت مضبوط ہوچکی ہیں۔ میں نے ایسے بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو اِن بچوں پر سب کچھ نچھاور کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے اپنے بچے لاڈ پیار اور دولت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور کیا ہوسکتا ہے؟ وہ بچے عموماً اپنے اصل والدین سے بڑی تکلیف' برداشت اور صبر کے بعد بھی کچھ نہیں پاتے ہیں۔اس بُری رشتے داری پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ ان رشتہ داروں سے شادی کو حرام سمجھا جاتا ہے۔

یہ رشتہ اس وقت مافوق الفطرت بن جاتا ہے جب عورت اس بچے کو دودھ پلاتی ہے ایسا کرنے کے بعد اِس رشتے میں بہت گہرائی آجاتی ہے۔عورت کے دودھ کا تاثیر اور جوہر اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ کبھی ایک آدمی' کسی وجہ سے اپنا منہ عورت کی چھاتی سے لگا کر'ایک باپ بننے کے بجائے رشتے میں بیٹے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ انسانی دودھ کی قدر بہت زیادہ ہے خاص طور پر آنکھ کے عدسے

کے لئے نزول الماء کی طرح ہے۔

لوگوں کا شغل عموماً پولو، شکار اور تیر اندازی ہے لیکن پولو کو تفریح کے طور پر زیادہ کھیلا جاتا ہے اس کھیل میں اُن کی دلچسپی بہت زیادہ ہے اس کھیل کو جتنا ہم انڈیا یا کہیں اور جانتے تھے یہاں اُس سے کئی گنا زیادہ اور مختلف دیکھا۔ اس کھیل کے بارے میں ڈریو تفصیل سے لکھ چکا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کھیل انگلینڈ میں(جموں اور کشمیر از فریڈرک ڈیور اشاعت 1875ء) بھی اتنی شہرت نہیں تھی جتنی مقبولیت ادھرتھی۔ لمبے اور تنگ پولو کے میدان ہر گاؤں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی لمبائی خالص زمین پر منحصر ہے کیونکہ میدانی علاقے ان پہاڑوں میں کم ہے یہ اتنے لمبے نہیں ہوتے جتنے کہ ہونے چاہئیں۔ دو سو یارڈ (چھ سو فٹ) موزوں ترین لمبائی ہے اس طرح چوڑائی تیس سے چالیس یارڈ (نوے سے ایک سو بیس فٹ) ہوتی ہے۔ اس کھیل کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں کھلاڑیوں کی تعداد متعین نہیں لیکن عموماً چھ کھلاڑی دو ٹیم میں کھیلتے ہیں لیکن یہ کوئی عام اصول نہیں۔ یہ حیرت انگیز جمہوری کھیل ہے خاص طور پر جاگیردار ریاستوں میں راجہ' ان کے بیٹے' وزیر اور تمام لوگ آپس میں گتھم گتھا ہوتے ہیں کوئی بھی زمیندار اپنے گھوڑے کو لیکر اُن کے ساتھ کھیل سکتا ہے اس معاملے میں بڑے چھوٹے میں کوئی تمیز نہیں ہوتی یعنی سب برابر کھیلتے ہیں۔

پولو گراؤنڈ کے گرد معمولی دیوار ہوتی ہے اور پتھروں سے گول پوسٹ بناتے ہیں۔کھیل کا آغاز راجے کی آمد سے ہوتی ہے جب وہ میدان کے درمیان میں تیز دوڑتے ہوئے داخل ہوتا ہے تو بال کو اپنے پولو سٹک سے مار کر ہوا میں اچھال دیتا ہے۔ اس کو ٹمبک کہتے ہیں اگر وہ صحیح نشانے پر مارے تو ایسی چوٹ سے ہی گول ہوجاتا ہے۔ اس کھیل کا کوئی متعین وقت بھی نہیں ہوتا۔ کھلاڑی کھیلتے چلے

جاتے ہیں کبھی نصف گھنٹے کا بھی کھیل ہوتا ہے کیونکہ اکثر پولو کے میدان کی حالت صحیح نہیں ہوتی یہ عموماً پتھریلا اور گردوغبار والا ہوتاہے جس کی وجہ سے گھوڑے بھی تھک جاتے ہیں۔ ان کا ایک دور مختصر وقت کا ہوتا ہے اور اس کو ہی بہتر سمجھا جاتا ہے۔

پولو سٹک کو اکثر بید، سیب یا شہتوت کا اور نچلا حصہ بادام کا بناتے ہیں تاہم بید کا سٹک زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ پولو میں زبردست گہماگہمی ہوتی ہے تنگ اور لمبے کھیل کے میدان میں تماشائیوں کو مقررہ جگہ دی جاتی ہے جہاں وہ شور وغل مچاکراپنا شوق پورا کرتے ہیں وہ کھلاڑیوں کے بارے میں بولتے رہتے ہیں۔ اس کھیل کے دوران کھلاڑیوں کو گرمانے کے لئے ڈھول دمامے بھی ہوتے ہیں جو پورے دن اپنے اوزار کے ساتھ بجاتے رہتے ہیں۔ انڈین پولومیں عام میدان استعمال ہوتا ہے یہی اس کی پہچان ہوتی ہے۔ اس کھیل کے عجیب وغریب اصول ہیں جن کی مدد سے کھیل کو اور دلچسپ بنایا جاتا ہے۔ کبھی مخالف کے گھوڑے کو سٹک سے ماراجاتاہے کبھی بال کو ہوا میں پکڑلیا جاتاہے اور کبھی دوسرے کھلاڑی کو کمرسے پکڑ لیا جاتاہے اس طرح کے کئی ایک گُرہوتے ہیں جو دیگر ملکوں میں صحیح نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک کھیل کے دوران میر آف ہنزہ کے ساتھ بیٹھا ہواتھا وہ اپنے ماضی کی اہم یادیں بتاتے جارہے تھے۔ ہم ایک بڑی پلیٹ میں آڑو کھا رہے تھے اور میر نیچے اپنے رعایا پر چھوٹے چھوٹے کنکر پھنک کر ان کو ہوشیار کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ انہوں نے یہ کھیل چھوڑ دیا ہے کیونکہ ابھی وہ بوڑھے ہوچکے ہیں وہ یقیناً ستر سال سے اوپر عمر کے تھے۔ اس سے پہلے وہ تین مرتبہ بُری طرح زخمی ہوچکے تھے اس لئے اب چوتھی بار غلطی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی بات سے مجھے حیرت ہوئی شاید پچھلے وقتوں میں پولو بہت خطرناک

طریقے سے کھیلا جاتا تھا اب فطری طور پر کافی محفوظ ہے۔ اس کھیل کے بہت سارے واقعات ہوچکے ہیں ایک دفعہ ایک گشپور کی آنکھ نکل گئی تھی جس کی عیادت کے لئے میں بھی گیا تھا۔ میں نے اس کو ایک دوائی بھی بتائی تھی لیکن غریب آدمی پہلے ہی اپنی آنکھ کھو چکا تھا اب اس مشورے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

ایک اور تفریحی کھیل سرپٹ اور گولی مار ہے جس میں گھوڑ سوار گھوڑے کوسرپٹ دوڑاتا تھا اور جھک کر نشانے کو اُکھاڑتا تھا لیکن یہ کھیل اب صرف ہنزہ میں باقی ہے۔ یہ بھی دلچسپ کھیل ہے تیز دوڑ کر اپنے تیر سے جھک کر عموماً نشانے کو لگایا جاتا تھا نشانہ ایک کاغذ یا کوئی اور چیزہوتی تھی بحرحال کسی بھی طرح نشانے کو لگانا ضروری ہوتاتھا یہ بھی کوئی آسان کھیل نہ تھا۔ کمان کو بائیں ہاتھ میں اونچا پکڑ کرتیر کو لہراتے ہوئے اسی ہاتھ میں رکھناپڑتاتھا نشانے کے قریب پہنچ کر اپنے تیرکو نیچے جھکا دینا ہوتاتھا۔ ہرکھلاڑی تین دفعہ یہ باری لیتا تھا بھلے وہ کتنی مرتبہ ہی نشان کو اکھاڑے۔!

ماضی میں جب کوئی راجہ یا اس کا بیٹا کسی اور ہم منصب سے ملنے جاتا تو میزبان ایک بکری یا آختہ بیل پیش کرتاتھا جس کو' کو با' کہتے ہیں۔ پولوگرانڈ میں موجود مہمان یا اس کے قریبی ساتھی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی تلوار کی ضرب سے پیش کردہ جانور کے گلے کو کاٹ دے۔ لیکن موجودہ وقت میں اس کے بجائے اُس خاص موقع پر ایک خاص نشانہ مخصوص کیا جاتا ہے جس پر طرفین فائر کر دیتے ہیں، بحرحال اب یہ رسم بیکار ہوچکی ہے۔

شکار ان علاقوں کا مشہور مشغلہ ہے اگر اس شغل کی تسکین پوری کرتے رہے تو ایک بھی جانور زندہ نہیں رہ سکے گا۔ شکار تمام جانوروں کے خلاف استعماری جنگ وجدل کی طرح ہے؛ لومڑیوں کے سنجاب وملائم کھال کے لئے، پرندوں کے

بال و پر اور گوشت کے لئے' پرندوں اور چڑیوں کولڑکے سنگ دلی سے اپنی غلیل اور پتھروں سے مار دیتے ہیں۔رام چکور جس کو ہمالیہ کا برفانی ککو کہتے ہیں کو ایک سادہ طریقے سے زمین پراٹھارہ انچ لمبا اور دوفٹ چوڑا گڑھا بنا کر پکڑتے ہیں۔ اس گڑھے کے اوپر ایک ہلکی چادر ڈالتے ہیں جس پر برف ڈال کر ان کے اوپر گندم کے دانے ڈال دیئے جاتے ہیں پرندے دانے کھانے کے لئے ان کے اندر گرجاتے ہیں پھر جلد ان کو بند کیا جاتاہے یوں اس سادہ طریقے سے چار سے پانچ چڑیاں پکڑی جاتی ہیں۔

ان حربوں کی وجہ سے جنگلی جانور اور پرندے پورے گلگت ایجنسی میں معدوم ہونے کا خدشہ ہے۔ ایک دو نالوں کو راجوں نے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے لیکن شکاری اس حد تک بھی مداخلت کرتے ہیں۔ اس طرح کی حرکتوں کی وجہ سے وسیع وعریض جنگلوں پر پائے جانے والے مارخور اور دیگر جنگلی جانوروں کا نام ونشاں مٹ جائے گا۔ میں اکثر مقامی حکمرانوں کو بتاتا رہا کہ' اس طرح آپ اپنے بچوں کو کیا چھوڑ جائیں گے؟ لیکن ایشیاء کے لوگ سنتے کہاں ہیں وہ اپنی انا اور کم مطمع نظر کی وجہ سے عارضی فائدے دیکھتے ہیں وہ اکثر بات سنتے ہی نہیں۔ اس طرح کی کوشش ان پر ناگوار گزرتی ہے۔

بڈلف نے اپنی کتاب میں بہت ساری رسومات کا ذکر کیا ہے وہ سب اب ناپید ہیں لیکن گینانی اب بھی منائی جاتی ہے۔گلگت میں یہ رسم بھی معدوم ہو چکی ہے(بڈلف کے بقول یہ رسم گلگت میں منائی جاتی تھی' ہندوکش کے قبائل 1880ء) مگر گردونواح میں سب اس کو مشترکہ سالانہ تہوار کے طور پر وسیع پیمانے پر مناتے ہیں۔ جَو کی کٹائی سے دس دن پہلے جب یہ زرد پڑجاتی ہے یعنی پکنے سے پہلے تمام گھرانے دہی' گھی اور دودھ سے بننے والا پنیر' لسی جمع کرتے ہیں۔

ایک خاص کھانا جس کو' کھا مالے' کہتے ہیں تہہ دار روٹیاں گھی اور دودھ ملاکر پلیٹ میں کھاتے ہیں۔ اس پکوان کو لیکر صرف مرد کھیتوں کی طرف نکلتے ہیں جہاں وہ فصل' زمین کی بہتر زرخیزی اور صحت کے لئے دعا کرتے ہیں۔ یہ سب دعائیں پڑھ کر وہ مٹھی برابر جو کاٹ کر گھر کی طرف لاتے ہیں۔ ان پانچ سے دس عدد خوشوں کو گھر کے دائیں جانب ستون کے اوپر باندھتے ہیں جہاں سے وہ گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں باقی کو سکھا کر لسی کے اندر ڈال کر چیچ سے کھاتے ہیں۔

ہنزہ میں گینانی تہوار کے تیسرے دن Piyakmar منایا جاتاہے۔ (یہ لفظ شاید پیغمبر یا اس سے ملتا جلتا ہے لیکن میں اس لفظ کو نہیں سمجھ سکا: حاشیہ نوٹ) اس دن شراب خوب پی لی جاتی ہے اور چاروں قبیلے الگ الگ جشن مناتے ہیں۔

گوجال کے وخیوں کے علاوہ یہ رسم پوری ریاست میں منائی جاتی ہے۔

موسم بہار(یعنی بازونو) کے موقع پر جب فصل سرسبز ہوجاتی ہے تو ایک پاکیزہ بھیڑ کو صدقہ کے طور پر پولو کے میدان میں ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ رسم ہنزہ نگر میں نہیں صرف گلگت اور پونیال میں منائی جاتی ہے۔فصل کی کٹائی اور کراہائی کے بعد دومن کھیا کی رسم منائی جاتی ہے۔

گلگت میں بیج بوائی کی رسم کو رسم 'بی پھاؤ'، گوجال میں ' شاہ گون'ہنزہ نگر اور گردونواح میں اس کو 'بافوئے' ہی کہتے ہیں۔ چیلی کا نام آج کل ناپید ہو رہا ہے۔ فروری میں بافوے کے دن ہنزہ میں میر خود کھیت میں ہل چلاکر باقاعدہ سال نو کی کاشتکاری کا آغاز کرتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُس دن ایک خاص قسم کا عمامہ میر کو پہنایا جاتا ہے جو دربار میں صرف نئے سال کی اس رسم یا کسی سرکاری تقریب میں پہننے کے لئے رکھی جاتی ہے۔ میر کے ہل چلاتے ہی دیرامتینگ کا کوئی ایک فرد بیج بو کر اس مہم کا آغاز کرتا ہے۔

باب نمبر: 15
شادی کی رسومات

گلگت ایجنسی کی اکثر ریاستوں میں شادی کی رسومات کے بارے میں انتہائی کم شعور ہے اس لئے ان کی بہتری کے لئے اصلاحات بھی کی جارہی ہیں۔ مشترکہ طورپردرج ذیل رسومات اکثر علاقوں میں رائج ہونے لگی ہیں۔ جب لڑکی کو لڑکے کے والد یا قریبی رشتہ دار پسند کرتے ہیں تو چارافراد لڑکے کی جانب سے اور ایک فرد لڑکی کی جانب سے نمائندہ وفدکی صورت میں لڑکی کے گھر رشتہ مانگنے جاتے ہیں۔ اگر کوئی اہم رشتہ طے ہونا ہو تو گاؤں کے نمبردار کے ساتھ چار اور لوگ یا اس سے بھی زیادہ وفد کے ارکان اس رشتے کے بارے میں گفت وشنید کرتے ہیں' طے ہونے کی صورت میں لڑکی والوں کو ایک اچھی گائے یا ایک بیل یا چھے بکریاں اور ایک میمنا تحفہ دیا جاتاہے۔ لڑکے والوں کو یہ تحفہ ہر صورت دیناپڑتاہے یہاں تک کہ قرض کیوں نہ لیناپڑے۔یہ تحفہ دُمن (duman) فطری طور پر ہر ایک پر لازم لیکن مختلف ہوتا ہے۔ لڑکی والے ایک بندوق یا نصف تولہ سونا لانے کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر لڑکا اس رشتے میں بہت پرجوش حسرت طلب ہے تووہ اپنی جانب سے تین تولہ سونا اٹھارہ میٹر پھولدار سوتی کپڑا بھی دیتا ہے۔ روایتی طور پر چھے میٹر سوتی کپڑا لڑکے والے لڑکی کے سگے ماموں اور اس کے برابر لڑکی کی ماں اور باپ کو بھی دیتے ہیں۔یہ تحفہ رسمی دستار یا پگڑی کی رسم کے لئے کافی سمجھا جاتاہے۔

یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تمام تحفے لڑکے والوں کی جانب سے ہی دیئے جاتے ہیں لڑکی والوں کی جانب سے کچھ بھی نہیں دیا جاتاہے بیشک لڑکی والے

کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں۔ شادی کی تقریب سے پہلے لڑکے والوں کی طرف سے ایک بکری یا چھے روپے مالیت کا کوئی سامان لیکر شادی کی تاریخ طے کی جاتی ہے۔ شادی سے متعلق ایک فرد مختلف معاملات کی اطلاعات لیکر لڑکی کے والدین کے گھر جاتا ہے جو شادی سے متعلق تمام معاملات و رسوم طے کر کے آتا ہے۔ اس خدمت کے عوض اُس کو ایک جوڑا کپڑا اور چھ کلو دیسی گھی مل جاتا ہے۔

دلہا کے ساتھ بیس یا اِس سے زیادہ لوگ برات میں دلہن کے گھر جاتے ہیں جہاں وہ پورا دن اور رات ناچ گانے اور کھانے پینے میں مصروف رہتے ہیں ان تمام چیزوں کا اہتمام دلہن والوں کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ اگلے دن دلہا اور دلہن کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے جب براتی گھر کی دہلیز کو پار کرتے ہیں تو گھر کی چھت سے ان پر دلہن والے لڑکے کنکریاں اور عجیب وغریب چیزیں پھینک دیتے ہیں۔ چار سے پانچ لڑکیاں اور دس سے بیس نوجوان بارات کے ساتھ دلہے کے گھر جاتے ہیں۔ لڑکی کے رشتہ دار لڑکے والوں کے گھر میں ایک دن کھانے پینے کا لطف اٹھاتے ہیں۔ شادی میں نکاح کی رسم مولوی سرانجام دیتاہے جس کے بعد گانے اور موسیقی شروع ہوجاتی ہے۔ اُس وقت گاؤں کے سب لوگ شرکت کرکے کھانے پینے اورتقریب سے لطف اندوز ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔

دلہن اپنے ساتھ کچھ زیورات اور بسترے لاتی ہے۔عام طور پر ایک ہفتے کے بعد دلہن دوبارہ اپنے والدین کے گھر چلی جاتی ہے اور وہی رہتی ہے کیونکہ بعض اوقات بہت کم عمری میں شادیاں کی جاتی ہیں یا ان کی عمر کے لحاظ سے وہاں رہنے دیا جاتاہے۔سن بلوغت کے بعد اپنے شوہر کے گھر جاناچاہے تو اپنے ساتھ پچاس سے ساٹھ نان یا چپاتیاں بناکرلاتی ہے۔ (پہلے دور میں بہت چھوٹی عمر میںشادیاں طے ہوتی تھیں اس لئے دلہن کوایک عرصے تک میکے میں ہی رہنا

پڑتا تھا اس رسم کو سُگھر کی کہتے ہیں: مترجم)

پونیال میں شادی کی رسم میں اصلاح کی گئی ہے اب وہاں دومن یعنی منگنی کی فیس چار روپے مقرر کی گئی ہے۔ راجہ کو لڑکے کے گھر والے بیس روپے یا ایک بیل شادی رشتے کی شکرانے کے طور پر دیتے ہیں۔ اب پونیال کے لڑکے اپنی منگیتر کو کچھ بھی نہیں دیتے کیونکہ اس سے ایسا لگتا ہے جیسے لڑکی کو خرید کرلایا گیا ہو۔ شادی کے موقع پر ایک مخصوص قانونی رقم (مہر) مقرر کی جاتی ہے لیکن طلاق کی صورت میں لڑکی کو ادا کردی جاتی ہے۔ (اسلامی قانون کے مطابق مہر معجّل اور مہر اسی وقت ادا کرنا ہے لیکن مقامی رسومات میں طلاق کی صورت میں ادا ہوتی ہے) لڑکی کے والد سے جتنا ہوسکتا ہے اپنی بیٹی کو زیادہ سے زیادہ جہیز دیتا ہے تاکہ وہ اپنے نئے گھر میں خوشحال رہ سکے۔ اشکومن، کھوٗ یاسین میں لڑکے کی جانب سے دو گز کپڑا اور تین بیل دیتے جاتے ہیں بدلے میں دلہن کا باپ اتنا ہی مال و اسباب سے نوازتا ہے جتنا کہ وہ دے سکتا ہے۔ راجہ اور گورنر کی کوئی فیس مقرر نہیں ہے۔

دوسری شادی کی صورت میں پہلی بیوی کو ایک بیل دیا جاتا ہے۔ یہ اٹل رسم ہے جس کو ادا نہ کرنا پہلی بیوی کی بے عزتی سمجھی جاتی ہے۔

یاسین میں شادیاں باقاعدہ ایک نظام کے تحت کی جاتی ہیں۔ دلہا اپنے سسر کو چار بیل دو عدد کپڑے اور مروجہ دستور کے مطابق اپنی بیوی کو ایک یا دو بیل کے ساتھ بستر کا سامان اور زیورات دیتا ہے۔ اگر آدمی دوسری شادی کرے تو پہلی بیوی کے باپ کو ایک بندوق، گھوڑا، بیل یا بہت کچھ دیتا ہے جو اُس سے ممکن ہو اس طرح کی رسم کسی اور علاقے میں نہیں ہے۔ ان تمام تحائف کا مطلب پہلی بیوی کو یہ باور کرانا ہے کہ دوسری شادی کرکے اس کا کوئی استحصال نہیں کیا گیا ہے۔

پونیال کے راجا کی شادی ہونے کی صورت میں رعایا سات روپے یا اس مالیت کا سامان دیتے ہیں اور ان کے بڑے بیٹے کی شادی کی صورت میں بھی یہی طریقہ ہے۔ ہنزہ نگر میں میر یا ان کے تمام بچوں کی شادی میں ہر گھرانہ سات روپے بطور ٹیکس دیتا ہے۔ لوگ شکایت کر رہے ہیں کہ میر اور ان کے بچوں کی شادی میں مسلسل پیسے دینا سراسر ناانصافی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میر یا اس کے دو تین بچوں کی شادی میں کچھ دینے کے لئے مناسب قانون بنایا جائے لیکن باقی پوری آلِ واولاد کی سالانہ شادیاں رچانے کی رسم میں فیس یا ٹیکس دینا بڑا ظلم ہے۔ ان کا آفسردہ ہونا مناسب ہے یہ نیا قانون ایک بری اختراع ہے۔

شادی کی تقریب سے کچھ پہلے کی رسومات بہت پیچیدہ ہیں۔ ایک بوڑھے شخص کو جو عموماً رشتہ دار ہوتا ہے دس یارڈ کپڑا دیا جاتا ہے اور تمام موسیقاروں کو چھ یارڈ کپڑا دیتے ہیں وہ لوگ تین سے چار یا کبھی بہت زیادہ یعنی بارہ دنوں تک موسیقی سے محظوظ کراتے ہیں۔ کپڑا لینے کے بعد وہ بوڑھا دلہن کے گھر جاتا ہے وہاں دلہن کے دائیں کندھے اور ان کے سر پر آٹا چھڑکاتا ہے تمام موسیقار چھت پر جاکر بجانا شروع کردیتے ہیں۔ پھر وہ بوڑھا آدمی کچھ گھی اور جڑی بوٹی پر چینی چھڑک کر توے یا چپاتی کے پشت پر لگاتا ہے پھر بڑے توے کو آگ چولہے سے اُٹھاتا ہے اور پورا توّا اپنے سر پر اُٹھا کر گھر کے گرد اُس کو دکھاتے ہوئے رقص کرتا ہے۔ تماشائی خوب تالیاں بجاکر شوروغوغا کرتے ہیں۔ پھر وہ برتن دوبارہ آگ پر رکھتا ہے۔آٹھ سالہ ایک لڑکی آکر اس توے پر خمیر کے کچھ باریک پیڑے بناکر لگاتی ہے جس کو پھپاؤ کہتے ہیں عورتیں دن بھر یہی روٹیاں پکاکر ان کا ڈھیر لگادیتی ہیں جن کو گھی لگاکر گیلا کیا جاتا ہے۔عموماً چھ یا آٹھ عورتیں یہ پیڑے اور روٹیاں تیار کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو گھی کے اندر ڈال کر بوڑھا شخص اس رسم

کا امیر بن کر معاملات آگے بڑھاتا ہے۔ وہ ان پھپاؤں (ایک قسم کی باریک ملائم روٹی جو حلوہ پوڑی جیسی ہوتی ہے) گھی میں ڈال کر ہر ایک مہمان کو دیتا ہے۔ ان کے اوپر صنوبر کی شاخیں رکھی جاتی ہیں۔ اس رسم کو دُمپھاؤ کہتے ہیں۔ یہ بہت قدیم رسم ہے جس میں مقدس درخت صنوبر کی شاخیں بھی پیش کی جاتی ہیں۔

شادی سے ایک دن پہلے خستہ روٹی (خمیری روٹی) بنائی جاتی ہے۔ اس دوران لڑکے والوں کی جانب سے ایک مخبر یا کارندہ آکر گھر کے باہر بیٹھ جاتا ہے۔ اُس کو گھر کے اندر بلایا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ بڑے خوف اور شرماہٹ سے گھر میں داخل ہوتا ہے۔ اسی وقت تھوڑا سا آٹا اس کے سر اور بائیں کندے پر چھڑکایا جاتا ہے۔ اُس کے بعد بڑے احترام اور ادب سے بیٹھا کر ''مشٹی فیال'' (چپاتی) کے ساتھ دیسی گھی صرف اُسی مہمان کو پیش کیا جاتا ہے۔ اُسی دوران دلہن کے خاندان والے چھوٹے بڑے معزز مہمانان کو بہت زیادہ مذاق کا نشانہ بناتے ہیں اس کے لباس اور چوغے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر اُس کو محفل میں ناچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تمام بچے شوروغوغا کر کے اس کو خوب تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس بچارے آدمی کو بہت احتیاط کے ساتھ ہر چیز سے معذرت کرنا پڑتی ہے۔ بحرحال باادب بیٹھنا ہرصورت اُس کے لئے لازم ہے۔

یہ سب رسومات اصل شادی کی دعوت سے کچھ دن پہلے منعقد ہوتی ہیں جس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں دوست و احباب مدد کے لئے آجاتے ہیں۔ اگرچہ اس کے بعد دلہا اور دلہن کے گھروں میں شادی کی ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دلہا کی طرف سے شادی میں آئی ہوئی ہر ایک لڑکی کو دیسی گھی کھلانے کی توقع کی جاتی ہے۔

دلہن اور دلہا عموماً الگ الگ نصف گھنٹے کی تاخیر سے لڑکی کے گھر سے

لڑکے کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔ دلہن کی طرف سے کوئی قریبی رشتہ دار' بھائی یا ماموں بارات کے ساتھ جاکر گھر میں رات گزارتا ہے۔ اگلی صبح دلہا کے گھر میں دوست و اقارب میں تحائف تقسیم ہوتے ہیں جن میں چوغہ' پیسے' کپڑے وغیرہ شامل ہیں اس موقع پر رشتہ داروں کو ان کے معیار کا تحفہ پیش کیا جاتا ہے۔ بہت قریبی رشتہ دار تین دن تک وہاں قیام کے بعد جاتے وقت گائے' گھوڑا یا کوئی اچھی چیز لیکر جاتے ہیں۔

ہنزہ میں شادی کی رسومات تھوڑی مختلف اور سادہ ہیں جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تمام شادیاں عموماً نصف دسمبر کو منعقد ہوتی ہیں۔ یہ زبردست رواج موجودہ میر نے رائج کیا ہے جس کی وجہ سے فضول خرچی کم ہوئی ہے۔ سب لوگ ہر کہیں جانے کے بجائے اپنے قریبی گھروں میں ضیافت پر جاتے ہیں اور ساتھ میں میر کو شادی فیس بھی وقت پر ادا کرسکتے ہیں۔ بوڑھے آدمی کو خوف و شرماہٹ سے گھر میں داخل کرانے کی رسم یہاں نہیں یہاں وہ بلا تکلف گھر میں داخل ہو جاتا ہے۔ موسیقار صرف ایک گھر تک محدود نہیں بلکہ ہر شادی میں ڈھول بجاتے ہیں۔ اچھے اچھے گانے بجانے کا رواج ہے خاص طور پر ان دِنوں میں دلہا کے ساتھ میر اور اس کے آباؤاجداد کی تعریفی غزلیں اور قصیدے گائے جاتے ہیں۔

ہنزہ میں چار قبیلے ہیں اس وجہ سے مہمان الگ الگ اپنے اپنے قبیلوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ براتیلنگ اور درمیتنگ ایک دوسرے کے مقابلے میں گانے گاتے ہیں اسی طرح خروکز اور بُرونگ بھی ایسا کرتے ہیں۔ سارے قبیلے اپنے اپنے آباؤاجداد کے قصیدے گا کر فخریہ طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں جو زیادہ گانے گاتے ہیں وہ ہی پہلی قطاروں میں بیٹھ کر کھانے پر جھپٹ پڑتے ہیں دوسرے تمام لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں۔

میاں بیوی کے درمیان بے وفائی ماضی کی طرح زیادہ نہیں۔ کوئی مرد اپنی بیوی کو کسی اور کے ساتھ دیکھے تو اُس کو اُسی جگہ مار دینے کا حق رکھتا ہے اگر وہ تاخیر کرے تو قتل کرنے کا موقع ضائع ہوتا ہے۔ فوری طور پر مارنے کا مقصد کسی سمجھوتے پر متفق نہ ہونے سے پچھلے شوہر کے قتل کا خوف ہے۔ اگر جوڑا بھاگ کر سیدھا میر کے پاس پہنچ جائے تو وہ محفوظ رہتا ہے کوئی ان کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن وہ اپنی بقیہ زندگی میر کی غلامی میں گزار دیتے ہیں۔ اگر وہ دونوں راجا یا میر اور اپنے پچھلے شوہر کو اس کے مال واسباب کا دگنا ادا کریں تو معاملہ یہی ختم ہوتا ہے اور عورت نئے شوہر کے ساتھ ان کے گھر جاسکتی ہے۔ تاہم پونیال میں اس معاملے کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیا جاتا ہے ہلکی پھلکی سزا وجرمانے کے بعد اغوا کنندہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ میں نے تمام معلومات دو تین دفعہ کئی ذرائع سے جمع کی ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ لوگ سچ نہیں بولتے بلکہ لوگوں کے بتائی ہوئی معلومات میں گوناگونی اور فرق بہت پایا جاتا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شادی جیسی اہم رسم میں بہت زیادہ تبدیلیاں آچکی ہیں اور پرانی چیزیں ختم یا مٹتی جارہی ہیں۔

ان شادیوں میں سب سے اہم اور دلچسپ چیز پھپاؤ (پُھلکہ) کے ساتھ گھی پیش کرنے کی رسم ہے جو تمام مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے(اس رسم کو اِشپری کہتے ہیں: مترجم)۔ اس کے علاوہ نرم چپاتی (خستہ) یا شربت کو شادی کی ضیافت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جسے مہمان کھا کر بہت لطف اندوز ہوتے ہیں ان رسومات میں مذہبی پیچیدگیاں نہیں۔

باب نمبر: 16
لوک کہانیاں

قراقرم میں اب بھی بہت ساری ایسی لوک کہانیاں موجود ہیں جو وقت کے ساتھ اپنی اصلیت کھو رہی ہیں یا ان کی لوگ غلط تشریح کرنے لگے ہیں درحقیقت ان کی تشریح کچھ اور ہوسکتی ہے۔ تمام مسلمان ملکوں کے ساتھ یہ المیہ ہے کہ وہ مسلمان ہونے سے پہلے کی کہانیوں کو زندہ رکھنا یا ان کو دُہرانا عار اور شرم محسوس کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں اب بھی چلی یعنی صنوبر(سجی چلی) کی اہمیت و تقدس قائم ہے' اس کا دھواں' شاخیں' لکڑی اور پتوں کے ساتھ دیوار یا صنوبر اور جنیپر کو اب بھی لوگ مقدس سمجھتے ہیں اور بہت ساری رسومات میں ان کا اہم کردار ہے۔ جب کوئی بیمار ہوتا ہے تو صنوبر کی شاخوں کے گچھے کو جلا کر اس کے دھوئیں کو مریض سونگھتا ہے۔ صنوبر کی شاخوں کو شادی کے دنوں میں بھی جلا کر گھر کو اس کے دھوئیں سے پاک کیا جاتا ہے۔ نئی فصل کا غلہ ذخیرہ کرنے سے پہلے صندوق کو اسی کے دھوئیں سے پاک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کئی ایک کھانوں خاص طور پر پھپاؤ کو خوشی اور شادی پر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان علاقوں میں اب بھی پریوں اور جنات کا تصور ہے جن کو اسلامی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ ان میں دو خاص طور پر بہت مشہور ہیں ایک 'بیچ' اور 'رُوئی'۔ ہنزہ اور نگر میں ان کو 'پھت' اور 'بلاس' کہتے ہیں۔ 'پھت' اور 'بیچ' مرد ہیں جبکہ 'روئی' یا 'بلاس' عورت ہے بدروح یا خیالی مخلوق! اعلیٰ خاندانوں کے لوگ ان باتوں پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہنستے ہیں لیکن نچلے طبقے کے لوگ اب بھی ان پر مضبوط عقیدہ رکھے ہوئے ہیں بیچ اور روئی کے بارے میں ابھی ان کا یقین بھی بدل رہا ہے۔ مثال کے طور پر فیاض علی جو دولت

شاہ کا سوتیلا بھائی ہے، آج کل ہندی سے علی آباد ڈاکیا کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ ایک دن چاندنی رات میں وہ اکیلا جا رہا تھا اس کی دو ہمسایہ عورتیں، جن کو وہ جانتا تھا، راستے میں سامنے آگئیں۔ عورتوں نے کہا کہ وہ اس بکری کو ڈھونڈ لائی ہیں جو گم گئی تھی مگر وہ مرنے والی ہے آپ مہربانی کر کے ذبح کریں تاکہ حلال ہو۔ اُس نے بکری کو زمین پر لٹایا اور معمول کے مطابق ذبح کر کے اس کا گلہ کاٹ دیا۔ مگر وہ حیرت سے دنگ رہ گیا اُس کے ہاتھ میں بکری کے بجائے ایک آدمی کا ہاتھ تھا!

گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ ایک بوڑھا آدمی مرنے والا ہے اور وہ دونوں عورتیں اس کے سرہانے نوحہ کر رہی ہیں۔ بوڑھے کا گلہ کٹا ہوا تھا۔ بلاس کے کہنے پر جس بکری کو اس نے ذبح کیا تھا وہ بڈھا تھا بلاس نے بوڑھے کی موت کو یقینی بنایا۔ یہ کہانی بہت مشہور ہے اس کے بعد فیاض علی کو بلاس کا قصاب کہا جانے لگا۔ موصوف کا کہنا ہے کہ اُس کے ساتھ یہ واقعہ تین دفعہ پیش آیا چوتھی دفعہ اس نے گلہ کاٹنے سے انکار کیا تو بلاس بہت غصے میں آگئی اور اس کو پکڑ کر دینور کوٹ لے گئیں جو گلگت سے چھے کلومیٹر دور کافی بلند پہاڑی پر دینور کے اوپر واقع ہے۔ یہاں فیاض علی نے ماتھے پر ایک آنکھ کے ساتھ ایک آدمی کو دیکھا جو اُن کا بادشاہ تھا۔ ہنزہ کے اس بچارے آدمی کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا جس نے للکارکر کہا کہ تم نے گلہ نہ کاٹنے کی ہمت کیسے کی؟ اگر آپ نے ہماری بات نہ مانی تو اگلی دفعہ آپ کا اپنا گلہ کٹ سکتا ہے۔ خوفزدہ ہو کر فیاض علی نے آئندہ حکم کی تعمیل کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ جس وقت فیاض علی وہاں پہنچا تھا تو ان کے شام کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ فیاض علی کو بھی کھانے کو کہا گیا کچھ لقمے لیکر محسوس کیا کہ گوشت نمکین ہے اسی دوران ایک خاتون اپنے ہاتھ میں سونے کا ترازو لیکر

آئی جس میں وہ آدمی کا تازہ گوشت تول کر وہاں پر موجود سب کو دے رہی تھی۔ اس واقعے کے بعد فیاض کو واپس اُس کے باغ میں چھوڑ دیا گیا جو تقریباً بادشاہ کے محل سے چار دن کی طویل مسافت پر واقع ہے۔ موصوف کی ماں نے یہ واقعہ سن کر ایک مذہبی عالم دین سے تعویز بنوایا جس کے بعد فیاض علی ان بلاس کی زد سے محفوظ رہا۔

'پھت' صرف اناج ذخیرہ کرنے کے وقت سردیوں میں نمودار ہوکر لوگوں کا ذخیرہ کردہ اناج بکسوں سے چراتا ہے۔ ان سے بچنے کے لئے لوگ ایک بڑے برتن میں آٹے میں پانی ملاکر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ کڑوی خوبانی' مرچیں اور نمک ملاکر اس آمیزے کے درمیان رکھ دیتے ہیں جس کو پھت کے دلیے کی کھیر یا پھت ومل کہتے ہے۔ ان کو پسے ہوئے آٹے کے کونے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ پھت آ کر اس کو کھانے لگ جاتے ہیں اس دوران کراہے ہوئے اناج کو لوگ جلدی سے جمع کرتے ہیں جبکہ پھٹ اس محلول کے ساتھ مصروف رہتے ہیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ایک طرف پریاں اور دوسری طرف کسان جلدی جلدی اناج جمع کررہے ہوتے ہیں۔ یہ رواج پوری ایجنسی میں عام ہے۔

پونیال میں ایک بھوت بہت مشہور ہے۔ دن کے وقت وہ بیوی اور خاندان والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا مگر رات کو وہ بدل جاتا ہے۔ اس کے لمبے تیز دانت اور بڑا منہ ہوتا ہے۔ یہ جاڑیوں کے پیچھے چھپ کر مسافروں کو نزدیک آنے دیتا ہے پھر ان کو پکڑ کر پھاڑ دیتا ہے۔ اس کو دایل کہا جاتا ہے۔

دایل بہت ماہر جادوگر کی طرح ہوتا ہے ہنزہ میں اس کو بیٹن کہتے ہیں۔ وہ بڑی بڈھی عورتیں ہوتی ہیں۔ 1933ء کو ہنزہ میں میں نے ان اجنبی چیزوں کو اپنے سفر پر جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ عموماً یہ عورتیں بیمار قسم کی ہوتی ہیں اس لئے

میں نے عورت کے بجائے ایک مرد سے رجوع کیا۔ یہ جادوگر یا ساحر مخلوق اکثر زمیندار یا کسان ہو تو زبردست کام کرتے ہیں اگر سحر سے خالی ہو تو عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بھی گائے کی مصنوعات کو ہاتھ نہیں لگاتے نہ دودھ پیتے اور نہ ہی گائے کے فضلے سے بنی دیسی کھاد اٹھاتے ہیں۔

ایک دفعہ ہم سب بلتت قلعہ کے نیچے پولو کے لمبے میدان میں جمع ہوگئے۔ یہ بہت اچھا میدان ہے کیونکہ اس کے اطراف میں سفیدے، خوبانی اور اخروٹ کے درختوں کا سایہ اور ساتھ مخالف سمت میں ڈھلوان سبزہ زار ہے۔ ایک نوجوان بیٹن لمبے بالوں کے ساتھ پاؤں میں زخم ہونے کی وجہ سے لنگڑاتا ہوا آیا۔ جب وہ میدان میں داخل ہوا تو جونیپر کی ٹہنیوں کو جلاکر اس کے نتھنوں کے نیچے رکھ دیا گیا۔کڑوے دھوئیں کو سونگھنے کے لئے وہ کپڑا سر پر ڈال کر نیچے بیٹھ گیا تاکہ دھواں کہیں نہ جائیں۔ سُرنائی اور ڈھول بجنا شروع ہوئے۔ پہلی تین فٹ لمبی بانسری کی جو لرزتی ہوئی باریک آواز نکلی وہ پریوں کو پسند تھی لیکن دوسری سُرنائی کی آواز سے وہ بہت خوفزدہ ہوئے۔ بیٹن کافی دھواں لیکر اچانک بالوں کو اُچھالتے ہوئے ہاتھ پھیلا کر منہ کے بل اوپر نیچے چھلانگیں لگانے لگا اس کے منہ پر صنوبر کی بہت شاخیں لگی ہوئی تھیں۔ تماشائیوں نے اس کو اٹھایا اور وہ دوبارہ لپٹ کر گول دائرے میں رقص کرتا رہا ناظرین نے درمیان میں آکر بہت غوغا کیا اور تالیاں بھی بجائیں۔ وہ کبھی رُک کر درویش کی طرح گھومتا ناچتا جس پر لوگ بہت زیادہ شوروغل کرتے تھے۔ وہ رقص کرتے ہوئے ڈھول کے سامنے جاکر ان کو خوب گرما پھر خاموش ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے آرام آرام سے گول چکر لگا کر جادوگر کی طرح گول گھومتا ہوا رقص کرتا تھا۔ تماشائی اس کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے تالیاں بجا کر شور مچاتے تھے۔ وہ جھوم کر آنکھوں میں حسرت اور مسکراہٹ لیکر رقص میں جاتا

تھا۔ وہ پریوں کی طرف دیکھ کر اپنے پاؤں کو تیز لہراتا اور اپنے آستینوں کو بازو سے چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن اکثر وہ ایسا کر نہیں پاتا۔ لوگ اتنا شور مچا رہے تھے کہ وہ رقص میں گول گھوم گھوم کر دائرے سے غائب ہوجاتا تھا۔

اس محفل میں بلی کی آوازیں، تالیاں، شوروغل، شاباشی جملے، سیٹیاں اور ہر طرح کی آوازیں نکالی گئیں۔بیٹن تماشیوں کے درمیان اوپر نیچے طاقت سے اُچھلتے ہوئے جھول رہا تھا۔ ایک چھڑی اس کے ہاتھ میں دی گئی۔ وہ پریوں کی طرف دیکھتا رہا جو ہمارے اوپر درختوں کی شاخوں پر بیٹھی ہوئی تھیں وہ گرم ہوکر ڈھول کے قریب جاکر دھیمی آواز میں سنتا پھر جذباتی ہوکر رقص میں گم ہوجاتا تھا اچھل کود کر اچانک وہ ایک کان سے سن کر پھر دوسرے سے کچھ سننے کی کوشش کرتا تھا۔ لوگ سمجھنے لگے کہ وہ مدہوش ہوچکا ہے اس لئے اچانک خاموش ہوئے اور وہ بولنے لگا۔ بانسری اور ڈرم اتنے دھیمی آواز سے بج رہے تھے کہ مشکل سے کچھ سنائی دیتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ 'میں چین گیا تھا۔ میں نے وہاں ایک بچے کو اپنی گردن میں زنجیر ڈالتے دیکھا وہ جلدی تاج پہننے والا ہے'۔ پھر سرنائی اور ڈھول زور سے بجنے لگے۔ اتنے میں بیٹن وہ چھڑی اپنے ہاتھ سے چھوڑ کر ہاتھ سے ڈھول کی تال پر تالیاں بجا کر اچانک اپنے جذبات توڑ کر ڈھول سے دور چلا گیا۔ ایک بار پھر پورا ماحول بدل گیا۔ بیٹن دائرے میں گھومنا شروع ہوا۔ وہ پریوں کو جو میدان کے اطراف میں درختوں کے اوپر بیٹھی ہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے رقص میں میں گم ہوجاتا۔ اچھلتے کودتے اپنے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر تیز رقص کی وجہ سے تھک کر ڈھول کے ساتھ تھوڑا آرام کرتا تب اس کو پانی دیا جاتا ہے جس کو کچھ پی کر بچا پانی غیر مہذب طریقے سے نیچے پھینک دیتا۔ وہ دوبارہ ڈھول کے بہت قریب جاکر دھیمی آواز میں سنتا پھر کہتا ہے کہ 'میں نے چین کے کالے شہر میں خون

کی جھیل دیکھی۔ اس ملک میں کوئی خوراک نہیں سب کے سب مر رہے ہیں‘۔ اس کے بعد وہ تھوڑا چکر لگا کر چھلانگ مارکر ایک آدمی کے پشت پر سوار ہو کر چلا گیا۔

یہ کرتب بہت دلچسپ اور حیرت انگیز تھا۔گھٹنے کی چوٹ کے باوجود اس کے کرتب میں کوئی کوتاہی نہیں آئی صرف دو دفعہ غیبی باتیں بتائیں۔ ان تمثیلات کو ریکارڈ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ تاہم یہ کہا جاتا کہ یہ بیٹن عموماً ہمعصر حالات کے بارے میں پیش گوئیاں کرتے ہیں ان کی باتیں چینی ترکستان کے باغیوں کے بارے میں ہوسکتی ہیں جو آج کل بغاوت کرکے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ماضی میں یہ معمول کی باتیں تھیں کہ بیٹن مقامی حالات کے بارے میں پیش گوئی کرتے تھے۔ یہ میر یا حاکم کے لئے موجودہ حالات جاننے کا شاندار طریقہ ہے۔ میر نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنی زندگی میں سات بیٹنوں کو دیکھا ہے جو ابھی ستر سال کے ہیں۔

بکروٹ گلگت سے نیچے دریا کے بائیں جانب ایک گاؤں ہے جو گلگت سے بہت دور نہیں مگر راستہ دشوار گزار ہے۔ بکروٹ کے لوگوں سے منسوب بہت ساری روایات ہیں۔ اس گاؤں میں کم تر شین قبیلہ کے لوگ اپنی بے وقوفانہ کہانیوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ایک دفعہ بکروٹیوں کا پونیال سے جنگ کا اتفاق ہوا۔ ان کے درمیان ایک پونیالی سپاہی رہتا تھا اُس نے اُن سے کہا ’کہ میں آپ کو پونیال پر حملے کا آسان راستہ دکھاؤنگا۔ یہ زبردست مختصر راستہ ہے اگر آپ اس میں سے جائیں گے تو دشمن حیرت زدہ رہ جائیں گے لیکن اس کے لئے آپ کو دریا کے سونے کا انتظار کرنا ہوگا تب آپ اُس کو پار کرسکتے ہیں‘۔ وہ تمام فوجیوں کو لیکر ایک ایسی جگہ گیا جہاں دریا بہت گہرا اور ٹھہرا ہوا تھا۔’ آہ‘ یہ دیکھو! ’اُس نے کہا، یہ زبردست اچھا موقع ہے۔ دریا سونے جارہا ہے۔ آؤ بیٹھ کر انتظار کریں‘۔ کافی

دیر کے بعد اس نے گائے کا ایک خشک گوبر دریا میں پھینکا۔ گائے کا خشک فضلہ سکون سے تیرنے لگا۔’ آہا! بہت شاندار‘ سپاہی نے کہا۔’دریا اب سونے لگا ہے آؤ اس کو پار کرتے ہیں‘۔ تمام بکروٹی تیرنا نہیں جانتے تھے اس لئے تمام کے تمام ڈوب گئے۔

ایک دفعہ ایک بکروٹی آٹھ روپے لیکر کچھ کپڑے خریدنے گلگت گیا۔ بازار سے گزرتے ہوئے اس نے ایک بڑے تربوزے کو دیکھا جو اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے پوچھا یہ کیا ہے؟’ آہ‘ دوکاندار نے کہا۔’یہ ہاتھی کا انڈا ہے۔ ہاتھی ایک بڑا جانور ہے۔آپ کے گھر والے سب ان پرسواری کر سکتے ہیں۔ اِس انڈے سے وہ جلدی پیدا ہوتا ہے‘۔ بکروٹی نے اپنے آٹھ روپے سے انڈہ خریدا اور گھر کی راہ لی۔جوں ہی وہ اپنے گاؤں کے ڈھلوان نالہ سے گزررہا تھا اچانک انڈہ اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور سینکڑوں ٹکڑوں میں منقسم ہوگیا۔ انڈہ (خربوزہ) کے گرتے ہی ایک خرگوش قریب سے بھاگ نکلا۔ بکروٹی بہت پریشان ہو کر پورا وقت خرگوش کو پکڑنے کی کوشش میں لگا رہا لیکن وہ اُس کو پکڑ نہ سکا۔ دیر سے واپسی پر اُس کی بیوی نے پوچھا کہ کپڑے کدھر ہیں؟ اُس نے تفصیل سے ہاتھی کے انڈہ کے بارے میں بتایا اور کہا کہ جوں ہی وہ انڈا میرے ہاتھ سے گر گیا ہاتھی کا بچہ نکل کر فرار ہوگیا جس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑنے کی کوشش میں دیر ہوگئی۔

ایک دفعہ گلگت کے راجہ نے تمام بکروٹیوں کو ملاقات کے لئے گلگت بلا لیا۔ تمام گاؤں والے راجہ کو نہیں جانتے تھے اس لئے پریشان ہوئے کہ اُن سے کیسے ملاقات کریں۔ اُن میں سے ایک شخص نے کبھی گلگت میں راجہ کو دیکھا تھا۔ اس لئے اُس نے دوسروں سے کہا کہ میں جو کرونگا آپ بھی ایسا ہی کریں یعنی

جھک کر راجہ کا ہاتھ چومیں۔ وہ سب گلگت روانہ ہوگئے۔ گرمی کے موسم میں راجہ اپنے تخت پر گدی بچھاکے باہر ہی براجماں تھے۔ ان کے گرد ان کا کورٹ تھا؛ ان کے مشیر خربوزہ کھاکر چھلکے نیچے فرش پر پھینک رہے تھے۔ روایت کے مطابق خربوزے کے موسم میں راجہ عموماً کورٹ روم میں ہی خربوزہ کھایا کرتے تھے۔ بگروٹیوں کے وفد کے سربراہ نے راجہ کا ہاتھ چومنے کی کوشش کی اور خربوزے کی چھلکوں پر پاؤں پھسلنے کی وجہ سے گر گیا۔ جب اُن کا سربراہ گر گیااسی وقت جتنے ساتھ کھڑے تھے سب کے سب فرش پر گرنے لگے!۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب نمبر: 17

ہنزہ کے شمالی وادیاں

ہنزہ کے شمالی وادیوں(گوجال) کے بارے میں کچھ لکھے بغیر اس کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی کیونکہ یہ وسطی ایشیاء کے لئے منتخب مختصر راستہ ہونے کی وجہ سے شہرت رکھتی ہیں۔

بلتت کے پیچھے ایک مضبوط چٹان کے اوپر التت کا قلعہ اور خوبصورت گاؤں ہے جہاں سے آگے دریا کی جانب الگ راستہ نظر آتا ہے۔ موسم خزاں میں ہنزہ کے ڈھلوان پر خوبانی کے کثیر درختوں کاہلکاسندوری منظر نظر آتا ہے۔ التت ریاست ہنزہ کا آخری شمالی سرحدی گاؤں ہے۔سکون اور معاش کی تلاش میں یہاں سے آگے کے باشندے ہر اس جگہ میں آباد ہورہے ہیں جہاں زندگی گزارنے کے لئے میدان کھیت اور کاشت کی گنجائش ہے۔ التت ہنزہ سے آگے کا راستہ بالکل دشوار گزار ہے دریا کے ساتھ ساتھ راستہ چٹانوں پر لکیر کی طرح نظر آتا ہے۔ حکومتی خچرپاس روڈ بہتر اور اچھے انداز میں التت تک بنایاگیا ہے۔ یہاں سے آگے قدرتی راستہ ہے کہیں دریا کے ساتھ اوپر نیچے بڑھتے چڑھتے گزرنا ہوتا ہے اور کہیں چٹانوں کے درمیان میں سے آگے گزرنا پڑتاہے۔ اس راستے کو نہایت مہارت اور صبر آزماطریقے سے بنایا گیا ہے۔ پتھروں کی خشک دیواریں' چٹانوں کے بیچ نمایاں طور پر چھوٹی چھوٹی گلیوں کی طرح یہ راستہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

التت سے آگے پہلا گاؤں گلمت ہے؛ یہاں ایک سفید تختی نما چٹان پر Lord Kitchener کا نام نمایاں لکھا گیاہے جو قراقرم وادی کے کمانڈر انچیف

ہوگزرے ہیں۔ بالائی ہنزہ میں گلمت پہلا گاؤں ہے جسے چھوٹا گوجال کہا جاتا ہے۔ سارے لوگ وخی ہیں کسی زمانے میں ان کا اپنا راجہ تھا لیکن اب یہ بھی میر آف ہنزہ کے زیر تسلط ہے۔ دراصل یہ افغان اور روسی ریاستوں کے خانہ بدوش ہیں جن کے آباؤاجداد ہجرت کرکے اپنی چراگاہیں چھوڑ کر یہاں آباد ہوگئے ہیں۔ انہوں نے اپنی پرانی عادتیں چھوڑی ہیں اور اب زراعت کے ساتھ منسلک ہوچکے ہیں۔ درحقیقت وہ بہت زبردست کاشت کار بن چکے ہیں ان کی فصل کی پیداوار بھی شاندار ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے مال مویشی پالنے کی مہارت کو بھی زندہ رکھا ہے ان کے ریوڑ اور دیگر چیزیں ہنزہ کے لوگوں سے بہت اچھی اور نمایاں ہیں۔

ہنزہ کا موجودہ میر بھی ماں کی جانب سے وخی النسل ہیں۔ ان کا گلمت میں ایک شاندار گھر ہے ایک دفعہ میں ان کی موجودگی میں وہاں گیا ہوں جو اکثر گرمیوں میں سالانہ گلمت آتے جاتے ہیں۔ یہ محل دلکش اور دیکھنے کے لائق ہے۔ قافلے میں پہلے ان کے محافظ پھر میر اور ان کے بیٹے تشریف لاتے ہیں۔ اُن کی آمد کے موقع پر ڈھول ڈھماے کی شاندار محفل موسیقی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور وہ اپنے شاہی قافلے کے ساتھ اپنے گرد رعایا کی موجودگی میں تشریف لاتے ہیں۔

غلمت ایک نمایاں جگہ ہے یہاں کے درخت اور فصل بہت شاندار ہے پانی کی فراوانی کے ساتھ گلمت دھوپ کے لحاظ سے بھی مزیدار ہے جہاں بہت دھوپ پڑتی ہے۔ گلمت سے آگے قراقرم کی تنگ گھاٹی کا راستہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ اس کو بارشوں' سیلاب' پتھروں اور برفانی تودوں نے کہیں کہیں بہت خراب کر رکھا ہے۔ دریا میں پانی کم ہوتے ہی بہت سارے ٹیڑھی اور خم دار جگہیں پار کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور سفر ہمیشہ دریا کے ساتھ نشیبی علاقوں سے ہی

ہوسکتا ہے۔

سبزاہٹ نمایاں اور دلربا ہے لیکن بلندوبالا جگہیں ہونے کی وجہ سے کافی سخت اور دشوار ہیں۔ بنجر اور خشک کھردری چٹانیں کبھی کبھی مسافروں کو بہت پریشان کر دیتی ہیں۔ کہیں کہیں سے بلندوبالا چوٹیوں کا نظارہ ہوتا ہے اکثر ان اونچی چٹانوں نے اپنی وسیع الدامنی اور عمودیت کی وجہ سے وادی کو تنگ بنا رکھا ہے جیسے کسی علاقے کو دیوار بنا کر بندکر دیا گیا ہو۔ مسافر اکثر سوچتے ہیں کہ کب ان تنگ گھاٹیوں سے نکل کر اپنی منزل پر پہنچیں۔

راستے میں دو عظیم گلیشیرز پھسو اور دوسرا بٹورا واقع ہیں۔ بٹورا گلیشیر کو میں نے سات دافعہ دیکھا ہے مگر ہمیشہ اس کو دیکھنے کا منفرد مزہ آتا ہے۔ کبھی کبھار یہ بہت آسان پرسکون اور سڑک کی طرح لیکن کبھی کبھار اس میں شگاف اور دراڑیں پڑ جاتی ہیں جس کی وجہ سے سفر دشوار اور مشکل ہونے کے ساتھ طوالت پکڑتا ہے اور گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ یقیناً بٹورا گلیشیر جاذب نظر قدرتی منظر ہے لیکن گھوڑے کے ساتھ اس پر سفر کے دوران پانی دگنا ہو تو اس کو پار کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

ان دو گلیشیرز کے درمیان پھسو کا خوبصورت گاؤں ہے لیکن یہ اتنا خوش قسمت نہیں رہا کیونکہ شمال کی جانب خوبصورت چراگاہ سیلاب اور زیادہ پانی کی وجہ سے بالکل تباہ ہوچکی ہے اس نے نہ صرف چراگاہ بلکہ آبپاشی کے نظام کو بھی درہم برہم کیا ہے پانی کا رخ مڑنے کی وجہ سے نہر کی مرمت بھی ممکن نہیں رہی ہے۔ دوسری طرف دریائے شمشال نے تباہی مچا رکھی ہے ہرے بھرے کھیت اس کی نذر ہوچکے ہیں۔ اگرچہ یہ بہت مایوس کن مرحلہ ہے لیکن پھسو کے وخی لوگ بہت محنتی اور ہنرمند ہیں۔ ان کے سیب اس ریاست میں سب سے اچھے خوبصورت گلابی

رنگ کے بہترین نسل کے ہیں۔

وخی عادتاً صاف ستھرے لوگ ہیں انہوں نے اپنی خانہ بدوشوں والی عادت ترک کردی ہے؛ پھسو کے لوگ بھی وہی کر چکے ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے کہ لوگ بغیر جوتوں کے بے یارو مددگار ہوتے ہیں لیکن وخی اپنے لمبے نرم جوتوں کی وجہ سے مشہور ہیں یہاں تک کہ ہنزہ میں حکایت موجود ہے کہ' وخی کے ساتھ جھگڑا مت کرو بلکہ ان کے جوتے کو چھین لو'۔

پھسو ایک ایسی جگہ پر واقع ہے جہاں قدرت نے ہر چیز کو بہترین بہت دلرُبا اور حسین پیدا کیا ہے۔ اس مقام پر وادی کافی کشادہ ہے ایک طرف دو گلیشیر ہیں لیکن دونوں نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہاں کا سب سے دلکش منظر بلند چوٹیوں کا نظارہ ہے اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلۂ سخت دشوار اور کھردری چٹانیں' ہموار زمین سے لیکر کالے پانی کے دریا تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مخالف سمت میں بدشگون دریائے شمشال کی تنگ وادی کے باوجود سب مناظر مل کر ایک حسین نظارہ بناتے ہیں۔

اس گاؤں سے آگے وادی دوبارہ بہت تنگ حدود میں داخل ہوتی ہے عموماً قراقرم کے پہاڑی سلسلوں تنگ درّے عام سی بات ہے۔ خیبر کے مقام پر گھاٹی تنگ سنگ وسنگلاخ پہاڑی دروازے میں قفل وکلید کی طرح آگے بڑھتی ہے۔ خیبر کے پہاڑوں پر کچھ جنگل نظر آتا ہے مگر بدقسمتی سے اتنی پھیلی جگہ پر درخت مایوس کن ہیں بحرحال صنوبر پورے ہنزہ میں پائے جاتے ہیں جن کی لکڑی کوئی خاص نہیں۔

اونچائی کی طرف بڑھتے ہی جنگلی منظر میں اضافہ ہوتا جارہا ہے لیکن یہاں بھی جنگلی درخت غیر گنجان لگتے ہیں۔ وادی کی چٹانوں کا سلسلہ اور پتھریلی

خاصیت اس کے نقشے کو سنگلاخ اور دشوار بناتی ہے۔ یہاں پر ایک یا دو قدیم پل ہیں جو دریا پار کرنے کے لئے کافی ہیں جن پر چلنا خطرناک بھی ہوسکتا ہے جیسے ہم اپنے خوش گاؤ کو اتنی کوشش کے باوجود ان پلوں سے نہ گزار سکے۔ پامیر میں کوئی پل نہیں اس لئے اجنبی چیز سے گزرنا خوش گاؤ کے لئے ممکن نہ تھا۔ ہماری ایک نہ سن کر ہمارے خوش گاؤ نے دریا کو بڑی خوشی سے پار کیا۔

ہنزہ کا آخری گاؤں مِسگر اس ریاست کی حتمی سرحد ہے جہاں ایک ٹیلی گراف کا دفتر ہے جہاں سے اِس سرحد کے بارے میں خبرگیری کی جاتی ہے۔ اِس دفتر کو چلانے والے دو کشمیری برہمن ہندو ہیں یقیناً یہ مسلمانوں کے اِس علاقے میں غیر فطری طور پر منفرد اور اجنبی لگتے ہیں۔ وہ نہ صرف خود بلکہ ان کے کھانے اور یہاں ان کی موجودگی بھی عجیب لگتی ہے۔ سڑک ٹوٹی پھوٹی دور افتادہ اور ہیجان کُن ہونے کی وجہ سے دونوں قیدیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ وہ واپس کشمیر جانے کے لئے بے چین اور مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ ایک دفعہ ان میں سے ایک نے آہیں بھرتے ہوئے اپنی حالت بیان کی۔ آہ! یہ سفر بہت خطرناک ہے۔آتے وقت میں نے تمام آفیسران کو ٹیلی گراف کیا تھا کہ' سڑک اتنی خطرناک ہے کہ روزانہ موت کے قریب سے گزرتے ہیں، ہماری زندگی کو بچانے والا کوئی نہیں اس لئے مہربانی کر کے کچھ کر لو'۔ اُس غریب کی کسی نے ایک نہ سنی۔ واقعی اتنی خستہ حال سڑک میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اُن میں سے ایک پردیسی کی حالت میں ہی وفات پا گیا جس کے بارے میں اگلے باب میں پورا واقعہ بیان کیا جائے گا۔

مِسگر سے دو راستے چین تک جاتے ہیں۔ جوں ہی مسافر آگے بڑھتے ہیں ان کے سامنے برف اور چٹانیں ہی نظر آتی ہیں۔ مشرق کی جانب قراقرم کا سلسلہ لیون لن Kuen Lu اور ہمالیہ، شمال مغرب کی جانب کوہ ہندوکُش اور پامیر

،جنوب کی جانب گلگت اور کشمیر کے برفانی سلسلے واقع ہیں۔ یقیناً آسمان کو چھوتے بلند پہاڑی سلسلے ایشیاء میں بہت ناروا' مشکل ترین اور نفرت انگیز جغرافیائی حالات کے حامل ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باب نمبر: 18
چپُورسَن

ہنزہ کو خراج دینے والی اہم وادیوں میں سے ایک وادی چپورسن ہے جس کی جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر کبھی کبھار منتظمین یہاں کا دورہ کرتے ہیں۔ چپرسن قدیم زمانے میں ریاست ہنزہ کا حصہ نہیں رہا بلکہ خانہ بدوش کرغز اور وخیوں نے اس کو آباد کیا۔ وخیوں نے چند ہنزہ والوں کے ساتھ مل کر یہاں سکونت اختیار کی جو وادی کے شروع میں قابض ہو چکے تھے جبکہ کرغز یہاں سے واپس اپنے علاقوں کو چلے گئے۔ چپرسن جانے سے پہلے ہم مسگر گئے جو دس ہزار فٹ سطح سمندر کی بلندی پر واقع ہے۔ ہنزہ خاص کے باشندے ہجرت کر کے اس وادی میں وخیوں کے درمیان رہ کر اپنے لوگوں اور علاقے سے کٹ کے رہ گئے ہیں۔ بہت سرد جگہ ہونے کے باوجود فصلیں بہترین پکتی ہیں۔ خوبانی کے درخت کافی ہیں لیکن پھل بمشکل پک جاتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں بہت اندھی کی وجہ سے برف بھی ٹکتی نہیں ہے۔ گاؤں میں ٹیلی گراف آفس صرف اور صرف کاشغر سفارت خانے کے مفاد کیلئے قائم کیا گیا ہے جو یہاں سے بارہ دن کی مسافت پر واقع ہے معلومات اور پیغامات پانچ دن بعد پہنچ جاتے ہیں ان پیغامات کی تاخیر کی وجہ سے بہتر انتظامات بھی نہیں کئے جاسکتے ہیں۔ پچھلے باب میں بتا چکا ہوں کہ اس ٹیلی گراف آفس میں پہلے دو برہمن ہندو تھے میرے پچھلے دورے کے موقع پر ایک یہاں موجود تھا وہ بھی بالکل ناخوش تھا۔ اس کا ساتھی حال ہی میں وفات پا گیا تو اِس کو اکیلے چِتا یعنی میت جلانے کے لئے لکڑی اکٹھا کرنی پڑی۔ چھوٹی سی ذمہ

داری کے ساتھ زندگی کو اکیلے نبھانا وہ بھی بغیر کسی ضیافت' سوسائٹی' خوراک کے دیگر مسائل میں اس ہندو کی زندگی اجیرن تھی۔آبادی اس آفس سے کافی دور ہے وہ بھی سارے مسلمان جو اپنی زبان بولنے والے کے علاوہ کسی کی کوئی خبر گیری نہیں کرتے ایسے حالات میں ان کو یہاں بھیجنا ظلم ہے۔ یہ بچارہ ہندو بہت مایوس اور پریشان ہے کیونکہ اس کا ساتھی اور داماد بھی چل بسے ہیں۔ میری موجودگی میں اس کو اس کی بیٹی کی موت کی خبر ملی۔ وہ دفتر بند کرکے ایک کونے میں بیٹھ کر رونے لگا۔ اس موقع پر اُس کا ہندو چوکیدار بھی غائب تھا جو بڑا غمگین بابو ہے!

ان پریشان لوگوں سے بڑی ہمدردی کے بعد ہم اوپر کی جانب ایک بڑے ڈھلوان سے ہوتے ہوئے اترائی کی طرف نکلے پھر 'بیڑی' نامی وادی میں داخل ہوگئے جس میں بہت خوبصورت درختوں سے بھری تاریک گھاٹیاں' صاف وشفاف پانی کی ندیاں' اجنبی علاقے' کھردری اور کالی چٹانیں موجود ہیں۔ ہمارے ساتھ ایک زرد رنگ کا کتا ہے جس کے بارے میں قلی کہتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے مارخور کا شکار کرے گا یا شکار کو تب تک روکے گا جب تک ہم شکار کو نہ مار دیں۔ میں نے کہا کہ یہ کوئی کھیل نہیں کہ ایسا ہولیکن مسگری لوگ بضد تھے کہ وہ ہرصورت میں گوشت لیکر رہیں گے۔ وہ اسی کے انتظار میں بیٹھے رہے۔ میں اور شکاری کتے نے شکار کی بھرپور کوشش کا وعدہ کیا۔ پہلی دفعہ ایک مارخور کو دیکھا جو کافی دور تھا اس لئے ہم نے کتے کو گھوڑے پر چڑھا کر دریا پار کیا کیونکہ کتّا پانی پارنہیں کرسکتا ہے۔ ہم سمجھ رہے تھے کہ کتا شکار کو ہماری پہنچ تک لائے گا لیکن مارخور ایسی جگہ پر پہنچ گئے جہاں تک رسائی ممکن نہ تھی۔ تمام رات کتّا بھونکتا رہا ہم اس کونہیں روک سکتے تھے اس لئے صبح ہم نے اُس کو واپس بھیج دیا۔ دوسرے دن کتے اور اس کے مالک کے جانے کے بعد مارخور کا ریوڑ دیکھ کرمیں ایک قریبی

نالے سے شکار کے عین کھائی کے اوپر پہنچا تھا کہ زرد کتا تیز بھاگتا ہوا شکار کو بھگاکر پہاڑ کے دامن سے نکل آیا۔ کتے نے ممکنہ شکار کو ناممکن بنا دیا۔ مجھے بے حد دکھ ہوا کیونکہ میں اِن کے شکار کے اِس طریقے سے متفق نہ تھا۔سارے قلی گوشت کے لئے بے چین اور جنونی ہوچکے تھے کیونکہ ان کو سردیوں کے علاوہ گوشت جب بھی نصیب ہوتا تو کھاتے تھے۔ بحرحال ہم اس نالے کو پارکرکے اترائی سے گزرکر چپرسن میں داخل ہوئے جہاں ہماری ملاقات نمبردار سے ہوئی جو بہت ذبردست ہوشیار' مہمان نواز' ملنسار' تمیز دار اور اپنی نسل کا بہترین انسان ہے' وہ ہماری مدد کے لئے بے چین تھا۔ نمبردار نے عورتوں کے مخمل کپڑے کا کوٹ پہنا ہوا تھا پھربھی باوقار لگ رہا تھا۔

ہم نے ایک آسان درّے کو خواہ مخواہ مشکل اطراف سے داخل ہوکر بڑی تکلیف اٹھائی۔ دراصل ہم عموداً اوپر ڈھلوان کی طرف بڑھنے والے تھے تاکہ قلی ہمارے پیچھے آئیں۔ اس لئے ٹاپ کی جانب بڑی محنت سے نکلے مگراونچائی سے کوئی بھی قلی نظرنہیں آیاجس سے ہمیں بڑی پریشانی ہوئی۔ بڑی مدت کے بعد نیک بختی سے ان کو وادی کی چوٹی کے قریب کیمپ کے پاس دیکھا۔ انہوں نے یہ بات مان لی کہ وہ ٹاپ پار کرنے کے دوران بھٹک کر خوف سے مایوس ہوچکے تھے بہرحال خوش قسمتی سے وہ مل گئے۔ہم چوٹی سے دیکھ رہے تھے کہ وہ اتنی عجلت میں گوشت کھارہے تھے جتناکہ وہ کھا سکتے پھربھی ان کی قسمت اچھی تھی کہ میں اور دولت بیگ خوش مزاج لوگ ہیں۔

اس درّے کا نظارہ بہت پرلطف رہا۔ درّے کے بالکل نیچے چپرسن وادی تھی جس کے لہلہاتے گندم اور جو کے کھیت جب کہ مخالف سمت میں بنجر اور بھوری رنگت کے پہاڑ جن کے اوپر برف اور گلیشیر چمک رہے تھے۔

ہمارا کیمپ دیہاتیوں کی گرمائی چراگاہ میں چشمہ کے پاس تھا جس کے ساتھ ہلکی کھاد ملی ہوئی تھی۔ہم نے اس سے تھوڑا نیچے ایک اور چشمہ کھود کر نکال لیا۔ پہاڑ کی جانب پنسل جونیپر کے قدیم درخت جھکے ہوئے درد بھری حالت میں خوبصورتی سے ایسادہ تھے۔ ان کی ایک یا دو شاخیں کاٹنے سے وہ خشک ہوسکتے ہیں۔ یہ درخت بہت بڑی عمر تک زندہ رہتے ہیں ان کے پتے اور تنے سڑنے سے ایک حد تک بچے رہتے ہیں۔

دوسرے دن نیچے گاؤں پہنچ کر تمام قلیوں کو ان کی اجرت ادا کر دی گئی۔ مسگر کے لوگ بڑے رَنج آور ہیں ان کے ساتھ بیوپار یا معاملہ طے کرنا بہت دشوار ہے بحرحال ہم نے خوش آمیز سلوک کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ کیوں اس قدر بدمزاج اورنا قابل اتفاق ہیں۔ اس کے بعد وہ بھی ہمارے ساتھ آزاد خیالی سے پیش آئے۔ سرحد کی چوکھٹ پر ہونے کی وجہ سے ہر ذمہ داری ان کے اوپر آتی ہے اس لئے وہ ایسا کرتے ہیں۔ سرحد کی نگہداشت' میر کے بار لانا لے جانا (میر اور ترکستان کے عہدہ داروں کے تحائف کے تبادلے کے بوجھ) ڈاک کے لئے لوگوں کو فراہم کرنا' میر کے لوگوں کا تحفظ اور اس طرح کے ہزاروں فضول کام کرنے پڑتے ہیں جو کسی اور گاؤں کے لوگ ریاست کے لئے نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ گاؤں میں کتے کی طرح زندگی گزارتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی زندگی تلخ ہے۔ دوسری طرف یہ نظرانداز لوگ ہیں کوئی بھی واقعہ ہو' تقریب ہو کسی میں کوئی شرکت نہیں جس کی وجہ سے وہ حاجیوں اور مسافروں کو لوٹتے رہتے ہیں۔

اب ہم چپورسن وادی کے بالائی اطراف کی طرف نکلنے والے ہیں جو بہت وسیع ہیں۔ موسم بہت سہانا ہے بحرحال جو بھی موسم ہو اس وادی میں پورے

دن آندھی کا راج ہے۔ اس کی بنجر اطراف کی رنگت ہلکی بادامی' سرخ' بھوری' کالی' چمکیلی اور طرح طرح کے رنگوں کی منجدھارے ہمارے سامنے ہے۔۔۔ یقیناً زبردست خشک اور دلکش منظر ہے۔

ہم چپورسن کے پرانے ٹوٹے پھوٹے کھیتوں اور گاؤں میں سے گزرے جو سیلابوں اور قدرتی آفات کی زد میں آکر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ٹینس کے میدان کی طرح سخت ہوچکے ہیں۔ اس تمام ملبے کو ہٹانا بہت مشکل ہے۔

کچھ سال پہلے تک ہنزہ میں سب سے زیادہ فصلیں اسی وادی میں ہوتی تھیں لیکن اب اس کی کمائی میں تین گنا کمی آئی ہے؛ لوگوں کے بقول اس کی ایک وجہ اناج کو کرغز اور دوسری سرحدوں کو فروخت ہے۔آٹھ سال پہلے انہوں نے یہ کام شروع کیا ہے اس وجہ سے ان کی فصل تباہ ہوچکی ہے۔ اس معاملے میں نہ تو پانی کی کمی ہے نہ ہی محنت کا مسئلہ، پتہ نہیں اس کمی کی کیا خاص وجہ ہوسکتی ہے۔

اس کے برعکس ہم بہت سے خوش حال گاؤں سے گزرتے ہوئے لہلہاتے گاؤں رَاشت پہنچے جہاں لوگوں نے سیلاب کی تباہی کے بعد اپنی زمینوں کو دوبارہ آباد کیا ہے۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ اس علاقے پر کسی آفت کا سایہ نہیں پڑا بلکہ اس کی بڑی وجہ یہاں کا عجیب موسم ہے اکثر وخی درخت بالکل کم اُگاتے ہیں وہ بھی صرف اپنے صحن تک محدود ہیں۔ اس کے علاوہ پورے گاؤں میں ہم نے تین نکمّے سفیدے اور دو ادنیٰ بید کے درخت دیکھے!اس گاؤں میں ہم میر کے مکان کی پہلی منزل کے کھلے برآمدے میں اندھی اور دھوپ سے بچ کر رہائش پذیر ہوگئے۔ اس مکان میں ایک بند کچن تھا جس کی وجہ سے ہمارا سامان بھی محفوظ رہا!

یہ گاؤں میر محمد سلیم خان کے زمانے میں اس علاقے کا تحفظ اور کرغزوں کے خلاف قلعے کے طور پر آباد کیا گیا تھا اور محل کو ہنزہ کے میر صفدر علی خان نے

بنوایا تھا۔ یہاں پر بھی فصل کی کمی کی وہی روایت سنائی گئی۔ لوگوں نے کہا کہ پہلے زمانے میں تمام سیاح کو ہم مفت میں کھانا پینا دیتے تھے۔ جب ان کی مہمان نوازی طمع اور لالچ میں بدل گئی اُس دن سے یہاں کی فصلیں تباہ ہونا شروع ہو گئیں۔ ان کا کہنا ہے کہ 'کرغز ہماری قسمت بھی ساتھ لے گئے' جب سے رَشت کے لوگوں نے ان کو فصل بیچنا شروع کیا۔۔۔لیکن اس میں کرغز کا کیا قصور ہوسکتا ہے؟

ہم رَاشِت میں دو دن رہے کیونکہ آگے سفر کے لئے قلی اکٹھا کرنا کافی مشکل کام تھا۔ ہم نے تمام قلیوں کو معاوضہ ادا کیا جس کو آپس میں بانٹنے میں نہ صرف گھنٹے لگ گئے بلکہ اس معاملے میں رات بھر طویل بحث وتکرار بھی کی گئی۔

رَاشِت سے روانہ ہوتے وقت وخیوں نے اپنے دستور کے مطابق اپنے قلیوں کو آٹا چھڑک کر رخصت کیا جس کا مطلب سفر کی بہتری اور نیک شگونی ہے اپنی روایت کو اُن کے والدین اور رشتہ داروں نے بڑی امید سے نبھایا۔

میں اکیلے تھوڑا آگے بڑھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ رَاشِت کے لوگوں نے سیلاب کے بعد دوبارہ اس علاقے کو آباد کرکے یہاں ساٹھ سے زاید گھروں کو بسایا ہے۔ صدیوں پہلے اس علاقے میں سیلاب کی وجہ سے یہ گاؤں کھنڈر بن گیا تھا ان لوگوں کے مطابق یہ واقعہ چار نسلیں پہلے رونما ہوا۔ سیلاب نے تباہی پھیلا کر گاؤں میں بھوری رنگت کا کیچڑ اور پتھروں کے ڈھیر لگا دیئے جو پندرہ سے بیس فٹ بلند ہیں۔ اس واقعہ سے یہ جگہ شکستہ قبریں جیسی بن چکی تھی۔

راستے میں ایک بڑے سیلابی ملبے کی باقیات کو پار کرکے آگے برفانی تودوں سے گزر کر 'بوڑھی دادی کے گاؤں' میں پہنچ گئے جو لہلہاتے کھیتوں پر مشتمل ہے۔ اس خوشحال گاؤں میں صرف تین گھروں کے ساتھ روڑ کی جانب ایک بہت

بڑی چٹان ہے۔ اس گاؤں کے بارے میں ایک روایت مشہور ہے کہ بہت پہلے ایک بزرگ یہاں تشریف لائے، جسے بعد میں بابا غندی کے نام سے منسوب کیا گیا' مقامی باشندوں سے دور ٹھہر گئے۔ ایک بوڑھی عورت ان کو دودھ وغیرہ بھیج رہی تھی۔ بزرگ ان کے نیک سلوک سے متاثر ہوئے اور کہا 'دادی! جا کے قریبی چٹان کے اوپر بیٹھ جاؤ'۔ عورت نے ایسا ہی کیا۔ پھر اس بزرگ نے گاؤں والوں کو سخت بددعا دی۔ اس کے بعد یہ گاؤں الٹ پلٹ گیا اور یہ حالت ہوگئی۔ تمام لوگوں کی فصلیں اور زمینیں تباہ ہوگئیں سوائے اس خاتوں کی زمینیوں کے جو ابھی تک سلامت ہیں۔ اس گاؤں کے تمام وخی افغان سرحدی مہاجر ہیں سرحد کے آر پار آنے جانے کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان شادیاں بھی ہوتی رہتی ہے۔

جوں جوں آگے بڑھتے گئے ہم نے سیلاب کی تباہیوں کو دیکھا بجری' کیچڑ اور پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیر بنے ہیں پوری وادی سیلاب کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ اب اس وادی کی زمین منحوس بن گئی ہے سیلاب کی تباہی کی وجہ سے زرخیز مٹی ختم ہوچکی ہے اب اس مٹی میں کچھ بھی نہیں اگ سکتا ہے خالص پتھر اور بجری نما مٹی ہے۔

چلتے چلتے آخرکار ہم یسکوک پہنچ گئے جہاں گھاس پھوس کی کھلی سرسبز چراگاہ سے راستے اور چشمے کی خوبصورتی من بھاتی ہے جن کے ساتھ کانٹوں کی جھاڑیوں کا جنگل ہے یہ بہت چھوٹے قد کی جھاڑیاں ہیں یہاں کا یہ منظر جاپان کے پست قد باغات کی طرح ہے۔

قدیم زمانے میں یہ بہت دلکش اور بارونق بندوبستی علاقہ تھا جس میں ایک سو کے قریب وخی اور سو کرغز بستیاں تھیں بہت زیادہ خوش حالی نے ان لوگوں کو مغرور اور محکوم بنایا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مقامی بزرگ بابا غندی

نے اس علاقے کا دورہ کیا جن کو معاندانہ طور پر گاؤں میں داخل ہونے نہ دیا گیا تھا۔ وہ ایک عام آدمی جیسے تھے جن کو کہا گیا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ پہاڑ کے ٹیلے کے اوپر رہے۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا اور کچھ دن بعد کوئی چیز لینے کے لئے وہ اپنے گھر واپس آرہے تھے تو دیکھتے ہیں کہ پورا گاؤں پانی میں ڈوب چکا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ سردیوں میں پیش آیا تھا جس کے کوئی تین سال بعد گاؤں کے غرق ہونے کے بارے میں سنا گیا۔ یسکوک کی نہر کے آثار اب بھی واضح نظر آرہے ہیں۔ بابا غندی کے بارے میں بہت ساری کہانیاں مجھے سنائی گئیں جو کچھ بتایا گیا میں نے من وعن وہی لکھ دیا ہے۔

یسکوک میں مچھلیاں بھی بہت ہیں ہم نے یہاں کے دریا سے کافی مچھلیاں پکڑلیں جو ہمارے سامنے نہر میں تیر رہی تھیں۔ہم نے کمبل جیسی ایک چادر بڑی احتیاط سے پکڑ کر پانی میں پھیلا کر بہت ساری مچھلیوں کو خشکی پر نکالا۔ کم دریا میں اس مروجہ طریقے سے مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔

یسکوک سے آگے سرخ ریتیلے پتھر ہیں ایسا لگ رہا ہے کہ یہ سرخ سرد مہرے سے بنائے گئے ہیں۔ یہ وادی قراقرم کی دوسری جگہوں کی نسبت انسانیت دوست اور بہتر جگہ ہے کیونکہ چپرسن ہندوکُش کے پہاڑی سلسلے میں واقع ہے یہاں کے پہاڑ پست لیکن کشادہ ہیں قراقرم کی طرح اکھڑے ہوئے نہیں ہیں۔

یسکوک سے آگے تمام علاقہ میر کے ریوڑ کے لئے مخصوص ہے جہاں کہیں کوئی میدان ہوتو وہاں جو کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ اطراف کی چند وادیوں میں میر نے مقامی لوگوں کو ایک گھوڑا' ایک خوش گاؤ اور ایک گائے چرانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اِدھر اُدھر کوئی خالی زمین مل جاتی جہاں ترقی ممکن نہ ہوتو میر جلدی سے اپنے تصرف میں لائے ہیں۔ ہنزہ کی آبادی

میں اضافے کی شدت کی وجہ سے میر کو اپنے جانوروں کے گلے کے لئے مزید چراگاہوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح کے سلوک سے لوگ کافی مایوس ہیں اور ان کی یہ حالت واقعی قابل غور ہے۔

ہم نے اپنے پہلو والے نالے کو بالکل چٹان کے اطراف سے پار کیا کیونکہ راستہ آگے دروازے کی طرح بند تھا۔ یہ اجنبی دروازہ مال مویشیوں کے لئے بنایا گیا تھا تاکہ وہ وہاں سے نیچے آکر فصلوں کو نقصان نہ پہنچائے۔

یسکوک کے آخری راستے میں ایک تالاب سوکھا پڑا ہوا ہے قدیم زمانے میں اس تالاب میں نو سروں کے ساتھ ایک اژدھا رہتا تھا جو قریب سے گزرنے والوں میں سے دو کو کھاتا تھا اس بلا کو باباغندی نے اپنی حکمت وبزرگی سے مار ڈالا جس کی زیارت ادھر قریب ہی ہے۔

زیارت کے پاس پہنچنے سے قبل ہم ایک گاؤں سے گزرے جہاں دولت بیگ کبوتروں کو دیکھ کر ان کے شکار کے تعاقب میں نکلا اور ہم بھی اس کو دیکھنے بیٹھے رہے۔ میں راشت کے نمبردار کے پہلو میں بیٹھ کر گپ لگا رہا تھا اتنے میں ایک شخص آیا اور نمبردار کے اس طرف بیٹھ کر کچھ ہی دیر میں انگلیوں سے اپنی ناک کی صفائی شروع کردی اور انگلیوں کو نمبردار کے کپڑوں پر صاف کرتا رہا۔ میرے خیال میں گاؤں کی یہ اقدار اور آداب محفل نسل درنسل چلے آرہے ہیں خوش قسمتی سے وہ آدمی میری طرف نہیں بیٹھا تھا!۔

بالائی چپرسن میں ہم نے زبردست سیاہ چٹان دیکھی جو دوسرے علاقوں سے مختلف رنگت کی تھی۔ ہلکی بادمی' چمکدار بھورے' زرد اور بھوری خاکستری رنگوں کے سامنے عظیم قرمزی رنگ کا پہاڑی سلسلہ تھا۔ اس کے نیچے نالوں میں کثرت سے جنگلی گلابی پھول' سرخ 'سفید اور پیلے رنگ کے خوش نما رنگ بکھیرے ہوئے

خاص کر جون میں یہ اپنے عروج پر ہوتے ہیں۔

آخرکار ہم دور دراز بابا غندی کی زیارت پر پہنچ گئے جو ایک چھوٹے میدانی علاقے پر مشتمل تھی اس کے پیچھے لہلہاتے جو کے کھیتوں کے ساتھ زیارت کے جھنڈے نظر آرہے تھے۔ میر آف ہنزہ نے اس کے گرد چھ فٹ کی دیوار بنا رکھی ہے جس پر پلستر بھی کیا گیا ہے۔ دیوار کی اونچائی پر سلوپ دیکر دیوار کا کام بہت مہارت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ زیارت کی عمارت بوسیدہ لگ رہی ہے۔ اندر کی جانب اصلی دیوار ہے جو مٹی اور پتھر کی بنی ہے جس کے اندر مقدس ہستی کی قبر ہے جس کو لکڑی سے بنایا گیا ہے۔ مارخور کے سینگ پہلے دیوار پر لگے تھے جو اب نہیں رہے یعنی خطرناک حد تک دیوار بوسیدہ ہوچکی ہے۔ اندر سے پوری عمارت ایک جیسی لگ رہی ہے۔

میر آف ہنزہ کی اس زیارت کے ساتھ بہت زیادہ عقیدت ہے اس لئے رانی صاحبہ کے ساتھ ہمیشہ تشریف لاتے رہتے ہیں۔ اُن کی آل و اولاد کی سالانہ آمد کا مطلب ہے کہ ان کو یہاں سے کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ زیارت کے دروازے پر میر کوُ ہنزہ کے ولی' لکھا گیا ہے۔ اس کے سامنے دیوار نہیں کھلی مستطیلی جگہ ہے' دروازے کے ساتھ برآمدے میں قرآن خوانی کے لئے جگہ بنی ہوئی ہے جہاں نصف درجن سے زیادہ قرآن پاک کی کاپیاں (تلاوت کے لئے) رکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک دو بہترین (قرآنی) نسخے ہیں۔

زیارت پر ہم نے شیخ سے ملاقات کی اور ایک دم ادھر اُدھر لوگ جمع ہوگئے۔ یہ شیخ چار سال سے یہاں پرموجود ہے اس لئے باباغندی کے بارے میں اس طرح بول رہا تھا جیسا کہ وہ بربروس (خیرا لدین بربروس یا روسی جنگ عظیم میں

مداخلت کے بارے میں) کے بارے میں بھی علم رکھتا ہو، میں نے کوشش کر کے اس سے جان چھڑائی اور وہاں پرموجود دیگر لوگوں کے مجموعے سے اس زیارت کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔

پہلا نکتہ یہ کہ یہاں اُس بزرگ کا جست خاکی موجود نہیں اور نہ کبھی تھا۔ ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ یسکوک کے لوگوں کی بدسلوکی کی وجہ سے وہ بزرگ اسی جگہ غائب ہوا ہوگا موجودہ زیارت ان کی فرضی قبر ہے۔ دوسرا نکتہ یہ کہ ان کی قبر کربلا میں ہے کیونکہ وہ ایک بزرگ شیخ تھے۔ شیعہ بزرگ شیخوں کی خواہش ہوتی ہے کہ جسد خاکی کربلا میں دفن ہو۔ آخری بات یہ کہ یہ شیخ غن (Ghun) شغنان روس کی ریاست سے آئے ہونگے۔ اس لفظ کے معنی تنگ دست جگہ جہاں پر میں نے ایسے ہی(one of the bystanders had been there) منفرد نظر انداز شخصیت کے بارے میں سنا تھا۔

تمام تر واقعہ ان'' کینہ پرور بزرگ'' کے ساتھ یہ ہوا ہے کہ جب وہ چپورسن آئے تو یہاں کی آبادی بہت زیادہ تھی انہوں نے ان لوگوں سے یہ امید کی ہوگی کہ جو کچھ وہ کہے گا یہ لوگ وہی سرانجام دین گے۔مگر لوگوں نے اُن کا تمسخر اڑایا اور اُن پر گوبر پھینک کر اُن سے کہا کہ آپ کس حیثیت سے ہمیں کہہ رہے ہیں کہ یہ کرو وہ نہ کرو؟ یہی وجہ تھی کہ بزرگ کی ناراضگی اور ان کی بددعا سے یہ لوگ تباہی کی نذر ہوگئے۔

وہ بابا بہت معزز اور قابل تعظیم تھے لیکن بڑے عجیب مزاج اور کینہ ور تھے عموماً مشرقی بزرگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اکثر گلگت اور واخان سے حاجی موسم خزاں میں یہاں سے گزرتے ہیں اس وقت دریاؤں میں پانی بھی قابل عبور ہوتا ہے۔ زیارت پر لگے جھنڈوں سے کچھ خوش گاؤ کی دُمیں بھی ہیں اور سب کے

سب ہوا کی جانب جھکے ہوئے ہیں یہی اس بیکار(shoddy) زیارت کا حسین منظر ہے۔

ہم نے باباغندی کی زیارت کو الوداع کہا اور چھے فٹ لمبے پُل سے دریا کو پار کیا جہاں دو چٹانوں کے درمیان پانی کی لہریں اچھل رہی تھی ہم نے ٹاپپ نام کی جگہ میں کیمپ لگا دیا جس کا مطلب ہے دھوپ والا جنگل۔ یہ بہت مزہ دار جگہ ہے جہاں کانٹے' بید اور جنگلی جھاڑیاں کثرت سے تھیں اِن کے علاوہ جنگلی گلاب' پندرہ فٹ بلند سب ایک چٹان کے نیچے لہلہارہے ہیں۔ اسی دوران بھورے رنگ کے بڑے بڑے خرمگسوں نے ہم پر حملہ کرکے کافی خون پی گئے۔

ہم یہاں سے آگے دشواری کے سبب نہ جاسکے یہی سے درّہٗ ارشاد جو افغانستان تک جاتاہے' کا نظارہ کیا لیکن شمال کی جانب سے اِس کا نظارہ مایوس کن ہے۔ قدرت کا تحفہ خالص مٹی والی(جیسے افغان لوگ اپنی ریاست کو کہتے ہیں) نوک دار اوربنجر اونچی پہاڑیاں ہمارے سامنے خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ جنوب کی جانب کا منظر کچھ مختلف لگ رہا ہے برفیلے بلند چوٹیوں کے درمیان سے وسیع مناظر ہنزہ کی جانب بلند چوٹیوں کے خاموش منظر کی عکاس ہے لیکن سب واضح نظرنہیں آرہے بلکہ نیلگوں بھورے دھند میں سوئے ہوئے لگتے ہیں۔

درّہ ارشاد کی چوٹی برف سے ڈھکی ہوئی ہے پھر بھی ہم نے اس پر چڑھنا شروع کیا اور اوپر چڑھتے چڑھتے پسینے ہمارے کولہوں کو چھو گئے مگر ہم بمشکل کھردری پرت نما چٹان کی چوٹی پر نرم برف تک پہنچ گئے جہاں سے مسخرہ بن کر واپس آگئے۔ چوٹی کی بلندی سولہ ہزار فٹ ہے اس لئے سانس کا پھولنا انہونی بات نہیں۔

ارشاد کی وادی میں جنگلی پیاز بہت پائے جاتے ہیں جن پر پاؤں پڑتے

ہی بہت بو آتی ہے۔ واپسی پر ہمیں بہت ساری خواتین ملیں جو گدھوں کے ساتھ جنگلی پیاز کو لینے آئی تھیں۔ وہ ان کے پتے جمع کرکے اُبال کر سکھاتی ہیں اور سردیوں میں گوشت کے ساتھ کھائی جاتی ہے؛ایک ایسی جگہ جہاں نمک بالکل کم ہے یہ پیاز مٹن کے ساتھ ذائقہ دار ہوتے ہیں۔ میرے ایک آدمی نے مزاقاً کہا کہ 'اگر آپ ان کو کھائیں گے تو اگلے مہینے کی پہلی تاریخ تک نہیں بھولیں گے'۔یہاں تک کہ لہسن پسند کرنے والا کوئی بھی اس سبزی کے سخت بو اور ذائقہ کو برداشت نہیں کر پائے گا۔

ہمارے قلی ارشاد کے پاس ایک سادہ کھیل میں مشغول ہوگئے انہوں نے ایک بڑے سلیٹی پتھر کو طرفین میں رکھ کر اس پر نشانہ مارنا شروع کیا(شینا میں اس کھیل کو رابٹ کہتے ہیں: مترجم)۔ پہاڑی علاقوں میں وقت گزارنے کا یہ بہترین کھیل ہے اس کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں۔

ہم پھر چپرسن وادی کے بالکل آخری ٹاپ تک گئے جہاں بٹری نامی گاؤں میں کافی دن قیام کیا۔یہ لفظ دراصل ایک پودے کا نام ہے جس کی جڑیں حیرت انگیز طور پر دست آور ہیں یہ اتنی جلدی اثرانداز ہوتی ہیں کہ یقین نہیں آتا ہمارے لیوی اور اردلیوں نے ان کی بڑی وضاحتیں کیں۔

ایک بوڑھی خاتون اس مقام پر ہمارے بہت کام آئی اُس کا شوہر میر کے گلّہ کا ذمہ دار تھا وہ دوھ سے ملائی' دہی اور مکھن بنارہی ہے آخر والا بڑا خوش کن تھا۔ میرا اپنا ڈبہ بھی بدبودار بن گیا تھا یہاں تک وخی بھی اس پر ہاتھ نہ لگا سکیں اس لئے یہ سب خراب ہوچکا تھا۔ یہ بوڑھی خاتون شادی سے پہلے میر کے گھر میں رہی تھی اس لئے وہ طرح طرح کی چیزیں بناکر کڑوے دودھ سے گھی بھی بنا سکتی ہے جو کہ مقامی لوگ نہیں بنا سکتے تھے۔ وہ عجیب وغریب زندگی گزار

چکی ہے اس کا شوہر بھی سرحدی علاقے سے آیا ہوا ہے اس لئے وہ بھی اپنی زندگی سے تھک چکا ہے۔ ان کی خانہ بدوشی والی عادات دوبارہ پیدا ہوچکی ہیں۔ وہ اور اُس کی بیوی ہنزہ چھوڑ کر واخان گئے تھے مگر فاقوں کی حالت میں واپس آگئے ایسے آزاد رہنے کے لئے کم از کم شکم تو بھر جائے۔ اس لئے وہ میر کے ریوڑ کے انچارج بن گئے کیونکہ وخی بہترین گلہ بان ہوتے ہیں۔

کشادہ مٹی کے باوجود پھول بہت ہی لاغر وکمزور ہوگئے ہیں خاص کر گل وفا بھی کثرت سے نظر آرہے ہیں۔ پہاڑی نباتات کے لئے مستقل طور پر رطوبت نہ ہونے کی وجہ سے عموماً ایک دفعہ برف پڑنے یا اس کے پگھل جانے کے بعد نمی نمایاں نہیں رہتی جس کی وجہ سے ان کی نشوونما اچھی نہیں ہو پاتی ہے۔ چپورسن کے بالکل آخری نالوں میں سبزاہٹ بھی مزہ دار نہیں سوائے چند مقامات کے باقی صرف سرخ چٹانیں' ڈھلوان کھردرے ٹیلے اور پتھریلی جگہوں پر مشتمل ہیں۔ وخی بہت اچھے لوگ ہیں یہ بھی اتنے ہی ہوشیار اور عقلمند ہیں جتنے کہ ہنزہ کے لوگ۔ یہ واقعی میں ایرانی النسل ہیں بالکل اس میں شک و شبہ نہیں۔ میرے ساتھ ایک لیوی یا اردلی رہتا تھا جو بالکل روسیوں جیسا تھا بال اور جسمانی خدوخال روسی النسل مزیک کے مشابہ تھے۔ وہ خوش مزاج' ہنستا مسکراتا تھکتا نہیں تھا لیکن کچھ کم ذہن تھا۔ وخیوں کا ایک مسئلہ ہے کہ وہ پہاڑ پر چلنے کے لئے راستے کے انتخاب میں سست ہیں ہنزہ کے لوگ ایک دم اپنی عقل سے ہی پہاڑی راستے کو بھانپ لیتے ہیں۔

وخی لوگوں کی بہت اچھی خصوصیات بھی ہیں؛ شائستہ' قانون کے پابند اور فرمانبراد' عمیق طبع اور باضمیر ہیں۔ وہ خانہ بدوش کھلی اور آزاد چرائی کے غرص سے بالائی چراہوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نکلتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے کبھی فائدہ تو

کبھی نقصان اٹھاتے ہیں۔

باب نمبر 19
داریل تانگیر

گلگت ایجنسی سے ملحقہ داریل تانگیر کی وادیوں کے بارے میں کچھ نہ لکھنے سے اس کی تاریخ ادھوری رہ جائے گی کیونکہ دریائے سندھ کی وادیوں کی سیاست میں ان علاقوں کی نمایاں اور تلخ یادگاریں رہی ہیں۔

دریائے سندھ کی تنگ اور گرم وادیوں میں بہت ساری آزاد چھوٹی جمہوری ریاستوں میں ہر فرد اور قبیلہ اپنے لئے خود مختار ہے ان واویوں میں ضابطہ اور قانون نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بنیادی طور پر ان وادیوں کا دوسرے علاقوں کے ساتھ رابطہ اور رسائی نہیں جس کی وجہ سے وہ السٹیا (Alsatia) (جرمنی کا ایک آزاد صوبہ ہے) کی طرح آزاد ہیں۔ اگرچہ ان کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ یہ کسی بھی نصب العین کے وفادار نہیں رہنے والے غیر پٹھان' دور افتادہ' ڈراؤنے اور بہت مضر لوگ ہیں۔ ایسی جگہوں کو لیکر چلنا ایک اعلیٰ نظام پر مبنی ریاست والے ملک کے لئے بہت مشکل اور پیچیدہ معاملہ ہوسکتا ہے جن پر انتظامی قانون کا سایہ تک نہیں پڑا ہے۔ اس بناء پر داریل تانگیروالے گلگت ایجنسی پر غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

جب گوہر امان مہتر یاسین کی تخت پر جلوہ افروز ہوئے تو تانگیر کے لوگوں نے اُن کو اپنا سردار تسلیم کر لیا۔ 1846ء کو بٹ شاہ مستج سے کامی تانگیر کی طرف فرار ہوئے تو گوہر امان نے اِس ریاست پر حملہ کردیا اور پانچ مہینے بعد تانگیر کے لوگ ریاست یاسین کو خراج دینے پر آمادہ ہوئے۔ انہوں نے اپنی آزادی کو محفوظ

رکھ کر اپنے آپ کو یاسین کے باج گزار بنا کر بدگمانی پیدا کی تاکہ مہتر یاسین دوبارہ خوش فہمی میں حملہ نہ کرسکے۔ دوسری طرف داریل تانگیر ہمیشہ پناہ گزینوں کو خوش آمدید کہتے رہے؛ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا رہا کہ کچھ حملہ آور جو پہلے ان علاقوں پر حملہ کر کے قبضہ کرنے گئے مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہوا اور وہ ان علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اس کے باوجود سرحدی علاقوں کے سیاسی دائرے کا یہ روّیہ بالکل غیر منطقی ہے جہاں جنگ' خفیہ قتل وغارت اور بے وفائی کو بہت زیادہ سنجیدہ نہیں لیا جاتا ہے۔ ہر آدمی یا گروہ ان کو مناسب موقع یا ساتھ دینے کی قبولیت کے لئے تیار ہوتا ہے۔

داریل ان دونوں ریاستوں کی مشرقی سرحد پر واقع ہے ایک طرف گلگت کی وزارت اور دوسری طرف ضلع چلاس اور انڈس کے درمیان پھسا ہوا ہے ان کے ہمسائے کشمیری انتظامیہ کے زیرنگرانی ہیں(سوائے شمال کی جانب کچھ علاقہ کے) اس لئے مغرب کی جانب واقع تانگیر پر بہت کم اثرات مرتب کئے جہاں سے یاسین کے لئے آسان راستہ ہے۔ درحقیقت تانگیر والوں کو اگر کسی مہذب معاشرے تک رسائی ہے تو وہ صرف اور صرف یاسین ہے جہاں پہنچنے کے لئے کم و بیش بہت سارے راستے ہیں۔ ان کے جنوب کی جانب انڈس مشرق میں داریل مغرب میں وحشی کوہستان واقع ہے اور تانگیر کی یاسین کے ساتھ بہت قریبی سرحدات ملتی ہیں نہ چاہتے ہوئے بھی تعلقات ہونے چاہئے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر بلکہ تکلیف دہ بھی ہے کہ کس طرح ایک منظّم ریاست کے ساتھ یہ متشدّد علاقے ملے ہوئے ہیں ایک طرف قانون وضوابط کا پابند معاشرہ ہے اور دوسری طرف لوگ وحشی اور قانون سے بالاتر جنگلی ملحقہ علاقہ۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ کیوں قراقرم کی سیاست میں داریل کا کافی

کردار کیوں کررہا ہے؟ یہ بات سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ چٹانوں اور پتھروں پر مشتمل یہ علاقہ جنگل کے لحاظ سے بہت امیر ہونے کے باوجود داریل تانگیر کے سردار لوگ غربت ومفلسی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ انڈیا کے تاجر ان سے ان کی لکڑی مناسب قیمت خریدمیں لیں گے اس معاملے میں نرم خو پٹھان لینے اور لے جانے میں معاون ہونگے جو لکڑ کا کام جانتے ہیں۔ ان دونوں وادیوں سے گزرنے والا دریا دریائے سندھ میں جا ملتا ہے اس لئے وہاں سے لکڑ کو پانی میں ڈال دینا ان کے لئے بچوں کا کھیل ہے جس کے بعد دریا سنگم تک لے جاتا ہے۔ اس سادہ طریقے سے یہ لوگ بہت پیسہ کماسکتے ہیں اور خطرے کے دنوں کے لئے اپنے لئے اناج کا ذخیرہ بھی کرسکتے ہیں۔کسی نہ کسی طرح ان کے وسائل اور ملک زَرِین دیکھ کر ہمسایہ لالچی حکمران ان وادیوں پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ جن لوگوں کو ان کی اپنی زندگی کی قدر نہ ہو وہ ایسے معاملات میں سدّ راہ تکتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت لالچی ہوتے ہیں اس لئے ہرقسم کا خطرہ مول لیتے ہیں اس لئے ان کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے جب ان کی مفلس ریاستیں ذہن میں آتی ہے۔

تانگیر یاسین کی طرح وسیع اور میدانی علاقہ ہے اور اس میں جنگلات کی بہتات اس کی خوبصورتی میں مذید اضافہ کردیتی ہے۔ لوگ بکھرے گھروں میں رہتے ہیں ان کا کوئی حصار بند یاگنجان آباد گاؤں نہیں۔ داریل میں لوگ دفاعی لحاظ سے مضبوط قلعہ نما گاؤں میں رہ کرلکڑی کے بڑے مضبوط گھر بناتے ہیں۔ تانگیر کے لوگ عموماً داریل کے لوگوں کی نسبت ہوشیار' سیاسی اور مہذب ہیں مگر یہ داریل والوں کے مقابلے میں بزدل اور ناقابل اعتبار ہیں؛ یاسین اور چترال کے اثرات کی وجہ سے داریل اور تانگیر میں یہی فرق نمایاں ہے۔

تانگیرمیں کافی سیدنسل کے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں کچھ نہیں کہاجاسکتا بہرحال میرباز خان گورنر اشکومن کی بہن کی شادی ان میں سے ایک سے ہوئی ہے۔ ان کا شوہر بہت اچھاانسان ہے ان کے پانچ بچے ہیں اس بے لگام ملک میں وہ اچھا محافظ ہے۔ اس کام کے لئے ہزاروں کارتوس ہونے چاہئے مگران کے پاس کم ہیں وہ بھی سوات میں بنے ہیں جن کا معیار بھی ٹھیک نہیں جب چلاتے ہیں تو دھواں ہی دھواں اڑتاہے جن کا کوئی خاص اعتبار اور بھروسہ نہیں۔

دونوں وادیوں کے لوگ قانون وضوابط کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے؛ ان کی زندگی میں ہمیشہ قتل و غارت کا وہم رہتا ہے۔ وہ کسی کا بھی نہیں مانتے ان کا نہ کوئی بڑا ہے نہ ہی یہ اپنے جرگہ یاگاؤں کی عدالت کو مانتے ہیں۔ قدیم بدو کی طرح یہ بہت غیر مہذب لوگ ہیں۔ یہ بات حیرت ناک نہیں کیونکہ یہ کسی کے بھی ماتحت نہیں رہے ہیں سوائے ایک آدمی کے جس نے اس ملک کو اپنے تسلط میں لایاوہ پختو ولی ہے جومہتر میرولی کا بیٹاہے جس نے جارج ہیواڈ کو قتل کرایا تھا۔ اس نے داریل تانگیر پر بارہ سال تک حکمرانی کی جہاں وحشی' بے وفا اور قاتل لوگ آباد ہیں۔ وہ خود بھی ایک قاتل' دغاباز' مردم بیزار' لاقانونیت پسند' ڈھیلا اور کاہل حکمران تھا۔ ہمارے مغربی طریقوں کے حساب سے وہ بڑا بد معاش' طاقتور اور سخت طبیعت کا مالک تھا اس لئے انہوں نے ایسے بدمعاش' کمینہ صفت اور جنگلی لوگوں پر حکمرانی کی جن پر اس سے پہلے کسی نے حکومت نہیں کی اس لئے ان پر حکومت کرنے کے لئے ایسے ہی بندے اور طریقے کی ضرورت تھی۔ وہ آدمی انگریزوں کو پسند نہیں کرتا تھا اس لئے کہ وہ اپنی ہوشیاری اور اہمیت اِن لوگوں کو باور نہیں کراسکا حملہ آور بن کراس نے بڑی زمینوں پر قبضہ کیا تھا۔ وہ کبھی کبھی

گلگت آیا کرتا تھا ایک دفعہ وہ میر آف ہنزہ کے وزیر ہمایون بیگ سے ملا جو پورے شمال مغرب میں شہرت کا مالک تھا جسے نسلیں یاد رکھیں گی۔

'دیکھو راجہ صاحب'، بوڑھے وزیر نے پختون ولی سے کہا! 'سرکار کے زیر سایہ آؤ اور گلگت ایجنسی کے ہیڈ کلرک جو کہ ایک قابل آدمی ہے' اُس کو ساتھ ملا کر پولیٹیکل ایجنٹ سے اس کو چند دن کے لئے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ آپ کی وحشی رعایا کو سمجھ آئے گی کہ راجہ کو سرکار کی حمایت حاصل ہے اور وہ آپ کی طرف دیکھنے کی جسارت بھی نہیں کرسکے گی اور ہم بھی آپ کے علاقے میں کوئی مداخلت نہیں کرینگے۔' 'کبھی نہیں!' پختون ولی نے جواب میں کہا! 'میں کسی کے ماتحت کیوں آؤنگا میں اکیلے ہی اپنی سلطنت چلاؤنگا کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔' 'آپ ایک سال کے اندر مارے جاؤ گے' ہمایون بیگ نے کہا! 'آپ جب مارے جائیں گے تو کسی کو خبر بھی نہیں ہوگی ایک انگلی کے برابر بھی آپ کی جسامت کام نہیں آئے گی'۔

بہرحال پختون ولی بڑا نڈر آدمی تھا اس پر کسی نے کوئی حملہ نہیں کیا اور نہ اس نے مزید کچھ کیا۔ وہ قابل سفارت کار' دور اندیش اور صابر تھا لیکن اپنے ذاتی مقاصد کے بارے میں اندھا کورا تھا۔ پہلی دفعہ جب وہ تانگیر گیا تو کچھ عرصے کیلئے ایک چھوٹے گاؤں (Sheikh) شیخو میں قیام کیا۔ اُس وقت اِس کے ساتھ کوئی رعایااور محافظ بھی نہیں تھے۔ ایک دن وہ اپنی ماں بیوی اور بچوں کے ساتھ سویا ہوا تھا کہ گبرس کامی قبیلہ کے تقریباً چالیس لوگوں نے ملکر حملہ کر دیا مکئی کے ایک بڑے ڈھیر کو ان کو دروازے پر ڈال کر فائر کرتے ہوئے چمنی کے اندر آگ لگا دی۔ پختون ولی نے ایک بندوق اٹھا کر روشندان میں سے نکل گیا اور باہر گولیاں چلا کر دو تین آدمیوں کو مار دیا۔ پھر دروازہ کھول کر بندوق سے چار پانچ

اور آدمی مار دیئے۔ دشمن دور بھاگ کر گولیاں چلاتے رہے لیکن مشکل سے پختون ولی کی ماں کو زخمی کردیا۔ نڈر بیٹے کی نڈر ماں بھی چلاتی ہوئی باہر آئی اور قرآن لہراتے ہوئے کہا کہ کس طرح تانگیر کے لوگوں کو ہمت ہوئی کہ ان کے خاندان کو قتل کر دیں۔

اِس واقعہ کی پورے تانگیر میں خوب دھوم مچی۔ حملہ آوروں نے خامخواہ اپنی گولیاں ضائع کیں لیکن پختون ولی کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے اُن لوگوں کو یقین تھا کہ پختون ولی تعویز کی مدد سے محفوظ رہاہے اس لئے حملہ کا ان پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ اُس کی اس بہادری کی وجہ سے اس کے بزدل ہمسائے بھی کسی حد تک متاثر ہوئے اور خوش وقت خاندان کا یہ عظیم گلاب وحشیوں کے ملک میں کافی عرصے تک محفوظ رہا۔

پختون ولی نے خاموشی سے اپنی مرضی کے مطابق ایک عرصہ گزارا۔ اس نے لوگوں کی خاندانی رقابتیں بڑھائیں اور کافی لوگوں کی مدد کی اور ایک مضبوط گروہ تشکیل دیا۔ وہ بہت مضبوط آدمی تھا اُن کے کالی لمبی مونچھیں' کالے گنے ابرو اور سرخ ڈراوٗنی آنکھیں تھیں۔ وہ ذہنی طور پر بڑا زیرک تھا اس لئے اپنی زیرکی سے سب کو ڈراتا تھا۔ پس اُس نے آہستہ آہستہ پورے ملک کو اپنے حصار میں لیاایک ایسی ریاست جہاں لوگ سازشی' منتشر اور منقسم ہیں جہاں لوگ اپنی ضد اور بدلہ لینے کی تاک میں ہوتے ہیں اور بدلہ لے کر ہی دم لیتے ہیں لیکن وہ اس کو قتل نہ کرسکیں۔ اُس نے دو قلعے بنوائے ایک گماری داریل میں دوسرا جگلوٹ تانگیر میں پھر تمام رعایا سے ان کا اسلحہ اُٹھایاعموماً حکمران ایسا کرنا بھول جاتے ہیں۔

بارہ سال تک پختون ولی نے انتہائی وحشت اور خوشحالی سے ریاست چلائی۔ اس کی آمدنی میں دو سو من گندم اور ایک یا دو لاکھ روپے نقد جسے کاکاخیل

لکڑہارے نے اس کو عمارتی لکڑی کی مد میں دیا تھا۔ وہ کبھی رقم کو گنتا نہیں تھا بلکہ دیہاتوں میں عجیب طریقے سے رقم تولتا تھا۔اس لئے اپنے دوستوں کی تعداد کو اور بڑھایا یہاں تک کہ انڈس کوہستان میں وہ بڑی شہرت پا گیا پیسے کے کھوجانے کے خوف سے وہ حساب گنتے بھی نہیں تھے۔ وہ روزانہ ایک بیل یا بکری اپنے دو سے تین سو ملازموں یا خادموں کی خدمت میں ذبح کیا کرتا تھا۔

لیکن ایک دن وہ اپنے خلوت خانہ میں بیٹھا تھا کہ متشدّد حملے میں قتل کر دیا گیا ؛ اگرچہ انہوں نے ہنر' مہارت اور ہوشیاری کے ساتھ بارہ سال گزار دیئے مگر تکلیف اور مصیبت سے حکومت کرنے کے ان کی قسمت کے دن پورے ہو چکے تھے۔ ایک دن گبرس میں ایک نئے گھر کے دورے کے موقع پر اس نے اپنے تمام لوگوں سے کہا کہ وہ بندوق چھوڑ کر اس کی ہنرمندی کے گُن گائے اور مدد کریں۔ یہاں تک اس نے اپنی بندوق نیچے چھوڑ کر نہایا اور کندھے پر ایک کپڑا رکھ کر ایک کُرسی پر بیٹھ گیااس کے بعد اپنا پستول بھی زمین پر رکھ دیا۔ اُسی لمحے جب وہ بال مونڈھوارہا تھا کہ اس کے نزدیک سے بہت سارے لوگ گزرکر اینٹیں اور کھول (mortar) اُٹھا کر اچانک اس پر حملہ کردیا اور سر پر کلہاڑی مارکر دبوچ لیا۔ وہ اپنے پستول کے لئے نیچے کی طرف متوجہ ہوا مگر تین چار دفعہ کوشش کے باوجود وہ اپنا دفاع نہ کرسکا اور مرگیا۔

اُس کے قتل کے بعد قلعے کو بھی لوٹ لیا گیا کسی نے بھی دروازے کو بند رکھنے کی فکر نہ دروازہ بند کرکے وہ دونوں کی حفاظت کر سکتے تھے۔ پختون ولی کے قاتلوں نے اپنے جرم کا کوئی حساب بھی نہیں دیا۔ آج اُن کی قبر بھی اُن بارہ قبروں میں شامل ہیں جنہوں نے تانگیر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی بہرحال ان میں صرف وہ کامیاب رہا۔ اُس کا ایک بیٹا شاہ عالم والی سوات کے قلعہ میں

قید ہے ایک دن شاید وہ اُن کی مدد سے آکر اپنے باپ کی اس ریاست پر دوبارہ قبضہ کر لے گا۔

جب 1933ء کو ہم شندور کے پاس واقع چترال جا رہے تو ایک بوڑھی خاتون دو نوجوانوں کے ساتھ ملی تھی۔ وہ پختون ولی کی پھوپھی تھی جس کے ساتھ اس کے دو بھتیجے جو مرحوم راجہ کے سات بیٹوں میں سے تھے۔ بدقسمتی سے سنگ دل اور ذہن باپ کے وارثوں کے پاس نہ زمین تھی نہ پیسے بلکہ وہ پناہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ کہیں کسی رشتہ دار کے ہاں باقی زندگی گزاریں۔

صرف ایک آدمی اُن کے خالی تخت کو سنبھالنے کے قریب پہنچا اور وہ راجہ صفت بہادر تھا جو پونیال کے موجودہ راجہ انور خان کے چچا تھے۔ اس کو یاسین کی گورنر شپ دی گئی تھی لیکن اس پوسٹ کے لئے اُس کی کوئی درخواست نہ تھی حکومت وقت جس کو چاہے اپنی مرضی سے گورنرکا انتخاب کرسکتی ہے۔ ان پہاڑی راجوں کے انتخاب میں بہت احتیاط برتی جاتی ہے کہ کسی کا استحقاق بھی مجروع نہ ہو اور کوئی اپنے آپ کو جاگیردار بھی نہ سمجھ بیٹھے بلکہ تعیناتی غیر متنازعہ اور شفافیت پر مبنی ہو۔

خوش وقت اور بروش نسلوں کی کہانی میں ہمیشہ بے قراری اور بے سکونی پائی جاتی ہے۔ یہ لوگ کبھی جذباتی تو کبھی اہل' کبھی جھگڑا کرنے والے تو کبھی سست اور کوتاہ اندیش ہوتے ہیں اور کبھی بھی مطمئن نہیں رہتے۔ یہ بڑے سازشی اور دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والے ہوتے ہیں جو لالچ کی وجہ سے ہی وقت سے پہلے اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ ان کی تاریخ اِن کے کردار کی عکاس ہے۔ آٹھ نو سال کی یاسین کے وسیع وعریض کھیتوں اور اچھے لوگوں پر راجگی کے بعد صفت بہادر کی نظریں داریل تانگیر پر پڑیں اور اس مہلک کام کے لئے لوگوں کو

بہت بہکایا۔ گھنے جنگلات اور تاجروں کی جانب سے بڑے پیمانے پر پیسے ملنے کی امید اس تلخ پہلو پر سوچنے کی محرک تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اُس علاقے پر قابض ہوا تو کسی محنت کے بغیر تمام پیسہ اس کے حکم اور اجازت سے ہی اس کے ملکی خزانے میں آئے گا اور لکڑی کے تاجر اس سے پوچھ کے ٹھیکہ لے سکیں گے۔ پہاڑی حکمرانوں کو جب اتنی آسانی سے پیسہ ملنے کی امید ہو تو پھر کس بات کی دیر ہوسکتی ہے؟ اس نے اپنے ہدف والی ریاست میں سازشی عناصر کو ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اِن سورش زدہ اور لاقانونیت والے علاقوں میں مداخلت بہت آسان بات تھی کیونکہ یہاں ہمیشہ دو گروپ موجود رہتے تھے جو آپس میں چپقلش رکھتے تھے۔ ان دو گروہوں میں خاص طور پر کمزور گروہ اپنے لئے ہمسائیوں میں سے کسی ایک حاکم سے مدد کے انتظار میں رہتے تھے تاکہ اپنی ریاست پر حملے کی صورت میں اُن کا ساتھ دے کر وہ اتنے طاقتور ہوسکے کہ مخالفین سے لڑنے اور ان کو دبوچنے کے اہل ہوکر قبائلی انتقامی لڑائیوں میں سبقت لے جاسکے۔ یہی طاقت کے مساوی رکھنے کا طریقہ کار تھا جو راجہ صفت بہادر نے سوچا کہ ہر کام تیار ہے تو پھر حملہ ہونا چاہئے تاکہ اس کی بادشاہت داریل تانگیر تک پھیل سکے۔

گلگت ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے راجہ کو آگاہ کیا تھا کہ وہ اس طرح کی بیوقوفی نہ کریں۔ انہوں نے راجہ کو تنبیہ کی تھی کہ وہ ایسی حرکت نہ کریں تانگیر جانے کی صورت میں یاسین کی راجگی سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ ایک دفعہ یاسین کی سرحد سے باہر جانے کے بعد دوبارہ اس کی سرحد میں داخلہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اُس کو یاسین یا تانگیر میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ ایک دوست کی حیثیت سے یہ اُس کے لئے بہترین نصیحت تھی نہ کہ کوئی روزانہ کی معمول کی بات۔ باربار تنبیہ کی گئی کہ اگر اُس کا مشن ناکام ہوا تو حکومت سے کسی بات کی توقع نہ رکھی

جائے۔ اُس وقت صفت بہادر چوالیس یا پنتالیس برس کا ہوچکا تھا وہ بڑا شجاع، سرخ چہرہ، ایک دم غصہ والا، سرکش، ضدی، بھڑکیلا، مضبوط اور عام طور پر بہترین رفیق تھا۔

تانگیر پر صفت بہادر کی اکیلی نظریں نہیں تھیں بلکہ محی الدین نامی ایک خوش وقت شہزادہ جو اشکومن دائین میں قیام پزیر تھا اور موجودہ یاسین اور غیرز (گوپس) کے گورنر کا بھائی تھا اس کی بھی اِن ذرخیز علاقوں پر نظریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بھی کسی حملے کے انتظار میں تھا اس لئے وہاں کی جاسوسی شروع کی گئی اور یہ کام انہی کو سپرد کر دیا گیا۔ یہ سب کاروائی ایک بادشاہ بننے کے لئے کی گئی تھی لیکن پس منظر میں بہت لوگ امیدوار تھے اس لئے دغابازی کی بھی تیاریاں ہونے لگیں۔ وہاں کے قبائل نے محی الدین اور صفت بہادر کو مدد کے لئے بُلا لیا۔ اس لئے صفت بہادر نے تانگیر کی طرف مارچ کیا اور محی الدین نے مخالف وادی سے حملہ شروع کیا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ وہ آپس میں ہی گھتم گھتہ ہوکر قتل وغارت کے لئے دست گریباں ہوئے۔

صفت بہادر کو اب بھی امید تھی کہ حکومت ہند کی جانب سے مدد ملے گی۔ اس کا خیال تھا کہ باربار منع کرنے کے باوجود ایجنسی کی طرف سے کمک بھیجی جائے گی اس کا خیال تھا کہ تنبیہ شاید سفارت کاری کی چال ہے۔

ایک دفعہ کمانڈر انچیف کی آمد کے موقع پر گلگت جاکر ان سے امداد کی توقع ظاہر کی لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ جس کی وجہ سے وہ واپس جاکر اپنے رقیب کی موت کا انتظار کرنے لگا۔ اس معاملے میں تنہا رہ کر اس کی حیثیت بھی تنقیدی ہوگئی تھی کیونکہ اس نے پہلے ہی تمام معاملات پر معذرت بھی کی تھی۔ آخرکار دونوں آدمی کھامی (قلعہ کا نام) کے گاؤں میں اپنے چاہنے والوں کے

ساتھ آمنے سامنے ہو چکے تھے۔

صفت بہادر جگلوٹ جاکر پختون ولی کے تعمیر کردہ قلعے کو بحال کر کے راجہ محی الدین کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ راجہ محی الدین بھی جگلوٹ جانے کا مصمم اِرادہ کر چکا تھا تا کہ وہاں جا کر قلعے کو دوبارہ تعمیر کر سکیں اور مخالف کو قتل کر کے جان چھڑ سکیں۔ صفت بہادر نے اس سلسلے میں پہل کی۔ جب سب سوچ چکے تھے تو وہ اپنے دشمن پر حملہ کرنے نکلا' ان کا محاصرہ کیا اور گھاس کے درمیان بم چھپا کر اس کے دروازے پر نصب کیا۔ بم پھٹ کر آگ لگ گئی جس کی وجہ سے سب پریشان ہوئے۔ جلتی آگ نے پورے علاقے کو روشن کردیا۔ صفت بہادر چھلانگ لگا کر چھت پر گیا اورراجہ محی الدین نے اندر سے تین چار گولیاں برسائیں لیکن وہ محفوظ رہا۔ محی الدین وہاں سے فرار ہونے والا تھا کہ صفت بہادر کے لوگوں نے ہی اُس کے منہ پر گولیاں برسانا شروع کردیا۔ گولیاں اُس کی گردن پر لگیں وہ گر شدید زخمی ہوگیا۔ راجہ محی الدین تانگیر کا محافظ حزل نے اپنے مالک کو گولی مار کر قتل کردیا مزید کو مارنے کی حاجت نہیں تھی۔ تمام قلعہ سے اسلحہ باہر پھینکنے کو کہا گیا اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ محی الدین اس دن نہیں مرا وہ اپنے چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اگلے دن وہ مر گیا اس کو پختون ولی کے پہلو میں دفن کرکے اس کے ساتھیوں کو چلاس بھیج دیا گیا۔

صفت بہادر نئ ریاست کے بادشاہ بننے کی امید میں اپنے ساتھ ایک داریلی رازدان بھی لے کے گیا تھا جس کا نام شتی تھا لیکن وہ اپنے مالک کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرکے واپس داریل جانا چاہتا تھا۔ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے ہاتھ میں مارٹینی چھوٹی بندوق تیار کرکے مالک کے ساتھ کھڑا رہے۔ شتی کے دشمنوں نے اُس کو اپنے راجہ کے قتل پر آمادہ کرلیا تھا تا کہ وہ اُس کی خاندانی دشمنی کو

معاف کریں۔ ایک دن صفت بہادر اپنے بھتیجہ فقیرولی اور اٹھارہ سالہ بیٹا امیر حیدر کے ساتھ جگلوٹ قلعہ کے تعمیری کام کا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ا لوڑ شدہ بندوق تھی۔ فقیر ولی کے پہلو میں ایک تانگیری دوست موجود تھا۔ فقیر ولی ایک دم ہلکی نیند میں چلا گیا تو اس کے بااعتبار دوست نے آرام سے قریب آکر اس بندوق(Mannlicher rifle) کا حفاظتی بٹن بند کرکے شٹی کو اشارہ کیا جس نے ایک دم صفت بہادر پر گولیاں چلاکر ہلاک کر دیا۔ فقیر ولی جاگ گیا تو اُس کے تانگیری ساتھی نے اُن کے چچا کی تلوار سے ہی ان کے سر پر وار کیا۔ فقیر ولی ایک طاقتور' مضبوط اور وسائل سے لیس جوان تھااس لئے اُس کو دبوچنے کی کوشش کی لیکن گولیاں چل نہ سکیں کیونکہ بندوق کو لاک کیا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ والے ملازم اور باقی تانگیر والوں نے مل کر فقیر ولی کو بھی ڈھیر کردیا۔

ایک تانگیری جوان وہاں سے بھاگ نکلا اور صفت بہادر کے بیٹے کو تمام واقعہ سے آگاہ کیا اور اس کو جلدی چھپ جانے کا مشورہ دیا۔ لڑکا مسلح تھا مگر یہ کوئی انسانیت یا وفاداری نہ تھی کہ اُن کو اکیلے گھر سے ایسے حالات میں باہر نکال دیا جاتا۔ تانگیریوں نے ان کو نہیں بچایا اور وہ بچارہ اکیلے چھپنے کے لئے بھاگ نکلا۔ تانگیریوں نے پہلے ان کی ٹانگوں پر گولیاں چلائی پھر ان کو زمین پر لیٹا کر موت کے گھاٹ اتاردیا۔ بہر حال جس گھر میں وہ قیام پذیر تھا اگر وہ چاہتے تو اس کو بچا سکتے تھے مگر ایک ایسے ملک میں جہاں دو مخالف گروپ رہتے ہوں ہر دوسرے کی بقا مشکل ہے۔

صفت بہادر داریل تانگیر پر قبضہ کرنے میں ناکام ہوکر کسی کو بھی کوئی احکامات نہ دے سکا جن کی وہ امید کرگیا تھا۔ اُس کو اپنی کے رعایا کے سامنے ہی قتل کردیا گیا اور پختون ولی ہی داریل تانگیر پر حکمرانی کرنے والا پہلا اور آخری

آدمی نکلا۔شٹی جیسے آستین کے سانپ کو سید خسرو نے ٹھکانے لگا دیا جو میر باز خان گورنر اشکومن کا بھتیجا تھا۔

ان تمام واقعات کے تناظر میں پختون ولی کے علاقے میں صفت بہادر کے بے فائدہ قتل کے واقعہ نے ان دو وادیوں کی تاریخ پر بڑے گہرے اثرات مرتب کر کے ان بے وفا اور خاندانی دشمنیوں کی بنیادوں کو دوام بخشا۔ اس بدترین صورتحال میں اب داریل تانگیر میں کوئی گھر ایسا نہیں جس کی خاندانی دشمنی نہ ہو ان علاقوں میں زندگی اب محال ہو چکی ہے۔قتل وغارت کی حد ہوگئی ہے اب یہ وحشی لوگ قتل کر کے بھی تسکین نہیں پاتے ہیں۔ ان وادیوں میں حکمران طبقے کے خلاف پورے قراقرم میں شب وخون کے چرچے ہوگئے گلگت ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ کبھی کبھی گشپوروں کو ان کی قسمت ازمائی کیلئے ان علاقوں میں بھیج دیتے تھے۔

بیشک جو کوئی بھی حکومت کے زیرسایہ آئے گا انہی کے لئے وہاں جانا ہموار ہو گا۔ پچھلے دور کے تمام حملہ آور قتل کر دیئے گئے کیونکہ داریل تانگیر کے لوگ جانتے تھے کہ اِن کے قتل کرنے سے کچھ بھی ہونے والا نہیں۔ وہ قتل وغارت گری کرنے میں مزید طاقتور ہو چکے تھے ان کی اس صورتحال سے ملک کو کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس تمام صورت حال کے بعد داریل تانگیر کو آزاد ہی چھوڑ دیا گیااِن کے باشندے کسی کو بھی اپنے اوپر حکمران دیکھنا نہیں چاہتے نہ ہی وہ ایسے متلاشیوں کو آنے دیتے جو اقتدار کے لالچ میں یہاں کا رخ کرتے تھے۔ ابھی وہ لوگ حکومت ہند کی طرف سے کسی اہل آدمی کی تلاش میں ہیں جو اُن پر حکومت کرسکے۔ وہ سب قتل وغارت اور بے لگامی سے بیزار آچکے ہیں۔ اچھے حکومتی انتظام اور بہتر صلاحیتوں سے وہ ان خاندانی دشمنیوں اور مار دھاڑ سے چھٹکارہ حاصل کرسکتے ہیں

اور ساتھ بہتر انتظامی امور کی انجام دہی سے انتظامیہ کو بھی دور رس فائدے مل سکتے ہے۔

صفت بہادر کے زمانے میں لوگوں کو خبرگیری کیلئے مسلسل چلاس بھیجا جاتا تھا تا کہ پتا کرایا جاسکے کہ راجا کے ساتھ حکومت کی سرپرستی حاصل ہے یا نہیں۔ اگر راجہ کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی وہ آج تک وہاں راجگی کررہا ہوتا۔ یقیناً صفت بہادر ان کا بیٹا اور بھتیجا سب تانگیر کھمی کوٹ میں پختون ولی کے پہلو میں دفن ہیں۔ نو میں سے یہ تین قبریں داریل تانگیر پر قبضہ کرنے کی ناکام مہمات کے آثار بن چکی ہیں۔

موجودہ وقت میں ان دو ریاستوں اور ان کے قبائل کی جانب سے گلگت ایجنسی کے ضلعوں کے لئے بہت مشکلات اور ہمیشہ مداخلت ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھار قتل وغارت ہوئی ہے' کبھی مال مویشی اور مسافروں کو لوٹا جاتا ہے۔ انتظامیہ کے لوگ ان کو پکڑ کر سزائیں دینے کے ساتھ کبھی کبھی ان سے چوری شدہ مال کے پیسے بھی برآمد کرتے ہیں۔ اس تمام کاروائی اور چنداقدامات سے کچھ ہونے والا نہیں نہ ہی اس سے مطمئن ہواجاسکتا ہے بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ ان دونوں وادیوں پر مکمل قبضہ کیا جائے۔ درحقیقت اس صورت حال سے یہ ثابت ہو رہا ہے حکومت کرے یا نہ کریں یہاں کے لوگ بھی کسی نہ کسی حکومتی انتظامیہ کی تلاش میں ہے جو اُن کو سنبھال کر ان کے مسائل حل کرسکے۔ یہ دلچسپ معاملہ ہے کہ کس طرح حکومت مختلف انداز میں مسائل سے تنقید وتحقیر کرتی ہے۔ یاسین کے قدیم مہتران اپنی رعایا پر بہت گرفت رکھتے تھے جن کا کہنا ہے کہ مضبوط گرفت سے عوام اور حکومت دونوں کو فائدہ ہے کیونکہ جنگلات اور دیگر وسائل سے حاصل شدہ آمدن سے محاصل اور ملکی مشینری کو چلایا جاسکتا ہے۔ اس تمام صورت حال

کے لئے سرکارکی جانب سے اس خطہ کے لئے ایک لیڈر کی ضرورت ہے جو ان وادیوں پرقبضے کا جواز پیدا کریں۔ اس منصوبے پر ملاّ اعتراض کرسکتے ہیں لیکن لوگ نہ صرف گلگت ایجنسی میں شامل ہونے پر بہت خوش ہونگے بلکہ بغیر کسی جنگ وجدل کے یہ سارا معاملہ حل ہوجائے گا۔ یہی اس مشکل اور بدتر صورت حال کا معتدل حل ہے جو سب کے لئے قابل قبول ہوگا۔

ضمیمہ نمبر: 1
تاریخ گلگت

تاریخ میں گلگت کو 'سارگن گلیت' یا جسے شینامیں خوش حال سرزمین کہاجاتاہے اپنی قدیم حیثیت کھو چکی ہے۔ اس سرزمین کے آخری حکمران شری بدت ہندوتھے۔ جس کی مملکت استور سے چترال تک پھیلی ہوئی تھی وہ اچھی شخصیت کے مالک تھے لیکن اپنی آدم خوری کی افسانوی حیثیت کی وجہ سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ وہ کسی بوڑھی خاتون کے گھر تشریف لے گئے اور دعوت کا تقاضا کیا بوڑھیا نے ان کو ایسے میمنے کا گوشت کھلایاجس کی پرورش اس نے اپنی دودھ سے کی تھی۔ گوشت کا ذائقہ اتنا میٹھا تھا کہ وہ کھاکر حیرت زدہ ہو گئے اور کہا کہ گوشت اتناخوش ذائقہ اور لذیذ کیسے ہوسکتا ہے جب ان کوگوشت کی لذت کی حقیقت کا پتہ چلا تواس کے بعدانہوں نے بچوں کاگوشت کھاناشروع کر دیا۔ ہنزہ کی تاریخی روایات کے مطابق اس آدم خور کو اُن کی صاحبزادی نے مروا دیاجس نے ہنزہ کے شہزادے کے ساتھ شادی کی تھی۔ اس نے اپنے قلعہ کے دروازے کے سامنے ایک بڑا گھڑا کھودکر اس کے اوپر ایک کپڑا رکھ دیا۔ ایک دن اس نے خطرے کی گھنٹی بجائی راجہ آدم خور حملے کے خوف سے جلدی سے باہر آکر اُس گھڑے میں گرگئے جس کے بعد گاؤں والوں نے آگ کے شعلوں سے مارمار کر اُن کوقتل کردیا۔ (کہاجاتاہے کہ اس کے بعد رسم آگ جلاؤ تھم شیلنگ کی بنیاد پڑگئی: حاشیہ)۔

شری بدت کا جانشین آزر یا آزرجمشید یقیناً بڑا غاصب تھا لیکن اس نے

بادشاہ کی بیٹی سے شادی کی تھی یا نہیں اس کے بارے میں مقامی روایات پر اکتفا کیاجاتا ہے۔

شری بدت تمام راجوں میں آخری غیر مسلم راجہ ہوگزرے ہیں جن کے بعد تمام راجوں کے نام مسلمان ہیں۔ یہ ایک بڑا معمہ رہا ہے کہ وہ بدھ مت تھے یا ہندو۔ مقامی روایات کے مطابق آذر نے اس علاقے میں شیعہ مسلک اسلام رائج کیا۔ انہوں نے اپنے وصال تک سات سال سلطنت پر راج کیا وفات کے بعد اُن کا کوئی وارث نہ تھا' ایک مقامی بوڑھے نے کہا کہ علاقے میں گڈوس نام کے شخص کا ایک لڑکا ہے جس کو اس ملک کا بادشاہ بنایاجائے۔ یہ بیٹاسوملک اوّل تھا جس سے تاریخی روایت کا واسطہ ہنزہ اور گلگت کے درمیان قائم کیا گیا ہے۔

آذر بعض اوقات شمشیر کے نام سے ظاہر ہوتاہے جس کی یہ حقیقت مزید آگے کی معلومات کو پیچیدہ بنادیتی ہے۔ سلطنت کے بعد کے تمام راجوں کو تراخان سے منسوب کیاجاتاہے جس کے ایک شہزادے کے بیٹے سوملک نے بدخشان کو خراج دینے سے انکار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس ریاست کے میر تاج مغل نے راجہ کے ملک پر حملہ کردیا مگر شکست کھاکر واپس اپنا ملک چلا گیا یہ 1620ء کا واقعہ ہے۔

یہ سوملک بعض اوقات عظیم جنگجو راجہ مزا خان کا دادا، جو تین نسلیں پہلے اسی نام کا راجا ہوگزرا تھا' کے نام کے ساتھ مشابہت رکھنے کی وجہ سے سمجھنے میں معمہ بنتاہے۔ جس کا والد تراخان جس نے عظیم گلگت سلطنت کی بنیاد بھی رکھی تھی اور اُن کے بیٹے کانام سوملک دوّم تھا۔ اس مرزا خان کو اُس کی بیوی نے زہر دیکر ماردیا جس کے سات بھائیوں کو اُس نے قتل کیا تھا۔

یہ یقیناً قابل غور معاملہ ہے کہ ان تمام شہزادوں کے اصل شجرہ نسب کا

تعین کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اِن راجوں کے ناموں پر یقین کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے ترتیب نزول کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے ہوسکتا ہے کچھ راجوں کے نام ہی نکل گئے ہوں۔

سوملک دوّم جن کو شہزادہ گلگت بھی کہتے تھے اس لمبے افسانے کا ہیرو ہے یہ پہلے سترھویں صدی تک کی باتیں ہوسکتی ہیں یا یہ سب کالعدم ہوچکی ہوگی۔ ان کا پڑ پوتا مرزا خان تھا جسے نگر میں قتل کیا گیامقتول کے پوتے گوری تھم یا سلیمان خان کو یاسین کے سلیمان شاہ نے 1805ء میں قتل کیا جس کو گلگت میں مہاجر پناہ گزین کی حیثیت سے راجا نے تحفظ دے رکھا تھا۔ وہ اپنے باغ میں بیٹھا تھا کہ سلیمان شاہ نے اپنے میزبان اور وزیر کو ہلاک کر کے خوش وقتوں کی دغابازی اور بے وفائی کی مثال قائم رکھی۔

گلگت کے راجوں کا اصل ریکارڈ اور کوئی سرگزشت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں تاریخ لکھنے کی کوشش تقریباً بے سود ہوسکتی ہے اگرچہ ان کے بارے میں لکھنا آسان بھی ہے لیکن بغیر شواہد کے ایسی تاریخ لکھنا تقریباً فضول فرضی یا افسانہ ہوسکتا ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ گلگت بہت اہم علاقہ ہونے کے ساتھ ان کے راجوں کی سرحدیں بھی بہت لمبی اورزیادہ رہی ہیں مگر پھر بھی اس کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں۔ اسلام کی آمد کے بعد ان کی وسعت اور زیادہ ہوکر اپنے ہمسائیوں کے ساتھ بھی قربتیں بڑھ گئی ہیں یہ معاملہ مشکوک دکھائی دیتاہے کہ کس طرح اس علاقے میں اسلام کی آمد ہوئی جس کے بارے میں ابھی مختلف روایات بیان کی جاتی ہیں۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ بہت سارے مسلمانوں میں اب بھی ہندو روایات مضبوط ہیں خاص کر شینوں میں جو ابھی ابھی مسلمان ہوچکے ہیں اور ہوسکتا ہے ان راجوں نے ہندو حکمرانوں کی خوشنودی کے

لئے اپنے نام وہی رکھے ہونگے۔ ہندو مذہب کافی عرصے سے گلگت میں باقی رہا یقیناً مسلمان علاقے پر بدھ مت کے حکمران قابض تھے یہی ابہام گلگت کی تاریخ لکھنے میں سب سے بڑا معمہ ہے اس لئے اس بات پر توجہ کی ضرورت رہے گی۔

گوری تھم نے (53)سال کی عمر میں بڑے ظلم وجبر کی حکمرانی کے بعد وفات پائی یہ پہلا سرکش حکمران تھا جیسے گلگتیوں نے پہلی بار دیکھا، مگر بے قرار خوش وقت کے خاندان کی وجہ سے تھا جو تراخان خاندان کی سلطنت کو صرف ملکہ کی حدتک تسلیم کرتے تھے زنانہ شجرہ حکومت ان کے لئے ایک بہترین موقع تھا۔

گوری تھم کے صرف دوچشم وچراغ محمدخان اورعباس خان کوسلیمان شاہ نے1819ء میں قتل کردیا۔ ان کے بعد اُن کاکوئی بیٹا زندہ نہ رہا سوائے محمدخان کی بیٹی کے جس کی شادی نگرکے کریم خان کے ساتھ ہوئی جن کی اولاد تراخان کی نسل کی نمائندگی کررہی تھی۔ گوری تھم کی وفات کے بعد اُن کی تمام طاقت گلگت منتقل ہوئی موجودہ راجا کسی عہدے کے بغیر بھی کوئی خاص اہمیت کے لائق نہیں رہے ہیں۔ وہ صرف اراضی جائداد کے مالک ہونے کے علاوہ کسی حیثیت کے مالک نہیں جو گلگت بازار میں گھومتے پھرتے کسی کی توجہ کا مرکز بن سکے۔ گلگت پر حملوں میں مسلمان شہزادوں نے بڑی نمایاں کوششیں کیں بعض اوقات وہ کامیاب بھی رہے لیکن ان کی انتظامیہ ہندوطاقتور لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اگر یاسین اور پونیال والے بغیرکسی مزاحمت کے اس ریاست پر قبضہ کر چکے ہوتے تو یہ یقیناً چترال کا خاصہ ہوتا اور مہتران چترال دریائے سندھ یعنی انڈس سے دریائے کابل تک سلطنت بناکروسعت دیتے۔گلگت میں کشمیریوں کی آمدچترال کے اثرورسوخ کے لئے بہت حدتک مضر ثابت ہوئی۔

ڈریو نے بہت محتاط انداز میں گلگت کی ہمعصر تاریخ لکھی ہے لیکن تصیب

انگیز طور پر سچائی لکھنے والا یہ شخص بھی گلگت کے تراخان خاندان کے بارے میں صحیح خوشہ چینی وشواہد اکھٹے نہ کر سکا ہے۔

یاسین کے سلیمان شاہ نے گوری تھم کے دو بیٹوں کوقتل کرکے کچھ مت پالیااُس نے نگر میں اصغرعلی کو قتل کیا جو مرحوم دو بھائیوں کے چھوٹے بھائی اور محمدخان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ اُن کو شیر قلعہ میں آزاد خاں بروش نے قتل کردیاجس کونگرکے طاہر شاہ نے قتل کیاجس نے 37-1833ء تک راجگی کی تھی اُن کے بیٹے کریم خان نے محمدخان کی بیٹی سے شادی کی تھی جوکہ تراخان خاندان کی اکلوتی وارث تھی۔ نگر کے شہزادہ کریم خان کو اس رشتے کی وجہ سے گلگت کی راجگی کی پیش کش کی گئی کیونکہ اُن کی بیٹی بہت چھوٹی تھی۔ اس کے بعد ان کے بیٹے اسکندرخان راجہ بنے جس کومہتر گوہر امان نے قتل کیااور آٹھ مہینے حکومت کی پھر کشمیری فوجیوں نے ان کو گلگت سے نکال کر کریم خان کو دوبارہ گلگت میں تخت نشین کیا۔ کریم خان کے بارے میں کہاجاتاہے کہ اس نے گلگت میں کافی اختیارات (کافی قابل تقلید) سلطنت کے امور کے متعلق استعمال کیے۔

کریم خان کی دعوت پر پنجاب کے سکھوں نے گلگت پر قبضہ کیا یہ قبضہ 1842-48ء تک جاری رہا اس دوران سکھوں کے نمائندے نتھوشاہ اور یاسین کے گوہر امان کے لوگوں کے درمیان مسلسل چپقلش جاری رہی۔ ایک دفعہ ایک ہندو متھرا داس نے نتھوشاہ کو برطرف کیا لیکن وہ مختصر یہاں مقیم رہے۔ پُر ہیبت و دہشت ناک خوش وقتوں نے ہندو راجہ کو ایسا بھگایاکہ وہ یہاں سے بھاگ کر سیدھے کشمیر پہنچے اور نتھو شاہ کو بغیر کسی رکاوٹ کے رہنے دیاگیا یہاں تک کہ وہ اس مشکل صوبے میں اپنی وفات 1848ء تک موجود رہا۔ اس انقلاب عظیم کے نتیجے میں کریم خان کے چھوٹے پوتے علی داد خان کو ڈوگروں نے گلگت کا راجہ مقرر

کیا۔(حاشیہ: ڈوگرہ پہاڑی گشپوروں کی نسل سے کشمیری حکمران خاندان کے لوگ تھے)۔

جب گلاب سنگھ کشمیر کے مہاراجہ بن گئے اُس وقت گلگت کی حیثیت بہت مشتبہ رہی شکر ہے کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر سرکش مہتر گوہر امان نے گلگت کے ڈوگروں پر حملہ کردیا۔ اِس کی وجہ سے اُنہوں نے کمانڈر باپ سنگھ کو استور بھیج دیا۔ اِن کی غلطیوں کی وجہ سے بہت بڑے مسائل پیدا ہوئے انہوں نے دشمن کو اِن پر حملے کی راہ ہموار کی جب وہ نیچے کی طرف آرہے تھے۔ بھوپ سنگھ پڑی کے قریب دریا اور پہاڑ کے درمیان ان کو دہر لیا گیا۔ پہاڑ کی بلندی سے مہتر گوہر امان کی فوج نے ان پر گولیاں چلائیں اور پتھروں کی بارش کر دی جس کی وجہ سے دوسری جانب ہنزہ کے لوگوں نے بھی ان کو خوب مارا اور پہاڑ گرائے۔ اس معرکہ میں ایک ہزار سے زائد ڈوگرہ سپاہیوں کو مارا گیا۔ گلگت کے قلعے کو توڑ کر چھاؤنی کے سپاہیوں کو سفاک ناک طریقے سے قتل کیا گیا۔ اس کے علاوہ تین سو آدمیوں کو بھی دھر کر ان کو مغلوب بنایا گیا گوہرامان نے اپنی قوت سے ڈوگرہ افواج کی ہستی کو مٹا کر ڈوگروں کے پندرہ سو سے زیادہ فوجیوں کو قتل کردیا۔ یقیناً اس وقت مشکوک طور پر دوسو آدمی فرار ہوکر مغلوب قیدی ہونے سے بچ نکلے تھے۔

1860ء میں کشمیر کے نئے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے گلگت پر حملہ کرکے فتح کرنے کا ارادہ کیا اور آسانی سے ایسا کر بھی لیا۔1858ء میں گوہر امان وفات پا گئے جس کی وجہ سے اُن کے گلگتی قلعے میں کوئی بااعتبار قوت نہ رہی لوگوں نے اپنے وحشی لیڈر کے بغیر کوئی مزاحمت کئے بغیر ڈوگرہ آرمی کو گلگت آنے دیا۔

اگرچہ یاسین کے راجہ گوہر امان وفات پاگئے تھے لیکن پھر بھی ڈوگروں نے دھمکی دے رکھی تھی۔ اس سلسلے میں 1866ء کو انہوں نے ہنزہ پر حملہ کیا تھا

جس کی ناکامی کی وجہ سے اُن کے دشمنوں میں کافی حوصلہ پیدا ہوا تھا۔مہتر چترال امان الملک کی ہمیشہ سے خواہش رہی تھی کہ وہ گلگت پر چڑھائی کریں اس لئے انہوں نے یاسین اور داریل کی مدد سے ان پر حملہ کردیا لیکن شیر قلعہ میں عیسیٰ بہادر کے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے کشمیری فوجیوں نے ان کے ساتھ ڈٹ کے لڑائی کی جس کی وجہ سے ان کو پیچھے آنا پڑا۔مہتر چترال کی فوج کو روک لیا گیا اگرچہ کچھ فوجی مختلف راستوں سے چھپ کر گلگت پہنچنے میں کامیاب ہوگئے لیکن زیادہ تر کو شیر قلعہ میں روک لیا گیا جن کو کشمیری کمک کے آنے کے بعد کشمیریوں نے دھمکایا جس کی وجہ سے مہتر پیچھے ہٹ گیا۔ کاش گوہرامان زندہ ہوتا تو یہ کہانی کچھ اور ہوتی! اس واقعے کے بعد گلگت میں امن قائم ہوگیا اور گلگت پر مہاراجہ کشمیر کی حکومت قائم رہی۔

ضمیمہ نمبر:2

تاریخ یاسین

چترال کے حکمران کٹور خاندان اور یاسین کے مہتران سب ایک ہی نسل سے ہونے کے دعویٰ دار ہیں ایک گروپ کا کہنا ہے کہ کافر کٹور ہندوکش کے تھے جو جلال آباد سے گلگت تک حکمرانی کر چکے ہیں۔جب کہ موجودہ حکمران نسل کے مہتر محترم شاہ نے چترال کے مہتران کا نام کٹور رکھ دیا۔

کٹور خاندان نے دو صدیوں تک چترال جبکہ دوسری شاخ خوش وقت نے زیادہ تر یاسین پر حکمرانی کی ہے۔ اِن مہتروں کی قسمت مختلف النوح رہی اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مہتر بنتے اورگرتے رہے۔ دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے کے لئے مُتجسس نسبت رکھی کبھی ہے ایک دوسرے کوقتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا کبھی وہ ایک دشمن ہونے کے باوجود سنگدلی سے متحد بھی ہوتے رہے لیکن جنگ و جدل کی صورت میں ہمیشہ چترالی کٹوروں کا پلہ بھاری رہا۔

کٹور خاندان کا دعویٰ ہے کہ وہ یاسین اور گردو نواح کی چھوٹی ریاستوں کے روایتی اور دستوری مہتران ہیں کیونکہ وہی ان رئیس شہزادوں کے وارث ہیں جو برُ زِل سے شغنان سرائی اور وادی کھنر تک کے حکمران تھے جوکہ افغانستان کی سرحدات ہیں۔ اُن کے مطابق آخری رئیس شہزادے نے خراسان کے شہزادے کو جو اِن کے کورٹ میں قیدی تھا اپنی بیٹی سے شادی کرایا اور اسی نسبت اورنسل سے خوش وقتوں کے ساتھ روابط قائم کیے۔

بعدازاں خوش وقتوں نے مِستوُج (جو ابھی چترال کا حصہ ہے)‘ کھوۂ غذرٗ اشکومن اور یاسین کو گلگت کی طرف ہندوراج کے علاقوں کو لے لیا۔مہتران چترال

نے 1878-9ء کوعظیم برطانیہ کے جاگیر دار بن کر اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی ان کے حق تصرف پر ہی قبضہ کیا جہاں خوش وقت سردار تھے ان کے دعویٰ کے مطابق اس کے بعد نہ صرف یہی ان کے تصرف میں رہے بلکہ اُنہوں نے پونیال‘ گلگت‘ ہنزہ اورنگر تک کی ریاستوں پرحکمرانی کا دعویٰ کیا لیکن ان کے اس دعویٰ کوسنجیدہ نہیں لیا گیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ چترالی کٹورہمیشہ ظالم اور جابر رہے ہیں اس لئے وہ دوسری ریاستوں میں اتنی شہرت حاصل نہ سکے۔ یہ عموماً اور اصولاً بھی اُن کا روّیہ رہا ہے کہ اشکومن‘ یاسین اور غذر پر انہوں نے زندگی بھر کے لئے گورنر منتخب کیے لیکن ان سب کو خوش وقتوں میں سے ہی ہونا لازمی نہیں سمجھا گیا بلکہ مختلف نسل کے راجہ لگا دیئے گئے۔ مثال کے طور پر اشکومن کے گورنر بروش خاندان سے مقرر ہوئے جبکہ گورنر مراد خان استورکے حکمران خاندان سے تعلق رکھتاہے۔ ان غیر خوش وقت لوگوں کی نامزدگی سے چترال میں ناراضگی پائی جاتی ہے خاص کر خاندانی نسبت اور دشمنی کی وجہ سے پھر بھی ان تینوں ریاستوں کی راجگی مہتران چترال خود اپنے ہی لوگوں کو دلوانا چاہتے تھے۔ یہ بات قابل ستائش ہے کہ بیشک کچھ بُری عادات و ریکارڈ کے باوجود خوش وقتوں کا نام اب بھی ان علاقوں میں وزن رکھتا ہے جس کو وہ نفرت انگیز طور انتظامیہ کے خلاف استعمال کرتے ہیں بہرحال لوگ اب بھی اِن کا احترام کرتے ہیں۔ چترالی کہتے ہیں کہ جب 1880ء کو خوش وقتوں نے گلگت پرحملہ کیا تب وہ علاقے برٹش اور کشمیر کے زیر انتظام تھے کٹور خاندان نے ان تین ریاستوں کی بحالی کے بدلے غلام محی الدین اور پہلوان بہادر کی واپسی کی بات کی تھی لیکن یہاں سے آگے یاسین کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔

شاہ خوش وقت کے بڑے بیٹے فرامزشاہ جس نے یاسین اور دوسری

ریاستوں پر راجگی ان کا خاندان ختم ہونے والا تھا کہ اُن کے چھوٹے بیٹے شاہ عالم موجودہ خوش وقت اور بروش قبیلہ کے مشترکہ جدِ امجد بن گئے۔ ان کے بیٹے شاہ بٹ شاہ کے کم ازکم چھے بیٹے تھے جن میں سے بڑا بیٹا ملک امان یاسین کے راجہ بنے اور سلیمان شاہ کو مِستوُج کی راجگی دی گئی۔سلیمان شاہ کے بعد گوہر امان ان کے جانشین بن گیا جس کے گرد پورے علاقے کی تاریخ گھومتی ہے۔

خوش وقت خاندان نے کسی دوسرے خاندان کو قراقرم یا ہندوکش میں تسلیم نہیں کیا یہ لالچی، ظالم و جابر، سازشی، بے سکون، فضول خرچ، بے ایمان و بے اصول بدشگونی کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔

ظلم وجبر کی اس داستان کی سب سے بڑی مثال اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ گوہر امان ہیں جن کی نسل کے سب سفاک قاتل تھے۔ اگرچہ ان کے ظلم و بربریت کی داستان یاد رکھنے کی ہے لیکن لوگ لعنت بھیجتے ہوئے ان کے اعمال کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے زمانے کے دہشت ناک وحشی درندوں میں گلگت ایجنسی میں دہشت کی آواز اور علامت تھے۔ وہ مہتر یاسین ملک امان کے ہاں 1809ء میں پیدا ہوئے تھے، 1825ء کو امان الملک مہتر چترال کی بہن سے شادی کی پھر تیسری شادی پونیال کے راجہ آزاد خان کی بیٹی سے کی۔ آزاد خان 1827ء میں گلگت کے راجہ تھے بعد میں انہیں سلیمان شاہ نے قتل کردیا جو گوہر امان کے چچا تھے جبکہ ان کو 1833ء میں قتل کردیا گیا۔ 1829ء کو گوہر امان نے سلیمان شاہ کے خلاف یاسین کے قلعہ کی طرف حملہ شروع کیا۔ وہ حیرت زدہ ہوئے لیکن ان کو گرفتار کیا گیا۔ (بڈلف اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ سلیمان شاہ کو شیرقلعہ میں گرفتار کیا گیا تھا)۔ اُن کا دوسرا نشانہ علاقہ پونیال تھا لیکن انُ کو میر امان مستُج کے مہتر نے شکست دے کر واخان بھیج دیا۔ وہ واخان سے تانگیر میں روپوش

ہوگئے جہاں غضب ناک مفرور لوگوں کو پناہ دی جاتی ہے اگرچہ وہ قیدی تھے لیکن کافی لوگ اس کے گرویدہ ہوگئے تھے اس لئے اُنہوں نے وہاں جاکر ان کے علاقے پر قبضہ کر کے اس علاقے کو نئی شناخت دی جس کے بعد وہ کم وبیش یاسین کی حکمرانی میں بھی آ گئی۔ میرامان نے یاسین پر 1839ء تک حکومت کی جب گوہر امان نے یاسین کا گراؤ کیا بھائی کو وہاں سے بھگانا چاہا لیکن اسی کا بھائی خود بھاگ نکلے۔

1840-41ء تک گوہر امان نے مسلسل اٹھارہ مہینے چترال کی سرحد سے انڈس تک حکمرانی کیلئے بہت زور لگایا لیکن کریم خان نے گجرات کے سید سکھ جنرل نتھو شاہ کے ساتھ مل کر گلگت میں گوہر امان پر حملہ کیا لیکن خود شکست سے دو چار ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد دوبارہ حملہ کرکے گلگت پر قبضہ کر لیا۔ گوہر امان گلگت کا دفاع کرتے رہنے کی بجائے شیر قلعہ پر حملہ کرنے کی پالیسی بنائی۔ وہ مصلحت پسند اور سمجھدار تھا اس لئے سوچ رہا تھا کہ گلگت میں اُن کی رعایا بڑی مشکل میں ہے کیونکہ سکھوں کے بھاگنے کے بعد جلدی سے ان کے محل پر جا بیٹھنا مشکل عمل ہوگا۔ کریم خان کو ایک سے زیادہ بار راجا منتخب کیا گیا لیکن اُس نے نتھو شاہ کے ساتھ مل کر 1848ء میں ہنزہ پر حملہ کرکے بہت سے جانوں کا نقصان اُٹھایا۔

1847ء میں مہتر چترال امان الملک تھے جس نے اپنے بہنوئی کو گوہر امان کے ساتھ کچھ وقت کے لئے سیاسی متحدہ اتحاد قائم کرلیا جس کی بنیاد پر 1848ء میں دونوں نے ملکر گلگت پر دوبارہ قبضہ کرلیا مگران کا کشمیریوں کے ساتھ معاملہ طے پاگیا۔ 1853-54ء میں گوہر امان نے دوبارہ گلگت پر حملہ کرکے ڈوگرہ فوج کو نیست ونابود کرتے ہوئے ان کے قلعے پر قبضہ کرلیا جو1858ء تک جاری رہا۔ اس حملے کے بعد وہ شندور سے بونجی انڈس تک پھیلی ہوئی ریاست کا

مہتر بن چکا تھا۔

گوہر امان اپنی زندگی کے آخری دنوں میں چھلت اور چھپروٹ پر قبضہ کرکے واپسی پر دینور کے مقام پر ایک بزرگ کی زیارت کے قریب سے گزرا جو دریائے ہنزہ کے بائیں کنارے نصب ہے، جس کو گلگت کے مخالف سمت سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ زیارت کو تندخو حکمران نے حملہ کرکے نہ صرف نقصان پہنچایا بلکہ طیش میں آکر گرانے کا حکم دیا۔ وہ پہلے بھی زیارت کو نقصان پہنچاتا رہا تھا (حاشیہ: کہاجاتا ہے کہ گوہر امان کے حکم سے زیارت کو دو دفعہ گلگت لایا گیا لیکن معجزاتی طور پروہی جگہ ایک انار کے درخت سے شناخت ہوتی رہی)۔

زیارت کو مسمار کرنے کے بعد وہاں سے وہ اکیلے ہی گھوڑے پر سوار گلگت پہنچ کر بیمار ہوگیا اور ایک قطرہ پانی تک نہ پی سکا۔اس حالت میں اس نے جلدی سے زیارت کو نہ گرانے کا حکم جاری کردیا مگر اب تک اُس کا نصف حصہ گرایا جاچکا تھا؛ اس اقدام سے راجہ کی طبیعت میں کوئی بہتری نہ آئی۔ گوہر آمان کی عادت تھی جب ان کی طبیعت خراب ہو تو انسانوں کی قربانی پیش کرنا تھا اس کام کے لئے چھلت کے بارہ قیدیوں کا حکم دیا گیا۔ راجہ کی قیام گاہ گلگت قلعہ کے نیچے دریا کی جانب تھی جہاں سے وہ قیدیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ان تمام قیدیوں کو اسی راستے سے لاکر اس کے بالکل سامنے ذبح کرکے قتل کر دیا گیا۔ اس قربانی سے بھی اس کی صحت میں کوئی بہتری نہ آئی تو مجبوراً یاسین کی طرف روانہ ہوا اور گاکوچ کے مقام پر وفات پا گیا۔ان کو دو دن بعد یاسین میں دفن کر دیا گیا۔

راجہ گوہر امان روزانہ کسی نہ کسی کو قتل کئے بغیر کبھی خوش نہیں رہتا تھا۔ وہ سنی فرقے سے تعلق رکھتا تھا جب بھی رنجیدہ یا شکستہ دل ہوتا تو کہا کرتا تھا کہ صرف شیعہ کو قتل کرنے سے اس کو بہت سکون ملتا ہے۔ جب بھی دو آدمیوں کو آپس میں

گپ شپ کرتے دیکھتا تو دونوں کو پکڑ کر کم از کم ایک کو قتل کردیتا تھا۔ ڈریو (صفحہ نمبر 437) لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ اس نے ایک بچے کو ہوا میں اچھال کر اپنے تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کردیا جبکہ بڈلف (صفحہ 138) میں لکھتے ہیں کہ بدخشان کے ایک سید کو گوہرامان نے ایک سو گلگتی قیدیوں کو تحفہ کے طور پر بھیج دیا۔ اس خوش وقت حکمران کو مردوں، عورتوں اور بچوں کو بطور قیدی بیچنے کا بڑا شوق تھا اس ضمن میں اُس نے اپنے رشتہ داروں کو بھی نہیں بخشا۔ پونیال کے موجودہ اکثر گشپوروں کے والدین کو اس نے غلام بنا کر فروخت یا بیشتر کو قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک جعفرعلی خان اور اُس کا بیٹا مرادعلی خان بھی ہے جو کھو اور غذر کے 1932ء تک گورنر رہ چکے ہیں ابھی بارگو گلگت میں قیام پذیر ہیں۔ ان دونوں کو گوہر امان نے چترال تحفہ کے طور پر بھیجا تھا جہاں وہ لڑکا رقص کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ خوش قسمتی سے پولیٹیکل ایجنٹ کے ساتھ مرادعلی خان کی چترالی معززین کے ساتھ شندور میں ملاقات ہوئی۔ مراد علی خان ساتھیوں کے کہنے پر رقص کیلئے نہیں اُٹھے مجلس کے بعد مرادعلی خان نے کہا 'رقص بہت اچھا رہا'۔ مہتر چترال دستگیر نے جواب دیا 'جی ہاں' اور کہا' آپ رقص کے لئے موزوں جج ہوسکتے ہے'۔

ایک فاتح کی حیثیت سے گوہر امان سب سے بہتر ہوسکتا ہے یا سلیمان شاہ، خوش وقت یا آزاد خان یا بروش بہرحال ان سب میں اُن کا نام ہمیشہ رہے گا۔ (حاشیہ مصنف:عموماً کہاجاتا ہے کہ جنرل ہوشیارانے گوہر امان کو شکست دی تھی لیکن وہ 1863ء تک گلگت میں پہنچا ہی نہیں تھا۔ جنرل دیوی سنگھ نراین جس کے بارے میں خدشہ ہے کہ خوش وقت کے حکمران پر حملہ کیا ہوگا جبکہ وہ بھی 1860ء کو گلگت آیا تھا۔ (ڈریو صفحہ نمبر 5-444) مقامی زبانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ گوہر امان فطری موت مر گیا ہے۔ دیوی سنگھ اور جنرل کے آنے کے اوقات مختلف ہیں اگر وہ ان کی موجودگی

میں آتے بھی تو گوہر امان اُن کو بھوپ سنگھ اور نتھو شاہ کی طرح شکست دیتا۔گوہر امان نے اپنے لئے زبردست قلعہ بنایا تھا لیکن مالک کے بغیر مضبوط قلعہ کچھ نہ کرسکا)۔

گوہرامان کا جانشین ان کا بیٹا ملک امان بنا جو غذر سے گلگت پر حکمرانی کرتا رہا۔ دربار دریائے سندھ کے کنارے گلگت پر قبضہ کرنے کا بڑا دلدادہ تھا چنانچہ اس نے جنرل دیوی سنگھ نراین کی قیادت میں1860ء کو گلگت اور یاسین موڑوری قلعہ کو قبضہ کر کے یاسین تک اپنی ریاست پھیلائی۔مہتر ملک امان نے بھاگنے کی کوشش کی مگرکشمیری دربار نے مفتوحہ علاقے میں ان کو مہتر نامزد کر دیا جس کی وجہ سے اس کی حکمرانی یاسین' غذر' کھو اور اشکومن تک محدود ہوگئی۔

کشمیری عہدہ دار راجہ گوہر امان سے بہت نفرت کی وجہ سے ان کی تمام اولاد کو بھی ناپسند کیا کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ملک امان ان کے دوست نہیں ہوسکتا ہے اس کی وجہ سے 1863ء کو جنرل ہوشیارا نے مہتر چترال کے خلاف مہم جوئی کی۔مہتر یاسین نے اپنے تمام لوگوں کے ساتھ بہادری سے موڈوری قلعہ میں لڑائی کی جو یاسین کے اُس پار گاؤں کے پیچھے ہے۔ یاسین والوں کو ہتک آمیز شکست ہوئی،قتل عام سے ان کو اس قدر مجبور کیا گیا کہ وہ کشمیریوں کو کافی سال تک خراج دینے لگ گئے۔

ملک امان تانگیر کی طرف بھاگ نکلا جہاں وہ مہمان قیدی کی طرح رہا اس کی غیر موجودگی میں اس کے بھائی میر ولی نے یاسین میں بڑی فوج اکھٹی کی تا کہ ملک امان کبھی غذریاسین میں داخل نہ ہوسکے۔میرولی نے اپنے بھائی کی جگہ اپنے آپ کو مہتر بنا کر پونیال کے ساتھ پرامن تعلقات استوار کیے اور ان کے ذریعے کشمیریوں سے بات چیت شروع کی۔

شجاع خان بروش آف پونیال نے مہتر چترال امان الملک کے ساتھ مل

کر گلگت پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا جو اس کا رشتہ دار بھی تھا۔مہتر میرولی خوش وقت نے ہم مذہب اور رشتہ دار ہونے کے ناطے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا نہ صرف وعدہ خلافی کی بلکہ تمام خبریں گلگت کے کمانڈرتک پہنچا دی اس لئے حملہ ناکام ہوا۔ اس کی وجہ سے گاکوچ کو تباہ کردیا گیا اورمہتر دوبارہ اپنا ملک چترال چلا گیا جہاں سے کشمیر کیلئے خوش وقت خاندان کی ساکھ کی بحالی کیلئے جاسوسی کرتا رہا۔ اس عمل کے بدلے میں کشمیریوں کی جانب اسے صرف اتنا صلہ ملا کہ انہوں نے داریل پر حملہ اورمہم جوئی کے لئے خوش وقت کی حوصلہ افزائی کی۔کشمیریوں نے خوش وقت کی انتہائی سردمہری کے ساتھ پش پناہی کرکے ان کو تباہی کے دہانے تک پہنچایا۔

1867ء کومہتر چترال نے میرولی کو قائل کیا کہ وہ اپنے بھائی ملک امان کے ساتھ معاملات بہتر کریں جو ابھی تک تانگیر میں قید تھا تا کہ کسی طریقے سے ڈوگروں کے حامی پونیال کے راجہ عیسیٰ بہادر کو شکست دیکر علاقہ خوش وقتوں کے تسلط میں دے سکے۔ اس منصوبے میں مکمل ذلت آمیز شکست ہوئی کیونکہ پونیال کی چھاؤنی میں موجود ڈوگرہ سپاہیوں سے ڈر کر یاسین کے تھکے ہارے لوگ سرنگوں ہوکر یاسین کی طرف بھاگ نکلے۔ میر ولی کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہوا جس کو ایک طرف کرنے کیلئے ملک امان نے اپنے بھائی پرحملہ کرکے تمام ہتھیار اٹھالیے۔بھائی کو نہ صرف زندہ رہنے دیا بلکہ اس کو غذر کی راجاگی پر برقرار رکھا۔

اس طرح کے واقعات یورپ کے لوگوں کیلئے پہیلی ثابت ہوں گے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کوقتل کرنے کے لئے تیار رہتا تھا اور کچھ نے ایسا کیا بھی ہے۔ وہ سنگدل مسابقتی طاقت کو رام کرنے کی تلاش میں ہی رہتے تھے۔ راجے جانتے تھے کہ کس طرح پوزیشن ہرصورت برقرار رہ سکتی ہے اس کے لئے وہ

ہر قسم کی چالاکی اپنا کر میرولی کی قسمت ہموار کرتے تھے۔ ملک امان بڑا بے قوف اور کمزور تھا۔ مقامی لوگوں کے خیال میں سوائے اس لئے کہ اس طرح اپنے بھائی کو سنگدلی سے کسی نے قتل نہیں کیا۔۔۔ سوتیلے بچے الگ الگ خون ہونے کے ناطے آپس میں قتل و غارت کر بھی سکتے ہیں مگر یہ لوگ تو ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔

میرولی نے چترال جاکر ایک بڑے لشکر کے ساتھ یاسین پر چڑھائی کر دی۔ اطلاع ملتے ہی ملک امان بہت پچھتاوے کے ساتھ دوبارہ تانگیر بھاگ نکلا کیونکہ اس نے اپنے بھائی کی جان بچاکر بڑی غلطی کی تھی۔یوں میر ولی پھر سے یاسین پر حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

یاسین میں بہت بڑی سیاسی تبدیلیاں آرہی تھی۔ محی الدین المعروف پہلوان بہادرکو جو میر ولی اور ملک امان کا بھائی تھا' اس کے چچا مہتر چترال امان الملک مستُج کا گورنر بنادیا۔ 1870ء میں جارج ہیورڈ کے قتل کے بعد وہ صرف بیس سال کی عمر میں ایک چھوٹی فوج کے ساتھ یاسین کی طرف نکلا۔ وہ اپنے چچا کی رضامندی سے آیا تھا اس لئے کہاجاتاہے کہ میرولی کے وزیر نے چشم پوشی کرکے بھکایا جس نے ہیورڑ کی قتل کی خبر دی تھی' ہوسکتا ہے وہ اس کو بچا لیتا مگر اُس نے ایسا نہیں کیا۔ میر ولی کو ہرصورت بدخشان یا چترال کی اطراف کی جانب نکلنا تھاجہاں چترال حکمرانوں کے ساتھ پہلے سے اس کے مضبوط مراسم تھے۔ درحقیقت اس طرح کی خوش آمد سے اُس نے اپنے چچاکو باور کرانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس کو دوبارہ یاسین جانے دے لیکن اُس کو اپنے کیئے کی سزا بھگتناپڑی۔ میرولی نے سید علی شاہ کو قتل کیاجس نے مہتر کے بڑے بھائی شاہ محترم شاہ کو قتل کیاتھا اس طرح مساوی الانصاف کام کرکے یاسین پر مکمل آسان طریقے سے خوش

وقت کی قسمت کا دروازہ کھُل گیا کیونکہ پہلوان بہادر کو جگہ خالی کرنے کے لئے بھیجا تھا۔

امان الملک نے یاسین پر راجا نامزد کرنے کا کردار جاری رکھامگر ایک دو سال بعد مہترچترال سے جائداد کے معاملات میں دعویٰ کرنے پر میر ولی سے تلخ کلامی ہوئی جس کی وجہ سے میروالی کو دوبارہ بدخشان کی طرف دھکیل دیا۔ دو سال بعد جب وہ دوبارہ واپس آرہا تھا تو مِستُوج کے گورنر کے حکم سے اُس کو قتل کروا دیا۔ میرے خیال میں یہ واقعہ نہ امان الملک کے اعمال اور نہ ہی میر ولی کی قسمت سے بلکہ سب کچھ جارج ہیورڈ کی قتل کی وجہ سے ممکن ہوا۔ پہلوان بہادر کو دوبارہ یاسین کی حکومت دی گئی جو اُس وقت اپنے شہزادوں کی حالت دیکھ کر پریشان تھا کیونکہ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ پہلوان گوہرامان کا تیسرا بیٹا یاسین کا راجاہوتے ہوئے بھی اپنے بھایئوں کی نسبت زیادہ خوش نہ تھا۔1878ء میں میجر بڈلف کو یاسین کے دورے کے موقع پرگرمجوشی سے استقبال کیا گیا کیونکہ وہ گلگت کا پہلا مسلمہ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ مہتر چترال بڈلف کے اس قدر زیادہ پرجوش استقبال سے بہت نالاں اور پریشان ہوگیا۔ حاسد اور مشکوک ذہن کی وجہ سے وہ یہ سمجھ گیا کہ شاید اس کا بھتیجا اس کو چترال کی مہتری سے ہٹانے والا ہے۔ اس نے سوچاکہ یاسین میں انگریز فوجی افیسرکی اس طرح آمد میں کچھ نہ کچھ سیاسی مقاصدپوشیدہ ہوسکتے ہیں۔ اس فرسودہ مشکوک سوچ اور انگریز سے مستقل جان چھوٹ جانے کے لئے اس نے یاسین میں جاسوسی شروع کرکے گلگت پر حملہ کی تیاری کا منصوبہ تیار کیااور پہلوان کو ہرقسم کی مدد کا یقین دلایا۔ سوچی سمجھی سازش کے تحت اس طرح منصوبہ تیار کیاجس کے پیچھے بہت اعلیٰ شریر اور بدمعاش ذہنیت کارفرماتھی جس کو کسی بوڑھے شخص نے ترتیب دیاتھا۔ اس مہم کے کامیاب ہونے

کی صورت میں وہ ریاست گلگت تک کامہتر بن جاتااور ناکام ہونے کی صورت میں بھتیجوں سے جان چھوٹ جاتی یعنی ہر دوصورت مہتر چترال فائدے میں تھا۔ مہتر چترال کی ان باتوں میں آکر 1880ء کومہتر یاسین پہلوان بہادر نے شیر قلعہ پر چڑھائی کردی جس کو فتح کرکے وہ گلگت جاناچاہتا تھا لیکن چچا کی بروقت جنگی مدد نہ ہونے کی وجہ سے وہ ناکام ہوگیا۔منصوبہ ہی ایسا اندوھناک تھا۔اس ناکامی کے بعدپہلوان بہادر کے لئے بہت خطرات نے جنم لیاجن کے پیش نظر پہلوان چترال کی طرف نکلنا چاہتا تھا تاکہ چچا سے وعدہ خلافی کی شکایت بھی کرسکے۔چنانچہ مہتر چترال نے منصوبے کے تحت بھتیجے کی کوئی مدد نہ کی تھی۔ اس تناظرکے برعکس چچایہ کہنے والاتھا کہ’آپنے منصوبے کو سمجھے بغیرعجلت میں حملہ کیوں کیا؟ دوسری بات یہ کہ آپ کے حملے کا انداز ہی مناسب نہیں تھا۔ تیسری بات یہ کہ حملے سے پہلے مجھے اعتماد میں کیوں نہیں لیا؟ان ممکنہ وجوہات کے پیش نظرچترال جانے کے بجائے پہلوان بہادر نے کوہستان جانے میں عافیت محسوس کی۔پہلوان کوہستان سے فوج لیکرکشمیریوں پرحملہ کرنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن اس سوچ میں بھی کامیابی نہ مل سکی۔ دوسری طرف مہتر چترال نے اس کی مددنہیں کی بلکہ جلدیاسین پر قبضے کے لئے اپنی فوج بھیج دی۔مہتر پہلوان بہادرنے بدنصیبی اورچچا کی بے ایمانی کی وجہ سے اپنی ریاست سمیت سب کچھ کھودیا۔

مہترامان الملک بہت ظالم، جابر، سفاک اوربیباک قاتل کے ہونے کے باوجود وہ ایک شفیق باپ بھی تھا ایک دن اپنی بہن کے بیٹے پہلوان اور اپنے داماد کو اس کی راجاگی اور ملک سے نکال دینے پرسخت نادم ہوا۔مہترامان الملک نے ان ریاستوں پرقبضے کی منصوبہ بندی بہت زیرکی سے کی تھی۔ یاسین سے پہلوان بہادر کو نکال کر اپنے بیٹے نظام الملک اور افضل الملک کو مستوج کا مہتر بنوایا۔ کچھ

روایات کے مطابق پہلوان بہادر اور نظام الملک کی حکمرانی کے درمیانی عرصے میں پہلوان بہادر کا چچا اور گوہر امان کا بھائی یاسین کا راجا بناتھا۔ 1880ء کو پہلوان اور ملک امان نے اس پر حملہ کرکے شکست دی مگر میر امان اپنی راجگی میں برقرار رہا۔اس کے بعد دونوں بھائیوں نے مل کر دوبارہ غذر پرحملہ کردیالیکن ناکام ہوکر تانگیر کی طرف نکلے۔ افضل الملک نے میر امان کو گورنری سے ہٹاکرریاست سے نکال دیا جس کی وجہ سے وہ بھی تانگیر میں قید ہوا اور نظام الملک گونر بن گیا۔

1881ء کو پہلوان بہادرنے کامیابی کے ساتھ چچا پر دہشت ڈالنے کے لئے یاسین پرحملہ کردیامہترامان الملک اپنی جگہ پر قائم رہامگر وہ اپنے بھائی امان الملک کے ساتھ دوبارہ جلاوطن ہوکر تانگیر پہنچ گیا۔ اسی سال ایک دن وہ بھائی کے ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سیر پرنکلا اسی اثنا اس کے بھتیجے ملک امان کے بیٹے نے پیچھے سے گردن میں گولی مارکر ہلاک کردیا۔

نظام الملک نے 1882ء تک یاسین پر حکومت قائم کی جب افضل الملک نے اُس کو بھگادیا تووہ سیدھا اشکومن چلاگیا۔ افضل الملک کو اس کے چچا شیر افضل نے قتل کردیا اور نظام الملک کا پیچھا کرتارہا۔ یکم جنوری 1895ء کو نظام الملک کو اس کے بھائی امیر الملک کے ایک محافظ نےقتل کر دیاجس کو چترال کے موجودہ مہتر شجاع الملک نے معزول کیاتھا۔ اس قتل وغارت کےتسلسل کی وجہ سے حکومت ہند نے مصلحت اور دور اندیشی سے موجودہ مہتر کی تخت نشینی کے موقع پر چترالیوں کے قبضے کو ہمیشہ کے لئے خوش وقت سےمکمل طور پر الگ کر دیا۔مستوج کوضلع کا درجہ دے کر الگ گورنر تعینات کیا لیکن 1914ء میں اس ضلعے کو دوبارہ مہتر چترال کے سپرد کردیا گیا۔

1895ء کو یاسین اور کوہ کو ایک گورنر کے زیر انتظام دے کر غذر سے

الگ کر دیا گیا۔ 1896ء میں اشکومن کو بھی یاسین سے الگ کر دیا گیا۔1911ء کو کھو غذر کے حدود میں ضم ہوگیا۔

ضمیمہ نمبر:3
تاریخ پونیال و اشکومن

پونیال(پیال: چترالی لہجہ)کشمیر کی موروثی جاگیر کی حیثیت سے گلگت ایجنسی میں دوسرے علاقوں سے منفرد ہے۔ تاہم یہ علاقہ پولیٹیکل ایجنٹ گلگت کے زیر انتظام ہے۔ پونیال کے گورنر بروش چترال کے کٹور خاندان کی ذیلی شاخ ہے اس کے بعد خوش وقت کا درجہ آتا ہے۔ خوش وقت شاہ بٹ شاہ مہتر یاسین و مستوُج نے شاہ بروش کو پہلا خود مختار حکمران مقرر کرکے بروش خاندان سے خوش وقت کی بالا دستی مکمل طور پر ختم کر دیا تھا۔

گلگت میں سکھ فوج کی نتھو شاہ کو امداد کے باوجود گوہر امان نے 1841ء میں پونیال پر قبضہ کرلیا۔ گوہرامان کا بڑا بیٹا ملک امان پونیال سے بھاگا توسکھ ڈوکروں نے دوبارہ پونیال بروش خاندان کے حوالے کردیا۔ اس کے بعد پونیال گلگت اور یاسین کے درمیان بڑا متنازعہ خطہ بنا رہا۔1880ء کو دوبارہ کشمیری تسلط کے بعد کشمیریوں نے پونیال کو راجا عیسیٰ بہادر(ڈیو کے مطابق عیسیٰ بکدر) کے حوالے کردیا۔

1860ء سے پونیال کشمیری جاگیر ہونے کی وجہ سے مسلسل مختلف حملہ آوروں کی زد میں رہی کیونکہ دریائے گلگت کی جانب اس کی بڑی جغرافیائی اہمیت ہے۔ پونیال کا مرکزی علاقہ شیر قلعہ دریائے گلگت کی جانب آنے جانے کا راستہ ہے جہاں سے کچھ لوگ پہاڑی راستوں سے گلگت آسکتے ہیں لیکن زیادہ فوج کے آنے کی صورت میں تنگ پہاڑی راستوں سے گزرنا مشکل پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ شمال کی جانب سے گلگت پر حملہ پونیال پر قبضہ یا اعتماد میں لیئے بغیر ناممکن ہے۔

1866ء میں مہتر یاسین اور مہتر چترال نے مل کر گلگت پر حملہ کے دوران شیر قلعہ کے سوا باقی تمام قلعوں کو مسمار کردیا۔ میر ولی بڑی شدت سے قلعے کا محاصرہ کرکے بھی قبضہ نہ کر سکا۔ یہ حقیقت ہے کہ قلعے کو فتح نہ کرنے کی وجہ سے گلگت پر منظّم حملہ کے لئے فوج کو راستہ نہ ملا اور تمام فوجی راستے میں ہی بکھر گئے۔ شیر قلعہ میں کشمیری فوج کی کمک کی وجہ سے سارا معاملہ خراب ہوگیا۔ پونیال پر حملوں کا سلسلہ جاری رہا جس کی وجہ سے عیسیٰ بہادر نے جاسوسی سے بچنے کے لئے اپنی تمام رعایا کو قلعہ سے باہر نکال دیا صرف سو سپاہیوں کی مدد سے اپنا دفاع کرتا رہا ہے۔ 1867ء میں مہتر یاسین نے ایک بار پھر پونیال پر حملہ کردیا مگر ناکام رہا۔ اسی طرح 1880ء میں پہلوان بہادر نے گلگت جاتے ہوئے پونیال قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکامی کی وجہ سے سارا معاملہ بگڑ گیا۔

عیسیٰ بہادر نے راجا کی حیثیت سے بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ راجا اکبر خان کو دو آدمیوں کے قتل میں ملوث ہونے کی وجہ سے 1905ء میں کشمیر بھیج کر قید کیا گیا۔ ان کی اولاد میں بیٹا انور خان چھوٹا اور نابالغ ہونے کی وجہ سے سرکار نے صفت بہادر کو نظام حکومت چلانے کی اجازت دے دیا ہے۔ بوڑھا راجا اکبرخان کشمیر سے واپس پونیال آچکا ہے اور اپنے بیٹے کی راجگی پر تنقید کرتا رہتا ہے۔ اس وقت (1933ء) شیر قلعہ سے تین میل دور قیام پزیر ہے اور اس کا تمام حکومتی اثر و رسوخ ختم ہو چکا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پونیال کے بروش خاندان کی خوش وقت خاندان کے ساتھ بہت بڑی دشمنی ہے لیکن یہ نہیں پتہ کہ اس دشمنی کے کیا اثرات مرتب ہوئے

ہیں۔ ماضی میں خوش وقت خاندان والے آپس میں بہت دست و گریبان رہے ہیں لیکن حیرت کی بات ہے کہ بروش ان ہی کی نسل سے ہونے کے باوجود آپس میں خوش مزاجی سے رہ رہے ہیں۔ چھوٹی ریاستوں کے راجے سخت نفرت کے ساتھ ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ ریاست پونیال (جاگیر) کشمیری عہدہ داروں کے ہاں بہت کم اہمیت کی حامل ہونے کے باوجود بہت حساس علاقہ ہے۔ پونیالی راجے عموماً اپنے روّیے اور کردار کو اکثر چھوٹے چھوٹے معاملات میں ہی تبدیل کرتے رہتے ہیں اس لئے دیگر علاقوں کے راجوں کی رائے کو کافی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس وقت بھی بروش راجوں کا اپنے ہمعصر راجوں میں کوئی اہمیت نہیں۔ بڈلف کہتا ہے کہ پونیال کوہستان کے دوسرے آزاد ریاستوں کی طرح ایک آزاد ریاست تھی اس کو شوٹ نامی شخص نے داریل سے حملہ کرکے قبضہ کیا جس کو خوش وقت کے شاپر شاہ نے قتل کرکے اپنا بیٹا شاہ بروش کو حکمران نامزد کیا۔ ہوسکتا ہے یہ پونیال کی تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ ہو لیکن تاریخی طور پر پونیال کا قلعہ گلگت کی ملکیت میں شامل ہوتا رہا ہے اور یہ سلسلہ کسی حد تک آج بھی جاری ہے۔

ضلع اشکومن راجا کی تعیناتی کے بعد بہت دیر سے منظر عام پر آیا۔ قدیم زمانے میں اشکومن یاسین کے شہزادوں کی تعزیری بندوبستی جگہ تھی جہاں وہ شریر اور ناپسند افراد کو قتل کرنے کے بجائے ملحقہ چھوٹے آباد رہائشی گاؤں بھیج دیا کرتے تھے تاکہ باقی زندگی گزار سکے۔ ان سے پہلے عیسیٰ بہادر نے چار سال تک اس علاقے پر قبضہ کیا ہوا تھا لیکن عظمت شاہ کے یاسین اور ملحقہ علاقوں پر تخت نشینی کے بعد اُس نے اشکومن کو بھی واپس لے کر دوبارہ یاسین کے ساتھ ضم کردیا۔

اِس تاریخی واقعہ کے بعد وادی اشکومن میں جس شخص نے قدم رکھا اس

کی کہانی ہی بہت دلچسپ ہے۔ 1883ء میں امیر افغانستان عبدالرحمٰن خان نے اپنے فوجیوں کو بدخشان بھیجا۔ اُس وقت باباخان بدخشان اور یوسف علی خان شغنان کے میر تھے۔ (اُس کا نام ظفر علی خان بھی بتایاجاتا ہے)۔ یوسف علی خان نے افغان حکمران کوتسلیم کرنے سے انکار کیا ریاست پہاڑی اورمشکل وادیوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کابلی فوج نے حملہ کرنے سے گریز کیا۔ امیر کابل نے قرآن کے ساتھ اپنے بیٹے‘ چھے سو معززین اور علماء کے دستخط کے ساتھ ایک یادداشتی دستاویز بھیجی جس میں اس کی ریاست کومکمل تحفظ کی یقین دیہانی کا وعدہ کیا گیا تھا۔ ا میر شغنان نے اس یاد داشت کوتسلیم کیا کیونکہ اتنے بڑے امیر نے قرآن کا حوالہ دے کر تحفظ کا وعدہ اور یقین دہانی کروائی ہے۔ اس سفارتی اقدام کے بعد واخان اور زیباک کی دوسری چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے امراء اورشہزادوں نے مل کر خانہ آباد میں مقیم کابلی امیر کے نائب عالم خان امیرحکومتِ بدخشان سے ملاقات کی۔

افغان کیمپ میں پہنچ کر نائب امیر عالم خان سے ملاقات کئے بغیر تمام امراء نائب السلطنت کے دربارہال کی جانب روانہ ہوئے۔ ہال میں تمام نام گرامی نسل ونسب کے پہاڑی گمنام علاقوں کے امراء سب اُس کے سامنے احترام سے کھڑے ہوگئے مگر نائب السلطنت نے اُن کی طرف نہ دیکھا اورنہ ہی کوئی علیک سلیک کی بلکہ زور سے مشہور شاعر نظامی کا ایک شعر با آواز بلند سنا کر چل دیا؛ ’نصر پختررکُن چہ کم آمدن‘ جس کا ترجمہ ہے؛ ’یقیناً آپ لوگ جلنے کے سبب آئے ہونگے؟‘۔ تاجکستان کے امراء یہ سن کر ایک دم ڈر گئے اور ان کے ذہین میں شکوک وشبہات پیدا ہونا شروع ہوگئے۔ واخان کے میرعلی مردان شاہ ایک دم ہاتھ پاؤں پر رینگ کر امراء کے ہجوم میں نائب السلطنت کے پاؤں چومنے لگ

گیا۔ نائب السلطنت نے اس کو ایسا کرنے سے منع کرکے آگے بڑھا۔ میرعلی مردان شاہ نے کہا ’نہیں‘ ! ’میں افغانستان کی عظیم سلطنت کے کتے کے برابر ہوں۔ جب کوئی کتا اپنے مالک کے پاس جاتا ہے تو وہ دو پاؤں نہیں چار پاؤں چل کے جاتا ہے اس لئے میں نے بھی ایسا ہی کیا‘۔ اس عمل پر نائب السلطنت بہت خوش ہوا اور میر کو کوٹ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ میرعلی مردان حکم کی تعمیر کرتے ہوئے کورٹ سے نکل کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور چابک مار کر چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس دو گھوڑے ہونگے تو وہ ان کو بدل بدل کرسواری کرکے نیچے کی طرف روانہ ہوگا اور جلد دوبارہ واخان کو حاصل کر لے گا لیکن وہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لئے اپنے تمام خاندان کو جمع کرکے پناہ کی تلاش میں امان الملک مہتر چترال کی جانب بڑھ گیامہتر چترال نے اُس کی شادی اپنی بہن سے کراکر وادی اشکومن جہیز میں عطا کیا۔ میرعلی مردان شاہ نے وادی اشکومن(ایمت) میں اپنی وفات یعنی 1924ء تک زندگی گزار دی۔

علی مردان شاہ بڑا خوش اخلاق‘ بے فکر‘ شریف النفس‘ مہمان نواز اور نفاست پسند انسان تھا۔ تمام معاملات میں اس کی بیوی کا بھرم چلتا تھاجو میر کو ایک پائی کے اخراجات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ذاتی ضروریات کے پیسوں کی حاجت کو پورا کرنے کیلئے وہ اپنی تنخواہ سے کچھ رقم چھپا لیتا تھا اور بیوی سے کہتا کہ گورنری کی تنخواہ بھی ان کو پوری نہیں دی جاتی ہے چنانچہ جوتنخواہ مل جاتی ہے وہ آپ کو دے دیتا ہوں۔

بوڑھا میر چائے زیادہ پینے کی عادت کی وجہ سے شہرت رکھتا تھااور وہ اتنی چائے پیتا تھا جتنی اُس کو مل جاتی تھی۔ وہ ملازمین کی سستی کی وجہ سے کبھی کبھی چائے پینے سے قاصر رہتا تھا ورنہ نہیں۔ میرعلی مردان شاہ کی وفات کے بعد

بھائی کی دعوت پر اُس کی بیوی نے چترال جانے سے انکارکیا بلکہ چٹورکھنڈ کے قریب اشکومن ہی میں مقیم رہی۔ میرعلی مردان شاہ کی بیوی 1933ء تک زندہ تھی ان کےبطن سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کی شادی یاسین کے ایک مہتر سے کروادی گئی۔ میرعلی مردان کو اُس کی وفات کے بعد وصیت کے مطابق واخان میں دفن کردیا گیا۔ میر کے کافی رفقہاء اس کی موت کے بعد واخان جانا چاہتے تھےمگر واخان کے میر کی سخت شرائط کی وجہ سے اشکومن واپس آگئے۔ اس واقعے کے بعد خانہ بدوش زندگی ترک کرکے اشکومن میں یکسوئی کے ساتھ آباد ہونا شروع ہو گئے۔

علی مردان شاہ کا دل ہمیشہ واخان کے لئے دھڑکتا تھا اور واخان واپس بلائے جانے کی امید سے اُس نے اس نئ ریاست میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ میرعلی مردان واخان سے نکل جانے کے بعد اس کی چھوٹی ریاست میں افغان انتظامیہ نے کوئی ترقیاتی کام نہیں کیاجس کی وجہ سے اس کے چاہنے والے اس کے انتظار میں رہے۔ افغانستان بھی کشمیر کی طرح ہے جہاں دوسرے مشرقی ریاستوں کی طرح رعایاکی خواہش ہمیشہ ان کے اپنے راجوں اورشہزادوں کے لئے ہوتی ہے بلے وہ کمزور ہویاطاقتور۔مخصوص حکمران خاندان کے علاوہ وہ کسی کو برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔ افغانستان کی حکومت نے ان تمام خودمختار تنہاچھوٹی چھوٹی ریاستوں کوختم کر دیاہے جن میں واخان، شغنان، زیبک اور بدخشان شامل ہیں۔ ان تمام ریاستوں میں اس وقت افغانستان کی کابل انتظامیہ کے علاوہ کسی اور کی مرضی نہیں چلتی ہے۔ میرعلی مردان شاہ کی وفات کے بعد اشکومن کے نئے گورنر میرباز خان بروش کو نامزدکیا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆﴿ختم شد﴾☆☆☆☆☆☆☆☆☆